پارلیمنٹ کا اجتہادی کردار: ایک تحقیقی مطالعہ

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ

مقالہ نگار

پروفیسر سید شمس الدین

شعبہ علوم اسلامیہ،
گورنمنٹ دیال سنگھ کالج، لاہور

نگرانِ مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر

چیئرمین علوم اسلامیہ
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ادارہ علومِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

سال ۲۰۰۵-۲۰۰۹ء

بسم الله الرحمن الرحيم

انتساب

میں اپنا یہ تحقیقی کام اپنے **والدین** کے نام
سے معنون کرتا ہوں جن کی حُسنِ تربیت
نے زندگی کے ہر مرحلے پر میری مدد
فرمائی۔

(پروفیسر سیّد محمد شمس الدین)

Declaration

I, Prof. Syed M Shamsud-Din, the author of this thesis entitled as:

پارلیمنٹ کا اجتہادی کردار :ایک تحقیقی مطالعہ

hereby solemnly declare that the research work described in this thesis is my original work. I further declare that the material included in this thesis has not been used in part or full in a manuscript already submitted or in the process of submission for the award of any other degree from any other institution.

S. M. Shamsud din

(Prof. Syed M Shamsud-Din)
Associate Proessor,
Govt. Deyal Sing College,
Nisbat Road, Lahore

Certificate

This is to certify that Prof. Syed Shams-ud-din has completed his Ph.D. thesis entitled as:

پارلیمنٹ کا اجتہادی کردار: ایک تحقیقی مطالعہ

This is also to certify that the research work described in this thesis is the original work of the author and has been carried out under my supervision. I have personally gone through all the material reported in the manuscript. I further certify that the material included in this thesis has not been used in part or full in a manuscript already submitted or in the process of submission in partial/complete fulfillment of the award of any other degree from any other institution. I also certify that the thesis has been prepared under my supervision according to the prescribed format and I endorse its evaluation for the award of Ph.D. degree through the official procedures of the University.

(Prof. Dr. Mahmood Akhtar) 30.11.11
Chairman Department of Islamic Studies
University of the Punjab (Quaid-i-Azam Campus)
Lahore.

ابتدائیہ

موضوع کا تعارف و پس منظر

جیسا کہ ہم آئندہ تفصیل سے اس کا جائزہ لیں گے...... ''اجتہاد'' ...... اسلامی معاشرے کی ضرورت اور مجبوری ہی نہیں، بلکہ ایک نعمت عظمٰی اور معاشرے کو قانون ...... اور عدل وانصاف مہیا کرنے والا ...... اور بقول علامہ اقبال اسلامی معاشرے کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھنے والا ادارہ ہے ...... اجتہاد ...... نہ صرف ...... اسلامی معاشرے کی قانونی اور فقہی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے، بلکہ انہیں مضبوط اور مستحکم بھی بناتا ہے ...... اور اس کی بنا پر عدالتیں، قانون اور فتویٰ جاری کرنے والے ادارے ...... ایک مسلسل اور مربوط قانونی اور فکری جدوجہد کے ذریعے ...... معاشرے میں امن واستحکام پیدا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق پاکستان کے جمہوری معاشرہ میں قانون سازی پارلیمنٹ کی ذمہ داری ہے، اس تناظر میں زیرنظر مقالہ یہ میں جائزہ پیش کرنے کی حقیری کوشش کی گئی ہے کہ پارلیمنٹ نے اسلامی قانون سازی میں اب تک کیا کردار ادا کیا ہے اور اس غرض سے اس کے اجتہادی اختیارات کیا ہیں اور اُسے مزید کیا کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

اجتہاد کی ضرورت کا احساس تو ایک مدت سے چلا آرہا ہے، لیکن اس کے لیے اب تک اول تو کوئی قابل ذکر کوشش ہی نہیں ہوئی اور جو تھوڑا بہت کام انفرادی سطح پر ہوا ہے وہ پیش آمدہ مسائل کے مقابلے میں انتہائی ناکافی ہے اگر انسانی مسائل کے حل کا ایک بڑا ذریعہ اجتہاد ہے تو اس کے نعمت ہونے کے بارے میں کسے شبہ ہوسکتا ہے، لیکن ہم ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ملکی معاملات چلانے میں فرداً فرداً اجتہاد ناکافی ہو تو کیا اس کی کوئی اجتماعی صورت بھی ممکن ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ...... مرحوم جو بین الاقوامی سطح کے عظیم اسلامی اسکالر اور دانش ور تھے۔ آپ کا خیال ہے کہ اسلامی قانون بنانے، اس کی توسیع کرنے اور اسے مرتب کرنے میں پوری اسلامی تاریخ میں کبھی کسی ریاست نے مداخلت کی جرات نہیں کی اور اس قانون کی تکمیل ونفاذ میں بھی کبھی ریاست کا براہ راست دخل نہیں رہا، بلکہ وہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اسلامی ممالک میں مغربی طرز کے جمہوری اداروں نے آزاد کردار اور اہل علم ودانش کا فریضہ ادا کیا اور کسی دور میں بھی حکومتی اور سرکاری سرپرستی قبول نہیں کی، دوسری طرف ...... صدر جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں آئین پاکستان میں ہونے والے ترامیم کے تحت حکومت کی طرف سے وفاقی شرعی عدالت (Federal Shareeat Court) اور سپریم کورٹ میں شریعت اپیلیٹ بنچ (Shariat Appelleat Bunch) کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کا مقصد قرارداد مقاصد کی روح کے مطابق قانون سازی میں اجتہاد کو فروغ دینا تھا، مگر افسوس کہ ضیاء الحق کے جانے کے بعد یہ دونوں ادارے عملاً تعطل کا شکار ہوگئے ہیں۔

اظہار تشکر

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم ...... وبعد

میں سب سے پہلے تو ...... اللہ رب العزت کا شکر گزار ہوں، کہ محض اس کی توفیق، اس کی ہدایت اور اس کی بخشی ہوئی علمی اور فکری استعداد کی بنا پر ...... یہ مقالہ ...... پایہ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔

اپنے والدین اور اپنے بھائی ...... محترم سید ظہیر الدین ...... کی دعاؤں اور ان کی مخلصانہ محبت ومساعی کی بنا پر ...... مجھے ...... اس کی تکمیل کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

بعد ازاں میں اپنے مشرف ونگران مقالہ پروفیسر ڈاکٹر محمود اختر کا از حد شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے نہ صرف موضوع کے انتخاب میں میری مدد اور رہنمائی کی بلکہ اس کی منظوری اور اس کی تحریر وتصنیف کے ہر مرحلے پر ...... میری بھرپور سرپرستی اور رہنمائی بھی کی، جس کی بدولت بحمداللہ تکمیل کی منزل قریب آئی ہے۔

ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری (سابق ڈین کلیہ علوم اسلامیہ وشرقیہ، موجودہ وائس چانسلر سرگودھا یونیورسٹی) ...... کے لیے بھی میرے دل میں بے حد احترام ہے، جنھوں نے اس کے خاکہ اور اس کی تصویب کے مرحلے میں میری بھرپور مدد فرمائی۔

صدر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ڈاکٹر محمود الحسن عارف بھی میرے شکریئے کے مستحق ہیں، جنھوں نے ...... مقالے کی تکمیل کے دوران میری رہنمائی کی ...... پروفیسر ڈاکٹر شبیر احمد منصوری، صدر شعبہ علوم اسلامیہ اور شیخ زاید اسلامک سنٹر کے تمام اساتذہ کرام میری طرف سے خصوصی شکریئے اور احترام کے مستحق ہیں، جن کی علمی سرپرستی میں یہ کام منزل تکمیل تک پہنچ پایا۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے چیف لائبریرین، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، شعبہ علوم اسلامیہ اور شعبہ شیخ زاید اسلامک سنٹر کا لائبریری کا عملہ بھی میری طرف سے خصوصی شکریئے کا مستحق ہے، جنھوں نے مواد کے حصول میں میری مدد کی ......

ان کے علاوہ میں اپنی رفیقۂ حیات، اپنے دونوں صاحبزادوں ...... اور اپنی بیٹی ...... کا بھی شکر گزار ہوں، کہ جن کے ...... تعاون کی بدولت یہ کام بخیر وخوبی انجام واختتام کو پہنچا۔

میں ان سب حضرات کی دینوی اور اخروی کامیابی اور ترقی کے لیے دعا گوں ہوں۔

اللہ تعالی ان سب حضرات کو بہترین بدلہ اور صلہ مرحمت فرمائے، آمین۔

پروفیسر سیّد محمد شمس الدین

۲۔ اس موضوع پر اب تک ہونے والے کام کا جائزہ

جہاں تک اس موضوع پر ہونے والے کام کا تعلق ہے، تو اگر چہ یہ موضوع بڑی گہرائی اور وسعت رکھتا ہے، لیکن اب تک یہ عنوان کسی بھی مستقل کتاب یا اعلیٰ قسم کے تحقیقی مقالے کا مرکزی خیال ...... نہیں بن سکا، البتہ اس عنوان پر ...... مختلف کتابوں میں جزوی طور پر اظہار خیال کیا گیا ہے ...... مثال کے طور پر ...... علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں خطبات دیئے، تو ان مقالات میں اس موضوع پر جزوی طور پر اظہار خیال کیا گیا، بعد ازاں علامہ اقبال کے خطبات پر جو بھی توضیح وتشریح کے نام ہوا پر کام اور شارحین اقبال نے، علامہ اقبال کے افکار کا جائزہ اور ان کا تجزیہ کرتے ہوئے اس عنوان پر ضمنی اور جزوی طور پر گفتگو کی وہ زیادہ تر ان کے افکار کے آس پاس ہی گھومتی ہے۔ اسی طرح ...... اس کے خلاف بھی ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر محمد احمد غازی اور ڈاکٹر محمد امین اور دوسرے کئی حضرات نے اظہار خیال کیا ہے ...... تاہم اس عنوان پر، ''پارلیمنٹ اور اجتہاد'' ...... کے عنوان سے ڈاکٹر محمود الحسن عارف نے ایک مبسوط مقالہ قلم بند کیا، جو ''المنہاج'' میں شائع کیا اور بعد ازاں مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم نے اسے اعظم گڑھ (بھارت) رسالے ''الرشاد'' میں بھی قسط وار اسے نقل کیا۔

عصر حاضر کا مسلم معاشرہ ان اجتہادی مسائل کا واضح حل دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ایک کرب مسلسل سے گزر رہا ہے، یا پھر وہ شرعی نقطہ نظر کا انتظار کیے بغیر طبی اور فنی ترقی سے استفادہ کرتے ہوئے دریا کے بہاؤ کی طرح اپنے راستے خود بنا رہا ہے۔ اسی لیے ...... اپنے اساتذہ کرام خصوصاً ڈاکٹر محمود اختر (موجودہ ڈین کلیۂ علوم اسلامیہ) اور ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری (سابق ڈین کلیہ علوم اسلامیہ وشرقیہ) کے مشورے سے اس موضوع کا انتخاب کیا۔

اس مقالے میں شریعت اسلامیہ کی روشنی میں پارلیمنٹ کے اجتہادی اختیارات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پارلیمنٹ کے معاون ادارے اور نفاذ شریعت میں ان کی کارکردگی کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اسلامی نظریاتی کونسل، ادارہ تحقیقات اسلامی، وفاقی شرعی عدالت، سپریم کورٹ، شریعت اپیلیٹ بینچ کی کارکردگی کا تجزیہ کیا گیا ہے اور نفاذ شریعت میں ان تمام اداروں کے کردار کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ نفاذ شریعت میں مقالے کی افادیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ آج اہل اسلام مخصوص مسائل میں اگر چہ اجتہاد کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں، مگر وہ محض ایسے اجتہادات ہی قبول کریں گے، جو اس کے مقررہ دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے بروئے عمل آئیں گے، اگر یہ اجتہادات انفرادی سطح کی بجائے اجتماعی سطح پر ہوں تو ان سے امت کے اتحاد کی اشد ضرورت بھی بطریق احسن پوری ہو سکے گی اور اجتماعی اجتہاد کے حوالے سے سب سے پہلے نظریں پارلیمنٹ کی طرف ہی اٹھتی ہیں۔

اس حوالے سے دور حاضر میں اجتہاد کی بندش سے پیدا ہوتے والی صورت حال کا جائزہ لینے کی اشد ضرورت ہے، جو اسلام کی آفاقیت ودائمیت کا تقاضا ہے کہ علاوہ ازیں دور حاضر میں کئی حوالوں سے اجتہاد کی خصوصی ضرورت ہے، نئے نئے معاشی مسائل پیدا ہو رہے ہیں، مغرب کے سودی نظام کی نت نئی نئی شکلیں جو بظاہر بڑی مفید دکھائی دیتی ہیں کی موجودگی میں معاشی شعبے میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام کے عصری سیاسی افکار کی جدید

مسائل کے تناظر میں تشریح وتوضیح کی ضرورت ہے، تاکہ اسلام عصری مسائل وافکار کے چیلنج سے عہدہ برآ ہو سکے۔ مشرق ومغرب کے تہذیبی ٹکراؤ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل پر بھی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل پر بھی اجتہاد کی ضرورت ہے۔

قدیم زمانے میں کیے گئے اجتہادات پر بھی کسی حد تک نظر ثانی کی ضرورت ہے کیونکہ حالات وزمانہ کے بدل جانے سے تشریح مسائل میں فرق آجاتا ہے۔ اس بات کی نشاندہی علامہ اقبال نے بھی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی جائزہ لینا ہوگا کہ اس دور میں اجتہاد کا طریق کار کیا ہوگا اور کیا قدیم معیار کے مجتہدین ہمیں میسر آسکتے ہیں۔ اس وقت دنیا پھیلنے کے بعد جب دوبارہ سکڑ رہی ہے اور عالمگیریت (Globalization) ہو رہی ہے اور نت نئی ایجادات سے باہمی رابطے بڑھ رہے ہیں تو اس صورت حال میں اجتہاد کی ضرورت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کا حل بھی مطلوب ہے کہ مسلمانوں کے مسالک میں باہم مطابقت کس طرح پیدا کی جاسکتی ہے۔

۳۔ طریقہ تحقیق:

اپنے موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے یہ مقالہ تحقیق کے جدید طریقوں پر مبنی ہے، اس کے لیے مختلف کتابیں، لائبریریاں اور اہل علم سے مواد لیا گیا ہے اور رسائل وجرائد ملکی وغیر ملکی سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اس مقالے میں اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ اجتہاد کسے کہتے ہیں۔ اجتہاد کی تاریخی اور شرعی حیثیت کیا ہے، مجتہد کون ہو سکتا ہے اس کی شرائط کیا ہیں اور وہ کن امور میں اجتہاد کر سکتا ہے اور اجتہاد کرنے کے لیے مآخذ اور مدارک کون کون سے ہو سکتے ہیں۔

اس تحقیقی مطالعہ میں اجتہاد کی مشروعیت اور ضرورت واہمیت، عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اجتہاد کس طرح سے کیا جاتا تھا۔ انفرادی اجتہاد کے دروازہ کو بند کر دیا گیا تھا، اسے فرد کے ہاتھ سے نکال کر جماعت کے ہاتھوں میں دے کر ان خطرات سے بچا جا سکتا ہے، جیسے موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔

اس اجتماعی اجتہاد کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ قانون سازی کا سارا عمل اصول واجماع کے تحت ہوگا، دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم اس اجتماعی اجتہاد کے ذریعے قرون اولیٰ کی طرف لوٹ جائیں گے جس کی بنیاد خلافت راشدہ کے زمانہ میں رکھی گئی تھی۔ تیسرا اہم فائدہ یہ ہوگا کہ اس سے ایسے تجدد پسند ذہن کی حوصلہ شکنی ہو گی جو علمی اور فقہی ضروریات سے بے خبر رہ کر اپنی ذاتی رائے کو اجتہاد کے نام سے مسلط کرنا چاہتا ہے، جس کو سوائے الحاد کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ ایسے تجدد پسند عناصر کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راستہ بند ہو جائے گا۔ اگر ہم اجتماعی اجتہاد کے اس اہم کام کو مکمل اور منظم اسلامی ادارہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم موجودہ پیچیدہ عصری مسائل کا شرعی حل پیش نہ کر سکیں۔ ان تمام امور کے لیے ہم معتبر اور مستند مآخذ مصادر کی طرف رجوع کریں گے۔

۴۔ فرضیہ تحقیق:

موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے ......فرضیہ تحقیق یہ قرار پاتا ہے:

(۱) کیا مسلم ممالک خصوصاً پاکستان کی پارلیمنٹ (ایوان بالا اور ایوان زیریں)۔ اجتہاد کی اہلیت رکھتے ہیں، یہ ایک نقطہ نظر ہے، یا

(۲) پارلیمنٹ ...... اجتہاد کی اہلیت بالکل اہلیت نہیں رکھتی ...... یا

(۳) پارلیمنٹ کو مشروط طور پر اجتہاد کی اجازت ہے۔

(۴) پھر کیا ...... علامہ اقبال کی تجویز کے مطابق پارلیمنٹ کو ایران کی علماء کونسل کی طرز پر کسی کونسل ...... کی طرف سے رہنمائی کی ضرورت ہے ...... یا اس کی ضرورت نہیں ہے۔

(۵) پھر کیا ...... پارلیمنٹ ...... اجتہاد کے غیر محدود اور غیر مشروط اختیار رکھتی ہے، یا اس کے اختیارات کو محدود کیا جا سکتا ہے۔

اس مقالے میں، ان تمام سوالوں کا جائزہ لیا گیا اور تحقیق پر مبنی سفارشات اور تجاویز دی گئی ہے۔

۵۔ مشکلات تحقیق

لیکن چونکہ ...... ایک طرف جدید قانون دان حضرات اور جدت پسند لوگ ہیں، جو مغربی اور غیر ملکی افکار اور خیالات کے تحت اور تیزی سے تبدیل ہوتی نت نئی شکلیں اختیارات کرتی ہوئی ...... جدید دنیا میں اس بات کے حق میں ہیں کہ پارلیمنٹ ہر طرح کی قانون سازی کا حق رکھتی ہے اور اسے علماء کی رہنمائی اور ان کی مدد کی ضرورت نہیں ہے، ...... یہ طبقہ مکمل طور پر پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینا چاہتا ہے۔

دوسری طرف قدیم علماء کا گروہ ہے جو پارلیمنٹ کو سرے سے ہی ...... اجتہاد کا اہل نہیں سمجھتے، اس لیے کہ اسلام میں ہر شخص کو اجتہاد کا حق نہیں دیا گیا، بلکہ اجتہاد کا حق صرف انہی لوگوں کو دیا گیا ہے، جو اس کی شرائط اور ان کے معیار پر پورا اترتے ہیں ...... اور یہ حضرات ...... پارلیمنٹ سے پاس ہونے والے اس قسم کے قوانین کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں ...... جس کی واضح مثال عائلی قوانین ہیں، جنہیں ...... ۱۹۶۱ء میں ...... اسمبلی نے پاس کر کے ...... قوانین کا حصہ بنا دیا ...... مگر ابھی تک علماء ...... اس کی کئی دفعات کو قبول کرنے اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس حوالے سے ہم نے مختلف علمائے کرام کی آراء بھی معلوم کی ہیں، جو اس مقالے کے ہمراہ بطور ضمیمہ شامل کر دی گئی ہیں۔

اس لیے ...... اس موضوع پر کام کرنا بے حد مشکل اور حساس نوعیت رکھتا ہے، اور پھر دوسری اسلامی ممالک کے تجربات اور ان کے ہاں ہونے والی قانونی پیش رفت سے استفادہ کرنے کے لیے ضروری کتابیں اور مواد دستیاب نہیں ہیں، اس کے علاوہ اس عنوان پر مواد بے حد غیر مرتب صورت میں پڑا ہے، جسے جمع کرنے اور ترتیب دینے کی ضرورت ہے، ...... اس لیے ہمیں ...... اس عنوان پر کام مکمل کرنے میں بے حد دقت اور دشواری پیش آئی ہے، البتہ اپنے اساتذۂ کرام کی سرپرستی اور ذاتی لگن نے اس مشکل مرحلے کو آسان بنایا ...... ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ حقیری کاوش ضرور شرف قبول حاصل کرے گی۔

پروفیسر سیّد محمد شمس الدین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پارلیمنٹ کا اجتہادی کردار: ایک تحقیقی مطالعہ

فہرست عنوانات

فصل پنجم: (حصہ دوم)

باب اول

پارلیمنٹ کا بنیادی تصور

فصل اول:

پارلیمنٹ کا لغوی واصطلاحی مفہوم اور مختلف مما لک کی پارلیمانوں کا جائزہ

فصل دوم:

ریاست میں پارلیمنٹ کی اہمیت وضرورت

فصل اوّل:

ا۔ پارلیمنٹ کا لغوی و اصطلاحی مفہوم اور مختلف ممالک کی پارلیمانوں کا جائزہ

اصطلاح میں پارلیمنٹ ایک قانون ساز مجلس ہے، خصوصاً ایسے ممالک میں ، جہاں............انگلستان کے بعد .... پارلیمانی طرز کا نظام حکومت رائج ہے.....یہ نام فرانسیسی زبان کے لفظ (Parliament) سے ماخوذ ہے، جس سے مراد پارلرکا (بولنے کا) عمل ہے....اسی لیے (Parliament) سے مراد گفتگو، مباحثہ، کوئی اجلاس اسمبلی یا عدالت ہے، جہاں لوگ عوامی مسائل پر بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔

ہرایسا قانون سازادارہ پارلیمنٹ کہلاتا ہے.....جو پارلیمانی طرز حکومت کے تحت چلایا جارہا ہو، جس میں انتظام (Executive) ......کو قانونی طور پر...... پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ٹھہرایا ہوگیا ہو......بنیادی طور پر......یہ نظام حکومت صدراتی نظام حکومت کے برخلاف ہے.....جس میں انتظامیہ کا تقرر پارلیمنٹ کرتی ہے اور نہ ہی انتظامیہ پارلیمنٹ کا حصہ ہوتی ہے۔

۲۔ پارلیمنٹ کا لغوی معنی و مفہوم:

محققین کے مطابق پارلیمنٹ (Parliament) سے مراد اعلیٰ اختیار مجلس ہے جو کسی پارلیمانی یا صدارتی طرز حکومت میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے، آکسفورڈ ریفرنس ڈکشنری میں اس لفظ کے درج ذیل معانی دیئے گئے ہیں:

1- (In the UK): A Highest Legislative consisting of the sovereign, the house of Lords and the house of commons.

(B) The members of this legislative for a particular periods esp between one dissulution and the text.

2- A similar legislative in other nations and states.(ا)

ترجمہ(ا) برطانیہ میں (الف) اعلیٰ ترین مقننہ جو بالادستی کی حامل ہو، یعنی دارالامراء اور دارالعوام۔

(ب) اس مقننہ کے اراکین، ایک مخصوص مدت کے لیے خصوصاً سابقہ مقننہ کے اختتام اور نئی مقننہ کے وقفہ کے درمیانی عرصہ میں۔

(۲) دوسری اقوام کے ہاں اسی طرح کی مقننہ اور ریاستیں۔

انگریزی کی ایک اور ڈکشنری (New Standard Dictionary) میں پارلیمنٹ معنی درج ذیل بیان ہوئے ہیں:

(1) A meeting of the Assembly for consultation and delibration: a legislature, especially when composed of various estate.(۲)

ترجمہ: کسی شوریٰ کا اجلاس یا اس پر غور و فکر کے لیے اسمبلی کا اجلاس، نیز مقننہ، خصوصاً ایسی مقننہ جو مختلف ریاستوں سے تشکیل پذیر ہو۔

---

1) The Encyclopaedia Americana, Danbury 1991, Vol.21-pp.465 Oxford English Reference Dictionary, new, Oxford, New York 1996, p.1058. S.V. Parliament.

2) Funks and Wargnalls, New Standard Dictionary of the English Language. Funks and Wargnalls Company New York, 1951, pp. 1680.

۲۔ اصطلاحی معنی ومفہوم:

اصطلاحی طور پر پارلیمنٹ سے مراد کسی بھی ملک کا وہ مرکزی قانون ساز ادارہ (Lagislative) ہے جسے جمہوری طریقے سے منتخب کیا گیا ہو، اور جس کے اراکین میں سے وزراء کے طور پر ''انتظامیہ'' کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔ انتظامیہ کو وزارہ پر مشتمل ''کابینہ'' کے ذریعے ہدایات جاری کی جاتی ہیں، جس کا سربراہ وزیراعظم ہوتا ہے۔ وزراء کا چناؤ عموماً برسر اقتدار جماعت سے کیا جاتا ہے۔ مخلوط حکومت کی صورت میں، حکومت میں شامل تمام جماعتوں میں وزراء کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اگر حکومت کو پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل نہ رہے تو حکومت کو وزیراعظم سمیت استعفیٰ دینا پڑتا ہے اور ملک میں نئے انتخابات منعقد کرائے جاتے ہیں۔

دولت مشترکہ کے اکثر ملکوں میں برطانوی طرز کا پارلیمانی نظام حکومت اپنایا گیا ہے، جس میں (پاکستان سمیت) انڈیا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ (وغیرہ) شامل ہیں (۳)۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ برطانیہ سمیت دنیا کی چند بڑی پارلیمانوں کا ابتدائی میں ذکر کردیا جائے:

ا۔ پارلیمنٹ پر مبنی نظام کی بنیاد: برطانوی پارلیمنٹ

یوں تو دنیا کے ہر ملک اور خطے میں برسر اقتدار افراد کے ہاں اپنے ماتحت لوگوں سے مشاورت کا کوئی نہ کوئی نظام ضرور موجود رہا ہے.... اور اسلام نے مشاورت کو بڑی اہمیت عطا کی ہے، لیکن پارلیمنٹ کے موجودہ نظام کے ڈانڈے برطانوی حکومت سے ملتے ہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ دنیا کی قدیم ترین پارلیمنٹ ہے، صدیوں سے مشاورت کے ذریعے نظام حکومت چلا رہی ہے۔

(الف) ابتدائی تاریخ:

''عہد وسطیٰ میں (مشاورت کی عملی صورت) برطانوی پارلیمنٹ کی صورت میں تشکیل پذیر ہوئی جو بادشاہ اور اس کے روٴساء (Lords) پر مشتمل تھی، اس کا اجلاس مقررہ وقت کے بغیر عدالتی اور دوسرے عمومی معاملات، خصوصاً مالی معاملات پر، تبادلہ خیال کے لیے بادشاہ طلب کیا کرتا تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں نائٹ (حکومت کی طرف سے خطاب یافتہ سورما) اور مختلف حلقوں سے پارلیمنٹ کے نمائندے، جو اپنے حلقوں (Shires) اور بارفز (ایسا حلقہ جسے پارلیمنٹ میں اپنا نمائندہ بھیجنے کا حق ملا ہو) کی نمائندگی کرتے تھے، ان اجلاسوں میں شرکت کرنے کے اہل تھے۔ ایڈورڈ سوم (Edward) کے زمانے سے ان عمومی نمائندوں نے نوابوں (لارڈز) سے الگ ہوکر اپنے اجلاس منعقد کرنا شروع کردیئے، لیکن سولھویں صدی تک انہیں اپنے اپنے اجلاسوں کے لیے الگ عمارت نہیں ملی، تاہم عوامی جنگ (Cival war) کے بعد تک انہیں باقاعدہ اجلاس کرنے اور محاصل پر کنٹرول وغیرہ کے حقوق اپنے حق کے طور پر حاصل نہ تھے، عوامی سول وار اور 1688ء کے انقلاب کے بعد حقوق کا بل منظور ہوا۔ اصلاح کے لیے پہلے ایکٹ کی منظوری 1832ء کے بعد، جاگیرداروں کا روایتی اثر ورسوخ کم ہونے لگا اور 1911ء کے پارلیمنٹ ایکٹ کے منظور ہونے کے بعد ''دارالامراء'' کے اختیارات کم کردیئے گئے، جس کے تحت انہیں کسی بل کو موٴخر کرنے کا تو حق حاصل رہا، مگر کسی قانون کو ویٹو کرنے کا حق حاصل نہ رہا۔ اس بل نے ارکان اسمبلی کی تنخواہوں کو متعارف کرایا۔ 1949ء کے ایکٹ نے ان کے کسی قانون کو موٴخر کرنے کی مدت کو محدود کردیا اور مالیاتی قانون سازی کے حق کا مکمل طور پر خاتمہ کردیا۔ جس کی بناء پر دارالعوام غیر معمولی طور پر طاقتور اور اہم ادارہ بن گیا۔ وہ عمارت جس میں اجلاس ہوتا ہے سر چارلس کی ڈیزائن کردہ ہے اور ویسٹ منسٹر کے محل کو

---

(3) The Encyclopaedia of Americane, vol.21, p. 465.

1934ء میں آگ لگ جانے کے بعد دوبارہ تعمیر کیا گیا''۔(۴)

ایک دوسرے مآخذ میں ہے:

برطانیہ آئینی بادشاہت رکھنے والا ملک ہے، نویں صدی عیسوی میں جب برطانیہ پر ایک سیکسون بادشاہ حکومت کرتا تھا، اس وقت کوئی آئین موجود نہ تھا، بادشاہ تمام اختیارات رکھتا تھا اور پھر جو اختیارات مختلف اوقات میں بادشاہوں، جاگیرداروں، خصوصی کونسلوں وغیرہ کو حاصل تھے، آج مجموعی طور پر عوام کو حاصل ہیں، جو اپنے منتخب نمائندوں کی وساطت سے انہیں استعمال کرتے ہیں۔(۵)

برطانیہ کے پاس کوئی تحریری دستور موجود نہیں، صرف رسوم ورواج اور روایات ہیں، جن پر پورا نظام چل رہا ہے، جن میں سے کچھ بنیادی قواعد اور اصولوں کو سٹیچوز (Statues) کی شکل میں محفوظ کرلیا گیا ہے۔

میگنا کارٹا(Magna carta)۱۲۱۵ء کی منظوری کے بعد اراضی کے قانون (Law of Land) اور بادشاہ اور پارلیمنٹ کی آزادی والا قانون منظور ہوا...... ۱۶۸۹ء میں منظور شدہ حقوق کے بل(Bill of Rights) کے اختتام پر پارلیمنٹ اور بادشاہ کے درمیان طویل سرکشی کا دور ختم ہوا اور ''اصلاحی ایکٹ) (Reform act) کی''۱۸۳۲ء میں ڈرامائی منظوری سے نمائندہ حکومتوں کا دور اختتام کو پہنچا اور مزید تبدیلیوں کی راہ ہموار ہوئی......آئین کا مقصد روایات اور رسوم ورواج میں ہونے والی تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہونا ہوتا ہے......آئین کی ہر دفعہ اور اس کا ہر حصہ، خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، تبدیل ہوسکتا ہے۔اس لیے کہ آئین کی رو سے پارلیمنٹ عوام کی نمائندہ ہے۔وہ سب سے برتر اور سب سے بالا ادارہ ہے۔پارلیمنٹ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کی جاسکتی لیکن وہ اسے تبدیل کرسکتی ہے(۶)۔

(ب) ھیئت وتشکیل

برطانوی پارلیمنٹ دو حصوں پر مشتمل ہے.....بادشاہ/ملکہ اور پارلیمنٹ، تفصیل درج ذیل ہے:

برطانیہ میں شاہی خاندان.......کے افراد(لڑکے نہ ہونے کی صورت میں لڑکیاں) اپنی سینارٹی کی بنیاد پر، ریاست کے سربراہ بنتے ہیں۔وہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے منظور ہونے والے بل کو منظور کرتے ہیں۔بادشاہ/ملکہ عدلیہ کے سربراہ بھی ہیں، جواب انتظامیہ سے مکمل طور پر الگ اور آزاد ہے۔کابینہ بنانے یا کسی وزیر کو اس کا شعبہ الاٹ کرنے سے قبل بادشاہ/ملکہ سے اس کی منظوری ضروری ہے۔اسی طرح معاہدہ، اعلان جنگ، یا جنگ بندی سے قبل اس کی رسمی منظوری لازمی ہے۔

برطانیہ میں ملکہ اور دونوں ایوانوں پر مشتمل کابینہ ہی قانون سازی کا حق رکھتے ہیں۔۱۹۱۱ء کے منظور شدہ ایکٹ کے مطابق پارلیمنٹ کا مجموعی دورانیہ پانچ برس ہے۔اس عرصے میں کسی اور بنا پر مثلاً حکومت کے ختم ہو جانے وغیرہ کی بنا پر، پارلیمنٹ کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

پارلیمنٹ کو سال کے دوران متعدد اجلاس منعقد کرنا ہوتے ہیں، مثلاً موجودہ روایت کے مطابق ایک سیشن میں عموماً ۶۰ ورکنگ دنوں پر مشتمل اجلاس ہونے چاہئیں، جو پانچ دورانیوں پر مشتمل ہوں۔

برطانیہ کی.......... پارلیمان........دو حصوں میں منقسم ہے، یعنی دارالعلوم(The Houses of commons)

---

(۴) Oxford Dictionary، ص۱۰۵۸۔

(۵) The Europa world year Book 2007، ۲/۴۶۳۲۔

(6) Parliament can not disobay but it can change it see did 2/4632

اوردارالامراء (The House of Lords)ان کے اراکین کوایم پی ایز کہا جاتا ہے،ملکہ......مملکت کی آئینی سربراہ ہے، اس کی اجازت کے بغیر...... پارلیمنٹ میں کوئی بزنس نہیں ہوتا۔(۷)

دارالامراء میں۱۲......لارڈ آف اپیل آرڈیزی(Lord of Appeal Ordinary) ہیں اور۲۴ چرچ آف انگلینڈ کے سینئر پادری(Bishops) بھی اس کے رکن ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں ہونے والی ترمیم نے موروثی جاگیرداروں کو دارالامراء میں بیٹھنے اور ووٹ دینے کا حق ختم کردیا ہے اور صرف۱۱۹۲ افراد کو موروثی طور پر اپنی نشستیں برقرار رکھنے کا حق دیا گیا ہے۔(۸)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ برطانیہ نے مذہبی طبقے کو پارلیمنٹ کے ایوان بالا (دارالامراء) میں باقاعدہ رکنیت دے رکھی ہے۔جس کا مقصد چرچ کے معاملات کا تحفظ دینا بیان کیا جاتا ہے۔

دارالعوام(House of Common) کے۱۶۴۶ ارکان ہیں،جن میں سے ہرایک مخصوص علاقے سے منتخب ہوتا ہے،سپیکر نومنتخبہ پارلیمنٹ کے اجلاس کی صدارت کرتا ہے......برطانیہ میں آباد۱۸ یااس سے زیادہ عمر والے ہر شہری کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے،تاقتیکہ اُسے ایسا کرنے سے نہ روکا گیا ہو،جو شخص ووٹ دینے کا حق رکھتا ہے،وہ کسی بھی نشست سے کھڑا ہونے کا حق بھی رکھتا ہے،چونکہ انتخابات پارٹی سسٹم کے تحت منعقد ہوتے ہیں۔اسی لیے انتخابات کے بعد اکثریتی جماعت کے سربراہ کو حکومت سازی کی دعوت دی جاتی ہے۔

ج۔اختیارات

برطانوی پارلیمنٹ معاشرتی زندگی کورواں دواں رکھنے اور ریاست کومختلف ضروری وسائل مہیا کرنے کے لیے قانون سازی اور حکومت کو منظم اور مربوط بنانے کے لیے تنقید کرنے کا حق رکھتی ہے،برطانیہ میں قانون سازی کی ابتدا دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک ایوان سے بھی شروع کی جاسکتی ہے،البتہ حکومت کی موجودہ روایت یہ ہے کہ عوامی بل........دارلعوام میں پیش کیے جاتے ہیں......جو بل تیسری خواندگی میں منظور ہوجاتا ہے،وہ منظوری کے لے دارالامراء کو بھیج دیا جاتا ہے......وہ اُسے منظور کرنے یانئی تجاویز کے ساتھ دارالعوام کوواپس بھیج سکتا ہے،مگر دارالامراء اسے مکمل طور پر منظور کرنے کا حق نہیں رکھتا(۹)

قانون سازی کے دوران متعدد درجوں پر ووٹنگ ہوتی ہے، جسے خواندگی (reading) کہا جاتا ہے......پہلی خواندگی محض رسمی ہوتی ہے،دوسری خواندگی اس وقت ہوتی ہے، جب کوئی بل ہاؤس میں قبول کرلیا جاتا ہے.....تیسری خواندگی حتمی اور فائنل تصور ہوتی ہے۔

بل کوان مراحل سے گزرنے سے پہلے مختلف کمیٹیوں میں بھیجا جاتا ہے، جہاں اس کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا جاتا ہے،جب ایک ایوان اسے پاس کردیتا ہے،تواسے دوسرے ایوان میں بھیج دیا جاتا ہے.....اگر دوسری خواندگی کے بعد یہ نظر آئے کہ دونوں ایوانوں کے مابین بعض امور کے متعلق اختلاف ہے،تو......اسے دارالعلوم کو دوبارہ غور کرنے کے لیے بھیج دیا جاتا ہے،اگر یہ بل ترامیم کے ساتھ پاس ہوجائے اور ملک اسے پاس کردے،تو وہ ''ایکٹ ۱۹۴۹ءآف دی پارلیمنٹ'' کے طور پر قانون بن جاتا ہے۔

۱۹۹۱ء کے پارلیمنٹ ایکٹ کی رو سے ''دارالعوام'' کے اختیارات بڑھا دیئے گئے ہیں،اس کے مطابق دارالامراء کا

---

(7) Encyclopaedia Britannica, Published New Yark, 29/18

(8) did 29/18

(9) The Europa waold Year Book, 2007, 21/4632

......ویٹو کرنے کا حق ختم کر دیا گیا ہے۔(۱۰)

اگر دارالعلوم کے سپیکر کی طرف کسی بل کو مالی بل (Money Bill) قرار دے دیا جائے، یعنی ایسا بل جس میں ٹیکس لگانے وغیرہ کی تجویز ہو) تو ایسی صورت میں......دارالامراء......اسے محض ایک ماہ تک روک سکتا ہے، اگر کوئی قانون پہلے ......دارالعلوم میں پیش کیا گیا ہو، تو اسے دارالامراء......زیادہ سے زیادہ...... پارلیمنٹ کے ایک سیشن (Session) تک روک سکتا ہے اور اگر کوئی بل......دارالامراء کی طرف سے ہی پیش کیا گیا ہو، تو وہ اسے جب تک چاہے......روک سکتا ہے (۱۱)۔

حکومت کے تین بنیادی عناصر ہیں: مقننہ (Legislature)، انتظامیہ (The Executive) اور عدلیہ (The Judiciary) ......(۱۲) جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے، انتظامیہ وزیراعظم اور اس کی بینہ پر مشتمل ہوتی ہے اور عدلیہ مختلف عدالتوں پر، برطانوی نظام میں، کچھ کوتاہیاں بھی ہیں، مثلاً ملک میں نگرانی اور توازن رکھنے والا نظام کمزور ہے، مثال کے طور پر لارڈ چانسلر، ایک ہی وقت میں......تینوں اداروں کا رکن ہوتا ہے......کابینہ کے ایک رکن کے طور پر......انتظامیہ کا، حکومتی قائد ہونے کی بنا پر ......دارالامراء کا، جو مقننہ کا ایک حصہ ہے......اس کا رکن ہے اور وہ عدلیہ کا بھی رکن ہوتا ہے (۱۳)۔

برطانیہ (U.K) میں حقیقی طاقت ''دارالعوام'' کے پاس ہے جو (۱۹۳۱ء) میں ۱۶۵۹ ارکان پر مشتمل ادارہ تھا، (اب ۱۶۵۹ ارکان ہیں) جنہیں عوام منتخب کرتے ہیں اور ان کی مرکزیت کابینہ کے پاس ہوتی ہے، جس کے اراکین (وزراء) کی تعداد مختلف ہوتی ہے، تاہم اس کے وزراء حکومت چلانے کے لیے ہاؤس کا اعتماد حاصل ہونا ضروری ہے۔ یہ ہاؤس کے محاصل سے متعلقہ سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ جب کہ ''دارالامرا'' عام طور پر ''دارالعوام'' کی طرف سے قبول کی سند حاصل ہونے کی بنا پر تمام فیصلوں کو قبول کر لیتا ہے، لیکن ۱۹۱۱ء کے منظور شدہ پارلیمنٹ ایکٹ کی رو سے اختلاف ہونے کی صورت میں دارالامرا اسے مزید دو سال تک موٴخر کرنے کا حق رکھتا ہے (۱۹۳۳ء)۔ یہ دونوں ادارے کسی قانون کو منظور کرنے یا اس کو تبدیل کرنے کے سلسلے میں اپنی برتری رکھنے کے ساتھ ساتھ بادشاہ کی جانشینی کو برقرار رکھنے یا اس کو تبدیل کرنے اور ریاست کے مذہب کو برقرار رکھنے یا تبدیل کرنے وغیرہ کا اختیار بھی رکھتے ہیں (۱۴)۔

کابینہ......وزیراعظم کے احکام کو نظر انداز نہیں کر سکتی اور مجموعی طور پر، اسے وزیراعظم کی حمایت کرنا ہوتی ہے اور کابینہ کی مدد دارالعوم کے ارکان کی اکثریت کرتی ہے، جس کی بنا پر، اس نظام کے ذریعے پارلیمنٹ کی بالادستی قائم ہوتی ہے......بادشاہ کی طرف سے......اٹھارویں صدی سے لے کر آج تک ویٹو کا حق استعمال نہیں کیا گیا، اور ۱۹۱۱ء میں دارالامراء کا کسی قانون میں ......تاخیر کے ذریعے......التواء کے حق کو کم کر دیا گیا ہے......کابینہ تمام اہم بلوں کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی پابند ہے......اس طرح کابینہ کی بالادستی عملی طور پر قائم ہے (۱۵)۔

الغرض تمام مآخذ اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ دور کی پارلیمنٹ کا قدیم ترین تصور برطانیہ میں پیدا ہوا اور وہیں پروان

---

(10) did 29/18, 1920

(11) did, pp-19

(12) did,pp-18

(13) did, p-19

(14) Encyclopaedia Britannica pp-19

(15) Also see, the Encyclopaedia pp-19

چڑھااور فی الوقت پارلیمنٹ کو دنیا کے تمام ملکوں میں مرکزی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

پھر آیا برطانیہ میں پارلیمنٹ "بالاتر" ہے۔یانہیں.....اس عنوان پر اگلے باب میں گفتگو کی گئی ہے۔

۲۔ فرانسیسی پارلیمنٹ

(الف) ابتدائی تاریخ:

دوسرے مغربی ممالک کی طرح.....فرانس بھی ......پارلیمنٹ......کی تاریخ صدیوں کو محیط ہے اور کئی مراحل پر محیط ہے۔۱۳۰۷ء میں مجلس امراء(Curia Regis).......سے وجود میں آنے والی "پارلیمنٹ آف پیرس" موجود تھی،جس کے دائرہ اختیار میں پوری مملکت آتی تھی،تیرھویں صدی میں......عدالتی امور بھی شامل کر لیے گئے۔۱۴۴۳ء میں سوسالہ جنگ کے خاتمے پر فرانسیسی بادشاہ ہنری چارلس پنجم نے تاؤلوس(Toulouse)....پیرس سے باہر......پارلیمنٹ تشکیل دی،جس کی حدود کارجنوبی فرانس کے بہت بڑے حصے کو محیط تھے،۱۱۴۳ء سے لے کر.....فرانسیسی انقلاب تک کئی پارلیمان وجود میں آئیں۔(۱۶)

یہ تمام پارلیمان.....شاہی حکمرانوں کی طرف سے درخواست آنے پر باقاعدہ احکام جاری کرتی تھیں اور وہ کسی فیصلے کو رجسٹر کرنے سے انکار بھی کرسکتی تھیں.....تاہم مجموعی طور پر......فرانسیسی پارلیمنٹ انگلستان کی پارلیمنٹ کے مقابلے میں کم حقوق رکھتی تھی....البتہ انقلاب فرانس کے بعد تبدیلی آئی اور پارلیمنٹ کو......ایوان زیریں بنادیا گیا۔

قدیم زمانے میں فرانس میں.......زمینداروں اور کلیسا کے پادریوں پر مشتمل ایک کونسل تھی،جو بادشاہ کو قانون سازی سے متعلق امور میں مشورے دیتی تھی،اس کی جگہ......اینگلو....سیکسون دور میں "The Witenagemont" (مجلس دانش منداں) کے نام سے ایک مقبول عام کونسل تشکیل دی گئی،۱۰۶۶ء میں نارمنوں کی.......کی مداخلت کے بعد کراؤن کونسل (Crown Council) میں تبدیل کردیا گیا۔(۱۷)

لوئیس نہم (Louis-ix)(۱۲۲۶-۱۲۷۰ء) کے دور میں جہاں ایک طرف انگلستان کے قبضے کے خلاف مہم تیز ہوئی ،وہاں دوسری جانب جمہوریت کی طرف بھی جدوجہد تیز تر ہونے لگی۔پارلیمنٹ آف پیرس "شاہی عدالتی ٹربیونل" کی شکل اختیار کر گئی،جس کی اجلاس باقاعدگی سے ہونے لگے....پارلیمنٹ کی موجودہ صورت جان کے دادا ایڈورڈ اول(Edward I) کے زمانے میں معرض وجود میں لائی گئی ...سابقہ بادشاہ کی طرح .....ایڈورڈ اول نے بھی .....شرفاء اور پادریوں کے قائدین کو......بادشاہ سے تبادلۂ خیال کے لیے بلایا....چنانچہ ۱۲۹۵ء میں ہونے والا،اسی مجلس کا ایک اجلاس.....ایک "مثالی پارلیمنٹ" بن گیا........اس لیے کہ اسی اجلاس نے.......بعد میں.......پارلیمنٹ کا طریقہ کار وضع کیا۔۱۳۰۷ء میں ایڈورڈ ال نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس کونسل سے مشاورت کے بغیر.....کوئی ٹیکس نہیں لگائے گا،اسی نے عدالتی نظام کو وسعت دی۔

ولیم آف نارمنڈی......وہاں ہمسایہ ملک نارمنڈی کا جاگیردارانہ نظام لایا چنانچہ وہ امراء(Curia Regis) کی مجلس سے مشاورت کے بغیر کوئی قانون نہیں بناتا تھا،اسی.....مجلس سے بعدازاں بڑے عدالتی کورٹ اور پریوی کونسل اور کیبنٹ تشکیل پذیر ہوئے۔

جاگیرداروں نے....اپنے رفقائے کار(عیسائی پادریوں)اور بادشاہ کے ساتھ مل کر.....حصول اقتدار کے لیے بڑی

---

(16) Encyclopaedia of Americana Vol 21, pp-465

(17) Americana, 21/753

جدوجہد کی، ان کی جدوجہد کے نتیجے میں بادشاہ نے میگنا کارٹا منظور کیا.... جس کی تحت حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم کر لیا..... کہ سابقہ دور سے......اراضی کے ٹیکسز کے علاوہ کوئی ٹیکس.....کونسل کی منظوری کے بغیر نہیں لگایا جائے گا۔(۱۸)

(ب) ہیئت و تشکیل

موجودہ پارلیمنٹ (Assembly) ۱۹۵۸ء میں منظور شدہ آئینی ترامیم کی روشنی میں ۱۱۵۷۷ افراد پر مشتمل ہے، جو سابقہ ایک نشست فی حلقہ کی بنیاد براہ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتی ہے۔ جبکہ ایوان بالا (Senate) کے ارکان نو برسوں کے لیے منتخب ہوتے ہیں اور ایک تہائی اراکین کی رکنیت تین سال کے بعد ختم ہو جاتی تھی، مگر ۲۰۰۳ء کی رامیم کی رُو سے ان کا انتخاب چھ برسوں کے لیے ہوتا ہے اور نصف اراکین تین برسوں کی بعد فارغ ہو جاتے ہیں۔ طے شدہ آئین کے مطابق اراکین سینٹ کی تعداد ۲۰۱۰ء کے بعد ۳۴۶ ہو جائے گی اور ان کی رکنیت کے لیے مطلوبہ عمر ۳۵ کے بجائے ۳۰ برس کر دی جائے گی۔(۱۹)

۱۷۸۹ء کے انقلاب کے بعد فرانس میں ۱۷ آئین بنائے گئے، جن میں سے دو نافذ ہی نہ ہو سکے، جبکہ زیادہ تر بہت ہی کم عرصے تک نافذ العمل رہے، حتیٰ کہ تیسرے ریپبلک (Re-Public) دور میں جس کا دورانیہ سب سے زیادہ ہے (۱۸۷۱-۱۹۵۰) ایسی تجاویز منظور کی گئیں، جن تک پہنچنا بے حد مشکل تھا.....ریپبلک کے صرف چار سال کے بعد نئے آئین میں جو ۱۹۵۸ء میں منظور ہوا، بہت بڑی تعداد میں آئینی ترامیم منظور کی گئیں۔۔۔ تاہم آئین میں ان متعدد تبدیلیوں کے باوجود انسانی حقوق کا مسودہ جو ۱۷۸۹ء میں منظور کیا گیا تھا، بدستور آئین میں پیش لفظ کے طور پر شامل ہے۔

(ج) اختیارات:

دوسری جمہوری ملکوں کی طرح فرانسیسی پارلیمنٹ بھی وسیع اختیارات رکھتی ہے، یہاں صدر کو وزیراعظم کے مقابلے میں زیادہ اختیارات حاصل ہیں۔ وزیراعظم اور کابینہ کا تقرر صدر کرتا ہے اور وزیراعظم اور کابینہ کو وہی برخاست بھی کرتا ہے اور وہی ''کابینہ'' کے اجلاس کی صدارت کرتا ہے۔ صدر کا پانچ سالہ مدت کے لیے انتخاب کیا جاتا ہے، کوئی صدر.....دو مرتبہ سے زیادہ منتخب نہیں ہو سکتا۔ فرانس کے آئین میں پارلیمنٹ کو بالاتر دکھایا گیا ہے اور تمام انتظامی اور مالی اُمور میں اُسے فیصلہ کرنے کا مجاز ٹھہرایا گیا ہے۔ آئین کی دفعہ ۲۶ کی رو سے پارلیمنٹ میں کی گئی کسی بھی تقریر، کسی ووٹنگ یا کسی عمل کی بنا پر اس پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا اور نہ ہی کسی رکن کی رکنیت کے دوران متعلقہ ایوان جس کا وہ رکن ہو گے ''بیورو'' کی منظوری کے بغیر اس کے خلاف کوئی فوجداری یا غیر فوجداری مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔ دونوں ایوانوں کے سیشنوں کی تعداد مقرر ہے۔ وزیراعظم صدر کے مسودے سے یا متعلقہ ایوان اکثریت سے سیشنوں میں اضافہ کر سکتے ہیں۔(۲۰)

۳۔ بھارتی پارلیمنٹ

(الف) ابتدائی تاریخ:

دنیا کی بڑی پارلیمانوں میں بھارتی پارلیمان بھی شامل ہے، بھارت طویل جدوجہد کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء

---

(18) did, p-150-75

(19) did 11/752- see also the New constitution of France, Published 1958, Press articale 24.

(20) see the constitution of France, 1958, artical 25-33

کو آزاد ہوا، آزادی کے فوراً بعد...... نئے آئین کی تیاری کا عمل شروع ہو گیا، بالآخر دو سال سے بھی کم عرصے میں قومی اسمبلی نے اُسے ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو منظور کر لیا اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے نافذ ہوا، اس تاریخ کا انتخاب ۲۶ جنوری ۱۹۴۷ء کے اعلان آزادی کی بنا پر کیا گیا۔ اس تاریخ کو بھارت میں یوم جمہوریہ کے طور پر منایا جاتا ہے۔ آئین میں بھارت کو Soveraign Socialist Secular Democratie Republic. (اعلیٰ وسوشلسٹ لادینی جمہوری ریاست) قرار دیا گیا ہے۔ بھارتی آئین کا شمارہ دنیا کے سب سے طویل تحریری آئینوں میں ہوتا ہے۔ یہ ۴۴۴ دفعات اور ۱۲ حصوں، بارہ شیڈول اور ۹۴ ترمیمات پر مشتمل ہے۔ جبکہ پارلیمنٹ دوایوانوں لوک سبھا اور راجیہ سبھا پر مشتمل ہے۔ موجودہ پارلیمنٹ بھارتی آئین کی منظوری اور نفاذ کے بعد سے جاری ہے، اس کی اٹھائیس ریاستوں کو امریکہ کی ریاستوں کے مقابلے میں بہت محدود اختیارات حاصل ہیں۔

(ب) ہئیت و تشکیل:

بھارت میں ریاست کا سربراہ صدر ہے، جسے پانچ سالہ مدت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ اس کا بھارتی شہری اور ۳۵ سال کی عمر کا ہونا ضروری ہے۔ جس میں توسیع کی گنجائش ہوتی ہے، اس کا انتخاب......دونوں ایوانوں (ایوان بالا اور ایوان زیریں) سمیت۔۔۔تمام ریاستوں کی منتخب اسمبلیاں کرتی ہیں، جبکہ نائب صدر کا انتخاب۔۔۔۔وفاق کے دونوں منتخب ادارے (لوک سبھا اور راجیہ سبھا) مشترکہ اجلاس میں.....کرتے ہیں.......اور وہ راجیہ سبھا کا صدر بھی ہوتا ہے۔ صدر مملکت کی غیر موجودگی، یا اس کی وفات کی صورت میں......نائب صدر.....منصب صدارت سنبھالیتا ہے.....صدر کے اختیارات.....برائے نام ہیں......وہ وزیر اعظم کے مشورے کا پابند ہوتا ہے.....البتہ ایمرجنسی کی صورت میں اس کے اختیارات بڑھ جاتے ہیں۔ صدر مرکز اور صوبوں میں مخصوص حالات میں ایمرجنسی نافذ کر سکتا ہے اور وزیر اعظم سے مشورہ کرنے کے بعد.....صدر......لوک سبھا کو تحلیل کر کے......نئے انتخابات کروانے کا بھی حق رکھتا ہے۔ (۲۱)

برطانیہ اور فرانس ہی کی طرح بھارتی پارلیمنٹ بھی دوایوانوں پر مشتمل ہے۔ دونوں ایوان (راجیہ اور لوک سبھا) میں سے لوک سبھا.....کے اختیارات زیادہ ہیں.....لوک سبھا کے اراکین کی تعداد ۵۲۵ ہے۔ جن کا انتخاب ریاستوں سے اور وفاق کے زیر انتظام علاقوں سے کیا جاتا ہے.....ارکان کی یہ تعداد آبادی کی بنیاد پر کی گئی ہے اور ۱۹۷۶ء میں لائی گئی ایک ترمیم کے مطابق اسے ۲۰۰۰ء تک اسی حالت پر فریز کر دیا گیا ہے، تا آنکہ ۲۰۰۰ء کے بعد......نئی مردم شماری ہو۔ صدر اینگلو انڈین آبادی کے دو افراد کا اس صورت میں تقرر کر سکتا ہے، جب اسے اس بات کا یقین ہو کہ اس آبادی کی صحیح نمائندگی نہیں ہو رہی......لوک سبھا کے ہر رکن کی میعاد پانچ سال ہے، سوائے اس کے کہ.....اسمبلی کو برخاست کر دیا جائے۔ ایمرجنسی کی صورت میں انتخاب کو کچھ وقت کے لیے مؤخر کیا جاسکتا ہے۔

رجیہ سبھا کے اراکین کی تعداد ۲۵۰ تک محدود ہے، وفاق کے زیر انتظام علاقوں سے ارکان کی تعداد ۲۵ تک محدود ہے۔ ان میں سے ۱۲ اراکین کا تقرر.......ادب، سائنس، فن اور سماجی خدمات کے شعبوں سے کیا جاتا ہے، جبکہ باقی.....اراکین کا انتخاب.....مختلف ریاستی اسمبلیاں کرتی ہیں، راجیہ سبھا کو........معطل نہیں کیا جاسکتا، البتہ ہر دوسرے سال کے اختتام پر اس کے تہائی اراکین برخاست ہو جاتے ہیں۔ (۲۲)

---

(21) The Americna, 14/932 under India.

(22)

تمام انتظامی اختیارات......وزراء کی کونسل (کابینہ) کو حاصل ہیں، جس کی سربراہی......وزیراعظم کرتا ہے، جسے لوگ سبھا کی اکثریتی پارٹی یا اتحادی پارٹیاں منتخب کرتی ہیں اور اسے ایوان کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہوتا ہے.....اور اس کا تقرر رسمی طور پر ......صدر کرتا ہے، جبکہ کابینہ کا انتخاب وزیراعظم کرتا ہے، جبکہ تمام احکام صدر کے نام سے جاری کیے جاتے ہیں، وہ کابینہ کے مشورے کا پابند ہوتا ہے، کابینہ ایوان زیریں "لوک سبھا" کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ وزراء کا تقرر بھی صدر وزیراعظم کے مشورے پر کرتا ہے (۲۳)۔

وزراء کے عہدوں کا فیصلہ.........ان کی متعلقہ شعبے سے......واقفیت یا......اکثریتی پارٹی کے قائدین کی پسندیدگی پر کیا جاتا ہے، یہ کابینہ اس وقت تک برسراقتدار رہتی ہے، جب تک......ایوان زیریں میں، انہیں اکثریت حاصل رہتی ہے۔کوئی وزیر چھ ماہ سے زیادہ وزیر نہیں رہ سکتا اگر وہ ایوان زیریں کا رکن نہ ہو........(۲۴) بطور وزیر اگر وہ کسی ایوان کا رکن نہیں ہے، تو وہ اس کے پلیٹ فارم پر تقریر تو کر سکتا ہے، مگر ووٹ نہیں دے سکتا۔(۲۵)

عام بل.....دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک میں.....اور مالیاتی بل......ایوان زیریں میں......پیش کیا جاسکتا ہے اور ان کی منظوری کے لیے محض سادہ اکثریت سے کافی ہوتی ہے۔ ایوان بالا میں کوئی مالیاتی بل پیش نہیں کیا جاسکتا......ایوان زیریں کے منظور کردہ مالیاتی بل میں ایوان بالا.......۱۴دن میں جو مناسب سمجھے ترامیم پیش کر سکتا ہے، مگر ان کا ایوان زیریں سے منظور ہونا ضروری ہے۔

مرکز ہی طرز پر صوبوں کی حکومت.......گورنر اور کابینہ......کے ذریعے، جس کا سربراہ وزیراعلیٰ ہوتا ہے، چلائی جاتی ہے، ہر ریاست کی اپنی اسمبلی (ودھان سبھا) ہوتی ہے، جس کا انتخاب پانچ سالہ مدت کے لیے ہوتا ہے، جبکہ چند......ریاستوں میں ایوان بالا (ودھان پرشاد) بھی ہے.....جو مرکز کے راجیہ سبھا.....کی طرح کا ایوان ہے اور جس کے ارکان کی تعداد۔۔۔اسمبلی کے ارکان کی ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہوتی ہے، ان کا چھٹا حصہ۔۔۔گورنر کی طرف سے نامزد ہوتا ہے اور باقی اراکین کو.....خصوصی ووٹروں کے ذریعے.....منتخب کیا جاتا ہے.....گورنر بھی ریاستی اسمبلی کا حصہ تصور کیا جاتا ہے، جسے وہ......ریاستی اسمبلی میں کسی پاس اکثریت نہ رہنے پر برخاست کر سکتا ہے۔

بھارت میں ہر اٹھارہ سال کی عمر والے شخص کو حق رائے دہی حاصل ہے......بھارت میں کئی جماعتی سیاسی نظام نافذ ہے۔(۲۶)

سنسا بھاون:

پارلیمنٹ (سنساء بھاون) ایک گولائی مائل عمارت ہے، اسے برطانوی ماہر تعمیرات ....ایڈون لیٹنز (Edwin Letyens) اور سر ہربرٹ بیکر نے ۱۹۱۲-۱۹۱۳ء میں تعمیر کیا تھا.....اس کی عمارت کو ۱۱۴ ستونوں سے سہارہ دیا گیا ہے.......یہ عمارت صدراتی محل، راشٹریہ بھاون سے........پتھر پھینکنے کے فاصلے پر واقع ہے (۲۷)

---

(23) Americna, 14/932

(۲۴) داس ہری Political System of India، انمول پبلی کیشنز، دہلی، isb نمبر ۸۱۷۴۸۸۸۷، ص ۱۲

(۲۵) Americna، ۹۳۳/۱۴

(۲۶) ایضاً، ۱۴/۹۳۳

(۲۷) Eccyclopedia Americna, Vol. 14, pp-934-935

بھارت میں نظریاتی طور پر پارلیمنٹ سب سے بالاتر ادارہ ہےاور کسی دوسرے ادارے نے اس کی بالادستی کو چیلنج نہیں کیا۔

۴۔ امریکی پارلیمان:

دنیا کی بڑی پارلیمانوں میں سے ایک بڑی پارلیمان امریکہ کی بھی شمار ہوتی ہے۔

(الف)ابتدائی تاریخ:

امریکہ میں آئین ۱۷۸۷ء میں منظور ہوا، تاہم ......حتمی نفاذ ۱۷۸۸ء میں عمل میں آیا، جب اُسے کنفیڈریشن کی دفعات(Articles of Confederation) کی جگہ نافذ کیا گیا.......نفاذ کے وقت بہت سی ریاستوں نے تحریری آئین کی مخالفت کی، کیوں کہ اس میں حقوق انسانی والا حصہ شامل نہیں تھا۔

امریکی آئین ایک طویل جدوجہد کی تاریخ رکھتا ہے،اس میں ۷ جون ۱۷۷۶ء والا اعلانِ آزادی بھی شامل ہے۔ James Madison اور John jay کو جوفیڈریشن کے حامی تھے،فادر آف دی Constitution کہا جاتا ہے۔کیوں کہ ان دونوں کی کوششوں سے امریکن آئین منظور ہوا(۲۸)۔

(ب)ہیئت وتشکیل:

امریکی آئین میں ملک کے لیے وفاقی نظام حکومت نظام تجویز کیا گیا ہے،جس میں.....مخصوص اختیارات صدراتی طرز حکومت پر مبنی وفاقی قومی حکومت کواور باقی اختیارات صوبائی ریاستوں کو.....دیئے گئے ہیں،قومی حکومت انتظامیہ،مقننہ اورعدلیہ پر مشتمل ہے.....جس میں......تینوں اداروں کے مابین اختیارات کی تقسیم کر کے.....یہ ظاہر کیا گیا ہے، کہ ان میں سے کوئی محکمہ دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتا،البتہ......ان کے مابین چیک اینڈ بیلنس کا نظام برقرار رکھا گیا ہے۔

امریکی آئین کے نفاذ (۱۷۸۸ء) کے بعد سے اب تک اس میں ۲۷ ترمیمات کی گئی ہیں،جن میں ابتدائی ترمیمات (RightsBill of) کہلاتی ہے،جن میں امریکی شہریوں کومختلف حقوق دیئے گئے ہیں۔

انتظامیہ کا سربراہ......صدرمملکت ہوتا ہے،جس کے لیے امریکہ کا پیدائشی ہونا اور ۳۵ برس کا ہونا.....اورگزشتہ چودہ برسوں سے امریکہ کا رہائشی ہونا ضروری ہے......اورآئین کی بائیسویں ترمیم کے مطابق صدر کے عہدے کی میعاد چارسال کر دی گئی ہےاور ایک شخص دومرتبہ صدرمنتخب ہوسکتا ہےاوراسے بالواسطہ طریقے پرمنتخب کیا جاتا ہے......آئین کے مطابق صدر امریکہ افواج کا.......کمانڈر اعلی بھی ہے،اسے صلح کے متعلق بات چیت کرنے ،وفاقی ججوں کی تقرری،سفراءاورکابینہ کے افسران اوروزراء ،کی تقرری کا اختیار حاصل ہےاوروہ ریاست کے سربراہ کے طور پر بھی کام کرتا ہے۔کابینہ کے اراکین اٹارنی جنرل اورمختلف شعبوں کے سیکرٹریز،خزانہ،دفاع،سرزمین امریکہ کی سلامتی،داخلہ زراعت،تجارت،لیبر،صحت،انسانی خدمات،ہاؤسنگ،دیہی ترقی، ذرائع نقل وحمل،تعلیم،توانائی اورحیوانی معاملات......کا تقرر بھی صدر امریکہ سینٹ کے مشورہ سے کرتا ہے۔

مگر وسیع پیانے پر اہم ترین اختیارات صدر کے امدادی شعبوں اوران کے سربراہوں کو حاصل ہیں۔جس میں انتظامیہ اور بجٹ سازی (DMB)،حکومت کے اقتصادی مشیران،قومی سلامتی کونسل (NSC) اوروائٹ ہاؤس کے چیف آف سٹاف وغیرہ

---

28) The Debatas on constitution federalist and anti federalist speeches, artical (Baily Bemard(مدیر)

جیسے افراد اور ادارے شامل ہیں (۲۹)۔

کانگریس کے ۴۳۵ اراکین کا انتخاب ہر دو سالوں کے لیے ہر ریاست میں ایک ضلع ایک سیٹ کی بنیاد پر...... براہ راست انتخاب کے ذریعے ہوتا ہے اور مختلف ریاستوں کو...... الاٹ کیے گئے اراکین کا انحصار مختلف اوقات میں ہونے والی مردم شماری پر رکھا جاتا ہے.........

انتخاب کے لیے...... مذکورہ رکن کا..... اسی ریاست کا سکونتی ہونا، کم از کم ۲۴ برس کی عمر کا ہونا اور گزشتہ سات برسوں سے امریکہ میں رہائش رکھنے والا ہونا ضروری ہے...... ایوان کا سپیکر جس کا انتخاب اکثریتی پارٹی کرتی ہے، بحث و مباحثہ..... کی صدارت کرتا ہے اور انتخابی اور کانفرنس کمیٹیوں کا تقرر اور دوسری اہم خدمات سرانجام دیتا ہے..... وہ نائب صدر کے بعد، ہم سب سے اہم شخص تصور ہوتا ہے۔

ہر ریاست...... سینٹ کے دو ارکان کا انتخاب کرتی ہے..... سینٹ کا رکن بننے کے لیے اس کی عمر کا ۳۰ برس ہونا، متعلقہ ریاست کا سکونتی ہونا اور گزشتہ نو برسوں سے.... امریکہ میں رہائش کا حامل ہونا ضروری ہے، سینٹ کے رکن کے عہدہ کی میعاد چھ برس ہے، مگر...... ہر دوسرے برس ایک تہائی اراکین کی مدت ختم ہونے پر، ان کا نئے سرے سے انتخاب ہوتا ہے..... نائب صدر سینٹ کے اجلاس کی صدارت کرتا ہے، سینٹ میں بھی متعدد کمیٹیاں کام کرتی ہیں..... کسی دوسرے ملک سے صدر کے کیے ہوئے معاہدے کو سینٹ دو تہائی اکثریت سے ختم کر سکتی ہے، وہ صدر کی طرف سے کسی بھی وفاقی جج، سفیر کابینہ کے افسران کے تقرری کی منظوری یا اس کو معطل کر سکتی ہے...... امریکہ میں دو جماعتی یعنی ڈیموکریٹک اور ریپبلکن پر مبنی نظام حکومت رائج ہے (۳۰)۔

(ج) اختیارات:

قانون سازی اور پالیسی بنانے کے اختیارات...... وفاقی حکومت کے دونوں اداروں، یعنی سینٹ ایوان نمائندگان (کانگریس) کو حاصل ہیں..... کانگریس کو حاصل شدہ اختیارات میں، ٹیکس لگانے، زر کے حصول و پھیلاؤ، ریاستوں کے مابین باہمی تجارت کو باقاعدہ بنانے، صدر کے مؤاخذے اور اسے ملزم ٹھہرانے، جنگ کا اعلان کرنے، ان اداروں کی رکنیت کو منظم کرنے اور اپنے پروسیجر کے قواعد بنانے وغیرہ کے اختیارات شامل حاصل ہیں۔

مالی بلوں کے علاوہ، جو صرف کانگریس ہی میں پیش ہو سکتے ہیں، دوسرا کوئی بھی بل...... دونوں ایوانوں میں سے کسی بھی ایوان میں پیش کیا جاسکتا ہے، البتہ اس کا دونوں ایوانوں سے منظور ہونا ضروری ہے..... اور قانون بننے سے قبل اس پر صدر کے دستخطوں کا ہونا بھی لازمی ہے، صدر کو کسی بھی بل کو ویٹو کرنے کا حق حاصل ہے، مگر اس ویٹو کو دونوں ایوانوں کی دو تہائی اکثریت سے ختم کیا جاسکتا ہے۔ ایوان نمائندگان سادہ اکثریت سے صدر سمیت کسی بھی...... سرکاری مشیر یا (وزیر) کا مواخذہ کر سکتا ہے، البتہ کسی عہدے دار کو اس کے عہدے سے ہٹانے کے لیے..... سینٹ کے دو تہائی اراکین کا..... متفق ہونا ضروری ہے۔

کانگریس نمائندگان میں کوئی بھی بل سٹینڈنگ کمیٹیاں وصول کرتی ہیں، جو اس بل کو جلد منظور کرنے، مؤخر کرنے یا مکمل طور پر ختم کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں۔ ہر کمیٹی کا سربراہ اکثریتی جماعت کا رکن ہوتا ہے۔ (۳۱)

---

29) The Europa world Book 2oo7 بذیل ۷۷/۳/۲ The Constitution ot USA

30) did ,

13) did , 2/4774

اس طرح امریکہ میں اگر چہ صدر کو وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں، تاہم پارلیمنٹ کی بالادستی کو صدر کے مواخذ اور دونوں ایوانوں کی اکثریت سے صدر کے ویٹو کے حق کو ختم کرنے وغیرہ کی دفعات کے ذریعے مؤثر بنایا گیا۔

خلاصہ بحث

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ دنیا بھر میں پارلیمنٹ کو ریاست کا سب سے بڑا قانون سازی اور انتظامی ادارہ تصور کیا جاتا ہے، جس کا سب سے اہم کام ریاست کے معاملات کو باہمی مشاورت سے چلانا اور آگے بڑھانا ہے۔ جہاں تک مشاورت اور مشاورتی اداروں کا تعلق ہے، تو اسلام میں نہ صرف اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، بلکہ قرآن کریم میں واضح الفاظ میں اس کا حکم دیا گیا ہے، اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں پیش کی جارہی ہے۔

فصل دوم:

ریاست میں پارلیمنٹ کی اہمیت وضرورت

اسلام میں مشورے کی اہمیت وضرورت سے، جس کا سابقہ باب میں ذکر ہوا، اس امر کا اچھی طرح اظہار ہوتا ہے کہ اسلام میں شخصی اور آمرانہ طرز حکومت کو پسند نہیں کیا گیا، اسی لیے اسلام میں شخصی استبداد یعنی ظلم وجور کی شدید مذمت کی گئی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مشورہ کسی سے لیا جائے اور جن لوگوں سے مشورہ لیا جاتا ہے، ان کا انتخاب کون کرے۔۔۔۔اور انتخاب کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے۔

اسلام میں کچھ باتوں کا تو جواب دیا گیا اور کچھ باتوں کو آئندہ آنے والے مجتہدین کے اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر اسلام میں مشورے اور مشورے پر مبنی نظام حکومت کو پسند کیا گیا ہے۔ خود نبی اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین اسی انداز حکمرانی پر عامل اور کاربند رہے۔

رہا یہ سوال کہ۔۔۔مشورے میں جو لوگ شریک ہوں، ان کا انتخاب کون کرے، اس سوال کا جواب خلافت راشدہ کے دور میں یوں تلاش کیا گیا کہ خلیفہ کا انتخاب ''اہل الرائے'' کے مشورے سے ہو اور خلیفہ علم اور تجربے کی بنیاد پر۔۔۔۔''مجلس شوری'' (پارلیمنٹ کی ابتدائی شکل) کے لیے لوگوں کا انتخاب کرتا تھا (۲)۔

جیسا کہ اوپر گزرا حضرت عمر فاروقؓ۔۔۔۔نے دو مجالس قائم کر رکھی تھیں، ایک بڑی اور عمومی مجلس تھی اور دوسری خصوصی مجلس تھی۔ خصوصی مجلس میں روزمرہ کے معاملات نپٹائے جاتے تھے جبکہ ''عمومی مجلس'' ہیں، ایسے مسائل پر بحث ہوتی، جن کا تعلق بنیادی مسائل ومعاملات سے ہوتا تھا اور پھر ان مجالس میں انتظامی امور اور سیاسی مسائل بھی زیر بحث آتے تھے اور مذہبی اور دینی مسائل پر بھی بحث ہوتی تھی۔

۲۔ عصر حاضر میں مشورے کی روایت کا ارتقاء

عصر حاضر میں مشورے کی اس روایت کو منظم، مربوط بنانے اور اسے ایک باقاعدہ ''پارلیمنٹ'' کی شکل دینے کا سہرا۔۔۔اہل مغرب کے سر ہے،۔۔۔۔جہاں یہ روایت صدیوں میں ارتقاپذیر ہوئی اور بالآخر کئی انقلابات اور کئی عوامی جنگوں کے بعد، بالآخر ایک واضح اور منظم شکل میں تشکیل پذیر ہوگئی اور اس طرح موجودہ دور میں ان تمام سوالوں کا جواب جدید جمہوری نظام میں تلاش کر لیا گیا ہے، جن کا جواب تلاش کرنے کی ذمہ داری آنے والے مجتہدین پر ڈالی گئی تھی۔

موجودہ زمانے میں ''پارلیمنٹ اور اس کے لیے افراد کے انتخاب کی اساس جمہوریت پر رکھی گئی ہے۔۔۔۔جمہوریت کی تعریف مختلف لوگوں نے مختلف طریقے پر کی ہے۔۔۔۔ایک مغربی مفکر سیلائے (Seeloy) نے جمہوریت کی تعریف ان الفاظ کی ہے:

---

(۱) دیکھیے الشوریٰ ۳۸ اور آل عمران ۱۵۹۔۔۔تفصیل سابقہ باب میں گزر چکی ہے۔

(۲) دیکھیے ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، ۱۳/۳۴۲ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب ۲۸، الفاظ یہ ہیں: وکان القراء اصحاب مشورۃ کھولا وشبانا۔۔۔۔
اس کا فرانس کی ایلیٹ کلاس پر مبنی قدیم مجلس ''Curra Regis'' سے تقابل کیا جاسکتا ہے، جس کے انتخاب کا سوائے جاگیرداری کے کوئی اصول نہ تھا۔۔۔دیکھیے سابقہ باب۔

(۳)"A Government in which every one has ashare"

ایک ایسی حکومت جس میں ہر شخص کا حصہ ہو۔۔۔۔

ایک دوسرے مغربی مفکر۔۔۔۔ابراہام لنکن نے۔۔۔۔جمہوری حکومت کی یہ تعریف کی ہے:

"It is a government of the peoplefor the people and by the people"(4)

یہ ایک ایسی حکومت ہے جو عوام کی ہو، عوام کے لیے ہو اور عوام کے ذریعے ہو۔

ایک اور مغربی ماہر قانون مسٹر لارڈ برائس نے اس کی تعریف یوں کی ہے۔

A form of government in which the ruling power is largely vested not in any one individual or in particular class but in the members of the country as a whole.(5)

یعنی حکومت کی ایک ایسی شکل، جس میں حکومت کرنے کے اختیارات زیادہ تر کسی ایک فرد یا کسی خاص خاندان تک محدود نہ ہوں، بلکہ بحیثیت مجموعی ملک کے ہر فرد تک وسیع ہوں۔

بہر حال جمہوریت اور جمہوری حکومت کی جو بھی تعریف کی جائے، ایک ''جمہوری ریاست'' کے لیے درج ذیل امور کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱۔ ایک ایسی پارلیمان کی موجودگی، جس کا ہر رکن بالغ دہی کی بنیاد پر۔۔۔۔عوام کے ووٹوں سے منتخب شدہ ہو۔

۲۔ جہاں۔۔۔اکثریتی جماعت کے قائد کو حکومت سازی کا حق حاصل ہو۔

۳۔ کابینہ۔۔۔مقننہ/پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہو۔

۴۔ حکومت کو جب تک پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل رہے وہ برسر اقتدار رہے۔

۵۔ جہاں عدلیہ آزاد اور خود مختار ہو۔(۶)

یہ بات معلوم و مسلم ہے کہ موجودہ دور میں پارلیمنٹ کا ادارہ ہر نظام حکومت میں خواہ وہ امریکہ کی طرح کا صدارتی ہو، یا برطانیہ، بھارت اور فرانس وغیرہ کی طرح کا پارلیمانی ہو، بنیادی اور اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ دراصل پارلیمنٹ جمہوریت کی اور جمہوریت عوامی حکومت کی علامت ہے۔ Encyclopaedia Americana مقالہ نگار لکھتا ہے:

''پارلیمنٹ حکومت کا مرکزی قانون ساز ادارہ ہے جس میں مجلس قانون میں سے لیے گئے وزراء کے ذریعے حکومت چلائی جاتی ہے۔ انتظامیہ کو وزیر اعظم کی سربراہی میں قائم کابینہ کے ذریعے احکام اور ہدایات جاری کی جاتی ہیں۔ وزراء ایک جماعتی نظام ہونے کی صورت میں تمام ایک ہی سیاسی جماعت کی اور ایک سے زیادہ سیاسی جماعتوں کے اتحاد پر مبنی حکومتی نظام کی صورت میں اتحاد میں شامل تمام جماعتوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور اگر مجلس

---

۳) ایم محمود The Constitution of Republic of Pakistan، پاکستان ٹائمز پبلیکیشنز، لاہور، ایڈیشن ۲۰۱۰، ص ۲۹

۴) ایضا

۵) ایضا، ۲۷

۶) ایضا، ۲۷

قانون میں اس سیاسی حکومت کو اکثریت کی تائید حاصل نہ رہے تو وزیر اعظم کو دو باتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے یا تو وہ وزارت عظمی سے مستعفی ہو جاتا ہے یا پھر نئے انتخابات کے لیے عوام کی طرف رجوع کرتا ہے۔ دولت مشترکہ کے اکثر ممالک میں برطانوی نظام حکومت اپنایا گیا ہے"۔(۷)

ڈاکٹر صفدر محمود آئین پاکستان ۱۹۷۳ء "تعارف و تجزیہ میں" پارلیمنٹ کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پارلیمنٹ کسی قوم کا صحیح نمائندہ ادارہ ہوتا ہے اور قومی ذہن اور فکر کی عکاسی کرتا ہے پارلیمنٹ عوام کے اقتدار اعلی کی مظہر ہوتی ہے اور سب سے زیادہ با اختیار ادارہ تصور ہوتی ہے۔ ملک کی انتظامیہ، وزیر اعظم اور دوسرے وزراء پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں اور پارلیمنٹ ہی وزیر اعظم منتخب کرتی ہے، انگلستان میں تو پارلیمنٹ کے اختیارات کے متعلق یہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ ہر قسم کا قانون بنا سکتی ہے، حتی کہ عورت کو مرد بھی کہہ سکتی ہے اور اسے بہر حال قانون کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ملک کے سب سے اہم قانون ساز ادارے کی حیثیت سے پارلیمنٹ کی اہمیت باقی تمام اداروں سے زیادہ سمجھی جاتی ہے۔

---

7) Encyclopaedia Americana, 23/466 under Parlimint.

باب دوم

پارلیمنٹ کی بالادستی کا تصور

فصل اول:

پارلیمنٹ کی بالادستی کا نظریہ اور مختلف ممالک کے پارلیمنٹ کی بالادستی کے متعلق بحث

فصل دوم:

پاکستانی پارلیمنٹ کے اختیارات

فصل سوم:

1973ء کے آئین کے تحت پاکستانی پارلیمنٹ کی بالادستی کا مسئلہ

فصل اول:

پارلیمنٹ کی بالادستی کا نظریہ اور مختلف ممالک کی پارلیمنٹ کی بالادستی کے متعلق بحث

مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کسی ریاست کے تین ستون ہوتے ہیں۔ یہ تینوں ادارے اپنے اپنے مقام پر اہم ہیں اور کسی ایک کے بغیر ریاست کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان تینوں کا آپس میں تعلق بھی ہوتا ہے۔ تینوں کے باہمی ربط و تعلق کے بغیر بھی نظام نہیں چل سکتا۔ لیکن مقننہ جسے دوسرے لفظوں میں پارلیمنٹ کہا جاتا ہے اس اعتبار سے ان تینوں میں اہم ترین ہے کہ یہ پورے ملک کے عوام کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ عوام کی آواز ہوتی ہے عوام کے نمائندے جو کچھ کہتے ہیں وہ عوام ہی کی خواہش ہوتی ہے اور چونکہ عوام جمہوریت کی بنیاد ہیں اور جمہوریت کی تعریف ہی یہ ہے کہ عوام کی حکومت، عوام کے لیے عوام کے ذریعے۔ پارلیمنٹ کی رائے کا احترام نہ کرنا درحقیقت عوام کی رائے کی بے حرمتی ہے۔ اس لیے پارلیمنٹ کو باقی اداروں پر بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ باقی ادارے پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع ہوتے ہیں۔

پارلیمنٹ کی بالادستی کا تصور۔۔۔۔سب سے پہلے برطانوی روایات میں ملتا ہے۔۔۔۔ برطانوی آئینی تاریخ میں غالباً یہ تصور سب سے پہلے قانونی اور منظم انداز میں جان آسٹن (Jon Austin) نے پیش کیا، جس کی وجہ یہ خیال تھا کہ قانون بنانے والے فرد یا ادارے کو عدلیہ سے بالاتر ہونا چاہیے، ورنہ اس کا بنایا ہوا قانون درست نہیں ہوگا۔(۱)

بہر حال یہ دعوی کیا جارہا ہے کہ آسٹن کے اصول کو برطانوی قانون دانوں اور سیاست دانوں نے اس بنا پر تنقید کا نشانہ بنایا کہ اسے بغیر کسی سوال کے تسلیم کر لیا گیا ہے۔(۲)

پارلیمنٹ کی بالادستی کا نظریہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ برطانوی آئین کے ''بنیادی حقوق'' سے متعلق حصے قدامت رکھتے ہیں۔ معروف ماہر قانون اے وی ڈیکے (A.V.Dicey) اسے اپنے سیاسی اداروں کی سب سے واضح شناخت بتاتا ہے۔ اسی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ کسی بھی قانون کو خواہ وہ کیسا بھی ہو، پارلیمنٹ بنانے یا مسترد کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔۔۔۔ اور ''عدلیہ'' کسی بھی قانون کی برانچ (Statues) کے متعلق یہ جانچنے کا اختیار نہیں رکھتی کہ اس میں اخلاقی یا قانونی اصول کی خلاف ورزی تو نہیں کی گئی۔۔۔ اسی لیے اس ایک اصول کے سوا کہ پارلیمنٹ بالاتر ہے، کوئی قانون یا آئین ایسا نہیں کہ جسے پارلیمنٹ تبدیل نہیں کر سکتی۔ چنانچہ سیاسی ماہرین قانون نے برطانوی آئین کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

What the Queen in Parlimint enacts is Law

یعنی ''ملکہ پارلیمنٹ میں جو قانون وضع کرتی ہے وہ قانون ہے (۳)۔ برطانیہ ہی کی طرح نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کی پالیمانیں بھی قانون سازی کے معاملے میں خودمختار اور بالادست شمار ہوتی ہیں۔

---

1) Geoffrey Marshall, parliamentary sovereignty and the commen wealth, Oxfford, university press,1957,pp.127

2) K.O.C.. wheare, the Statute of west minister and status (5th ed.1953.p337)

3) Geofrey Gold worlty,pp6.

البتہ پارلیمنٹ کی بالادستی کا نظریہ زیادہ دیر برقرار نہیں رہا بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں عدلیہ پر تحقیقی اور علمی کام کرنے والے وکلاء اور ماہرین قانون نے پارلیمنٹ کی بالادستی کو چیلنج کر دیا۔ چنانچہ نیوزی لینڈ کی ''کورٹ آف اپیل'' کے صدر روبن کک (Sir Roben Cook) پہلے نمایاں شخص ہیں جس نے عوامی سطح پر پہلی مرتبہ اس کا اظہار کیا۔ انہوں نے پارلیمنٹ کی بالادستی کے متعلق ابتدائی درجے کے تحفظات کا اظہار کرنے کے بعد کہا کہ کچھ عوامی حقوق بنیادی طور پر اتنے گہرے واقع ہوئے ہیں کہ انہیں پارلیمنٹ بھی تبدیل نہیں کر سکتی، اس کے بعد نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور برطانیہ کے کئی جج حضرات یا تو اس بیان کی تائید کر چکے ہیں یا اسے قابل بحث قرار دے چکے ہیں۔ (۴)

حال ہی میں آسٹریلیا کی عدالت عالیہ (High Court) نے مبینہ طور پر اس مسئلے پر فیصلے کو معطل کر دیا کہ آیا ریاستی پارلیمنٹ کی طرف سے بطور مقننہ اپنے اختیارات کا استعمال جمہوری اور عوامی حقوق کے اندر گہرائی سے اترے ہوئے مسائل پر کسی قسم کی پابندی سے مشروط ہے یا نہیں۔ تاہم برطانیہ میں ابھی تک کئی سینئر جج پارلیمنٹ کی برتری کے حق میں اور کئی اس کی مخالفت میں رائے رکھتے ہیں۔ سر جان لاز (Sir John Laws) نے اس بات کے حق میں دلائل دیے ہیں کہ حقیقی بالادستی پارلیمنٹ کو حاصل نہیں، بلکہ برطانیہ کے غیر تحریری آئین کو حاصل ہے جو جمہوریت، آزادی اظہار، جیسے نمایاں بنیادی حقوق پر مشتمل ہے۔ جنہیں اگر ضرورت پیش آئے تو عدالت کسی بھی ضمنی قانون (statues) کو معطل قرار دے کر نافذ کر سکتی ہے۔ زیادہ دور جائے بغیر، سر سٹیفن لے (Sir Stephen Sedley) نے تجویز دی ہے کہ پارلیمنٹ کی بالادستی کا نظریہ۔۔۔۔ نئے اور ابھی تک برقرار ''آئینی بالادستی'' کے نظریہ سے تبدیل ہو چکا ہے۔ جو تاج برطانیہ کی پارلیمنٹ اور تاج برطانیہ کی عدلیہ میں بالادستی کے دو نکاتی اصولوں پر مبنی ہے۔ (۵)

یوں برطانیہ، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا میں پارلیمنٹ کی بالادستی کے متعلق شکوک وشبہات میں اضافے کے ساتھ ساتھ، ان تینوں ممالک میں ''عدلیہ'' کی غیر معمولی طور پر فعالیت (Activism) بھی بڑھ رہی ہے اور چند وجوہ کی بنا پر عدلیہ کی طرف سے حکومت کے دوسرے اداروں کو کنٹرول کرنے کی اہلیت اور ارادے کا دنیا کے کئی ممالک (بشمول پاکستان میں) اظہار ہو رہا ہے۔

دراصل جب عدلیہ غیر تحریری حقوق کا حوالہ دے کر پارلیمنٹ کو کوئی قانون بنانے سے روک کر اس کی بالادستی کو غیر درست قرار دیتی ہے تو وہ خود اپنی ''بالادستی'' کا اظہار کر رہی ہوتی ہے کہ حتمی بالادستی عدلیہ کو حاصل ہے، نہ کہ پارلیمنٹ کو، اسی لیے حکومت کے منتخب اداروں کے ارکان میں ایک گونہ خوف کا احساس پایا جاتا ہے۔ جسے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں پہلی مرتبہ زبان دی گئی۔ ایسا ۱۹۹۶ء میں اس وقت ہوا جب لیرج کے لارڈ اروِن (Lord Irvine of Lairge) اور شیڈون لارڈ چانسلر (Shadon Lord Chanceller) نے ''دارالامراء'' میں اس بات پر بحث وتمحیص کا آغاز کیا کہ حکومت کے تینوں شعبوں میں باہمی تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے۔ (۶) ۔ انہوں نے لارڈ وولف (Lard woolf) اور لارڈ کک آف تھورنڈن (Lord Cook of Thhorndon) (سابقہ نیوزی لینڈ کے سر رابن کک) کی موجودگی میں سینئر ججوں کی طرف سے دیے جانے

---

4) Geoffrey, pp.3 (Introduction)

5) did, pp,3 (Introduction)

6) See, Parliamentary debates, 5th Series, vol.572. House of Losds, 5 June 1996, pp.1554-1313

والے بیانات اور عدلیہ کی بالادستی کی متبادل صورت کو"غیر دانشمندانہ اور غیر متوازن قرار دے کر انہیں ہدف تنقید بنایا، جب کہ لارڈ میکرے (Lord Macray) لارڈ چانسلر (Lord Chancellor) اور لارڈ ولبر فورس نے مکمل طور پر پارلیمنٹ کی بالادستی کی تائید کی۔(۷)

دراصل جب پارلیمنٹ کی بالادستی کے نظریئے کو عمومی اعتبار سے قانون کے سینئر ماہرین کے مابین اتفاق رائے کے بجائے، عدلیہ کی طرف سے اسے تسلیم کرنے پر مبنی کیا جاتا ہے تو بنیادی طور پر دو غلطیاں سرزد ہوتی ہیں: اول یہ کہ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ کی طرف سے بنیادی آئینی اصولوں کو تبدیل کرنے یا اس بارے میں غیر منصفانہ نیا قانون وضع کرنے کے قانونی اختیار کا اب تک کسی عدالت میں جائزہ نہیں لیا گیا، اسی لیے اس حوالے عدالتی آراء اب تک محض ججوں کی ذاتی آراء پر مشتمل ہیں اور پارلیمنٹ کی بالادستی کا نظریہ، قانون میں اس قدر مستحکم نہیں ہے، جتنا کہ بعض وکلا خیال کرتے ہیں۔ دوم یہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر مذکورہ بالا نظریہ قانون میں مستحکم بھی ہو تو یہ "عدالتی قانون سازی" سے مشروط ہوگا۔ خصوص اس لیے کہ"عوامی قانون کا اصول" عدالتی فیصلوں سے مستحکم ہو چکا ہے، اسی لیے موجودہ دور کے سینئر جج اس بات کا اختیار رکھتے ہیں کہ وہ اسے چاہیں تو منظور کر لیں اور چاہیں تو رد کر دیں۔(۸)

تاہم--- یہ دونوں باتیں اسی صورت میں غلط ہوں گی، جب عدالتی بالادستی کو"ایک بنیادی اصول تصور" کرلیا جائے--- جس کی موجودگی حکومت کے تینوں شعبوں کے دفتری اہلکاروں کے مابین باہمی اتفاق کی مرہون منت ہو۔ جہاں تک پہلی دلیل کا تعلق ہے تو اس قسم کا اتفاق رائے صدیوں سے موجود ہے اور موجود رہ سکتا ہے، جو کسی عدالتی فیصلے کی صورت میں بھی موجود نہیں ہے، جہاں دوسری دلیل کا تعلق ہے تو اس نوعیت کا قاعدہ اسی صورت میں تبدیل ہو سکتا ہے، جب اتفاق رائے سے آئینی طور پر تبدیل کر دیا جائے اور ایسی تبدیلی محض عدلیہ کے اختیار سے ماوراء ہے۔ وہ اس نوعیت کی تبدیلی کی ابتدا تو کر سکتی ہے مگر اسے مکمل نہیں کر سکتی اور اگر وہ ایسا کرے گی تو وہ اسے تباہ کر دیں گے۔(۹)

اس تمام بحث کا خلاصہ درج ذیل ہے:

برطانیہ اور اس کے حلیف ممالک میں صدیوں سے یہ نظریہ قائم رہا کہ پارلیمنٹ سب سے بالاتر اور بالادست ادارہ ہے، وہ جس طرح کا چاہے قانون بنا سکتی ہے، یا کسی بھی قانون کو منسوخ کرنے کا حق رکھتی ہے۔

تاہم انیسویں۔ بیسویں صدی میں اس کے خلاف کئی آوازیں اٹھیں، خصوص سر روبن کک نے جو نیوزی لینڈ کی کورٹ آف اپیل کے سربراہ تھے، اس کے خلاف آواز اٹھائی اور کہا بنیادی انسانی حقوق کے متعلق پارلیمنٹ بالادست نہیں ہے، جس کے بعد برطانیہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے کئی ججوں اور ماہرین قانون بھی نے اس کی حمایت کر دی۔

اس کے خلاف برطانیہ کے کئی ماہرین قانون نے اظہار خیال کیا ہے مگر عملا اکثر مغربی ممالک میں جمہوریت اور حقوق

---

7) did

8) See, sir Gefery, pp.6 (Introduction)

9) did, pp.6-7

انسانی کے متعلق پارلیمنٹ کو سب سے بالاتر نہیں سمجھا جا رہا ہے۔

گویا ہر ملک کچھ احکام یا مسائل ایسے ہیں۔ جن میں پارلیمنٹ کو سب سے بالاتر ادارہ نہیں سمجھا جاتا اور ان احکام یا مسائل میں بنائے ہوئے قوانین کو عدالتیں رد کرنے کا حق رکھتی ہیں، جیسے کہ ''جمہوریت اور بنیادی انسانی حقوق سے متصادم قانون سازی کو مغربی ممالک، خصوصاً برطانیہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ میں عدلیہ کے ذریعے کالعدم قرار دے دیا جاتا ہے۔

موضوع زیر تحقیق کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ ہی کو اجتہاد کا حق حاصل ہے کیونکہ وہی ایک ادارہ ہے، جس کے پیچھے عوام کی آواز اور رائے ہوتی ہے۔ کسی اور ادارے کو منطقی طور پر اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ اگر کسی اور ادارے کو اجتہاد کا حق دیا جاتا ہے تو گویا پارلیمنٹ پر اس ادارے کو بالادستی حاصل ہو جائے گی۔ گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی بحث کا خلاصہ یوں سامنے آتا ہے کہ جدید مغربی ریاست میں بھی پارلیمنٹ کی بات کو حرف آخر ماننے کا تصور چیلنج ہو چکا ہے۔

پھر کیا پاکستان جیسے اسلامی ملک میں جہاں ''قرآن وسنہ'' کی بالادستی کا خود آئین میں تصور قائم رکھا گیا ہے۔ پارلیمنٹ کو سب سے بالاتر ادارہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ اسی سوال پر آئندہ صفحات میں بحث ہو گی۔

فصل دوم:

پاکستانی پارلیمنٹ کے اختیارات

ریاست میں، پارلیمنٹ کا ادارہ بڑی اہمیت رکھتا ہے......اور ملک کو ایک اچھی حکومت دینا اور ملک کو چلانے کے لیے اچھی پالیسیاں وضع کرنا اور قانون سازی کرنا، اسی کے اختیارات اور فرائض میں شامل ہے۔ پاکستان کے موجودہ آئین اور ۱۹۵۶ء کے آئین دونوں ہی میں قانون سازی اور مالیاتی بلوں کی منظوری وغیرہ کے تمام اختیارات پارلیمنٹ (خصوصاً قومی اسمبلی) کو دیئے گئے ہیں۔ یہ اختیارات غیر محدود اور غیر مشروط ہیں...... آئین پاکستان کی رو سے پاکستان کی پارلیمنٹ کوئی بھی قانون بنا سکتی ہے اور کسی طرح کا قانون بھی منظور کر سکتی ہے۔

......دستور پاکستان کی روشنی میں اس کے اختیارات وفرائض کی تفصیل درج ذیل ہیں:

آئین پاکستان مجریہ ۱۹۷۳ء میں قانون سازی کے معاملات دو حصوں میں منقسم ہیں:

ایک کا عنوان وفاقی قانون سازی کی فہرست (Federal Legislative List)

اور دوسری کا نام مشترکہ امور کی فہرست (Concurrent Legislative List) ہے۔

دستور کے مطابق پارلیمنٹ کو مرکزی قانون سازی کی فہرست پر قانون سازی کا مکمل اختیار حاصل ہے جہاں تک ''مشترکہ امور'' کی فہرست (Concurrent Legislative list) کا تعلق ہے، تو ان امور کے متعلق اور صوبائی اسمبلی دونوں کو قانون سازی کا اختیار حاصل ہے، البتہ اگر مرکزی یا صوبائی قانون میں تضاد ہو تو مرکزی اسمبلی کا قانون صوبائی اسمبلی کے بنائے ہوئے قانون پر حاوی ہوگا اور صوبائی اسمبلی کا بنایا ہوا قانون تضاد کی حد تک کالعدم تصور ہوگا۔(۱)

بعض امور ایسے بھی ہوں گے جو کسی بھی فہرست میں شامل نہیں۔ ایسے امور پر قانون سازی کا اختیار صوبائی اسمبلی کو حاصل ہے، البتہ وہ علاقے جو مرکز کے تحت ہیں اور کسی صوبے کا حصہ نہیں، ان کے متعلق قوانین پارلیمنٹ بنائے گی۔(۲)

(الف) قانون سازی:

مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کا اصل کردار بطور مقننہ (قانون سازی) ادارے کے ہے۔ آئین پاکستان میں مجلس شوریٰ کی تشکیل کے مقاصد یہی بیان کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر آئین پاکستان کی دفعہ ۵۰ میں ہے۔

''پاکستان کی ایک مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) ہوگی، جو صدر اور دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی، جو بالترتیب قومی اسمبلی اور سینٹ کے نام سے موسوم ہوں گے۔(۳)

قانون سازی کے عمل میں یہ دفعہ بہت اہمیت رکھتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی وفاقی طرز حکومت ہے، وہاں دو ایوانی پارلیمنٹ متعارف کروائی گئی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کی ''پارلیمنٹ کے متعلق اس نے آئین میں یہ

---

۱) آئین پاکستان، ص ۱۸۴ تا ۱۸۵۔ دفعہ ۱۴۱ تا ۱۴۳

۲) ڈاکٹر صفدر محمود آئین پاکستان، ص ۱۱۱، ۱۱۲

۳) آئین پاکستان، ص ۸۵، دفعہ ۵

صراحت کی گئی ہے:

All legislative power herein granted shall be vested in a congress of the united state which shall consist of a senate and a house of representative.(4)

اسی طرح برطانیہ میں دارالامراء اوردارالعوام کے نام سے دوایوانی پارلیمنٹ کام کررہی ہے، جبکہ بھارت میں بھی لوک سبھا اورراجیہ سبھا کے نام سے دوایوانی پارلیمنٹ موجود ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایوان زیریں میں آبادی کی بنیاد پراور ایوان میں بالا میں ریاستوں کی برابری کی سطح پر نمائندگی دی جاتی ہے۔ تاکہ قانون سازی میں کسی علاقے اور خطے کی حق تلفی نہ ہو۔ دراصل دوایوانی پارلیمنٹ کا چھوٹے صوبوں کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ قانون سازی کے عمل میں ان کے صوبائی حقوق کونظرانداز نہ کیا جاسکے۔

ماہرین قانون نے دوایوانی پارلیمنٹ کے کئی فائدے گنوائے ہیں، جن میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ عام طور پر ایک ایوانی پارلیمنٹ کسی خاص شخص یا فرد سے متاثر ہوسکتی ہے، جبکہ دورکنی پارلیمان میں اس کا امکان نسبتاً کم ہوتا ہے۔ جب کسی ایوان کو یہ احساس ہو کہ کوئی دوسرا ایوان بھی ایسا موجود ہے جو اس کی غلطیوں کی نشاندہی کرسکتا ہے تو اسے اپنی ذمہ داری کا بہتر طور پر احساس ہوتا ہے۔اسی بناء پر وفاقی طرز حکومت رکھنے والے ملکوں میں دوایوانی پارلیمنٹ کو ترجیح دی جاتی ہے۔(۵)

ماہرین کے مطابق پارلیمنٹ کا اصل کردار بطور مقننہ کے ہے۔اسی لیے ہر ملک کے آئین میں پارلیمنٹ کو بالا تر(sovereign) بناکر پیش کیا جاتا ہے۔تاکہ اس کے بنائے ہوئے قانون پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جاسکے۔

دراصل قومی اسمبلی کے ذریعے ہونے والی قانون سازی کو ملکی سطح پر اتفاق رائے یا قریب قریب اتفاق رائے کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے اسی لیے قانون سازی کے لیے ایک مکمل طریقہ کار وضع کیا گیا ہے۔اوراسی طریقہ کار کے مطابق کوئی بھی قانون پیش ہوتا اور پاس کیا جاتا ہے۔ آئین پاکستان مجریہ 1973ء میں اسی لیے قانون سازی کے ضمن میں پارلیمنٹ کو فری ہینڈ دیا گیا ہے، جس کا مقصد قانون سازی کو باوقار اور مؤثر بنانا ہے۔

پھر جیسا کہ اوپر گزرا قانون سازی کے لیے پروسیجر(طریقہ کار) کو وضع کرنے اوراس میں تبدیلی لانے کا مکمل اختیار بھی پارلیمنٹ کو حاصل ہے، چنانچہ آئین کے آرٹیکل نمبر ۶۷ میں ہے:

subject to the constitution a house may make rules for regulating its procedure and conduct of business and shall have power to act not with standing any vacancy in the membership there of and any proceeding in the house shall not be invalid on the ground that some persons who were not entitled to do, so sat, voted are otherwise took part in the proceeding.(6)

---

4) The Constituation of USA, Article-I,ST

5) دیکھیے شریف الدین پیرزادہ، Fundamental Laws of Pakistan، مطبوعہ لاہور، ص۹۲۔

6) The Constitution of Pakistan, Artical 701, pp.52.

دستور کے تابع کوئی ایوان اپنے ضابطہ کار اور اپنی کارروائی کے انصرام کو منضبط بنانے کے لیے قواعد بنا سکے گا۔ اور اس امر کے باوجود کام کرنے کا اختیار ہوگا کہ اس کی رکنیت میں کوئی جگہ خالی ہو اور ایوان کی کارروائی اس بنا پر نا جائز نہیں ہوگی کہ کچھ اشخاص جو ایسا کرنے کا حق نہیں رکھتے تھے کارروائی کے دوران بیٹھے ووٹ دیے یا کسی اور صورت میں حصہ لیتے رہے۔

پھر جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس ضمن میں قانون سازی کے لیے دو فہرستیں تیار کی گئی ہیں جن میں وفاقی فہرست اور مشترکہ فہرست 1985ء تک آئین میں تھا کہ وفاقی قانون سازی کی فہرست کے حصہ اول میں کسی معاملے سے متعلق بل کی ابتداء قومی اسمبلی سے ہوگی اور قومی اسمبلی کی منظوری کے بعد اسے سینٹ میں بھیجا جائے گا۔ لیکن صدر جنرل ضیاء الحق نے جو ترامیم 1985ء میں آئین میں شامل کی ان کے مطابق وفاقی قانون سازی کی فہرست یا مشترکہ قانون سازی کی فہرست میں کسی مسئلہ کے بارے میں کسی بل کی ابتداء کسی بھی ایوان میں ہو سکے گی۔ اور جس ایوان میں اسے بھیجا گیا ہو اگر وہ اسے منظور کر لے تو پھر اس بل کو دوسرے ایوان میں منظوری کے لیے بھیجا جا سکے گا۔ اگر وہ وہاں بغیر ترمیم کے منظور کر لیا گیا تو صدر مملکت کو منظوری کے لیے بھیج دیا جائے گا۔ (۷)

قانون سازی کے عمل میں دونوں ایوانوں کی شرکت کے ساتھ ساتھ صدر مملکت کو بھی شریک کیا گیا ہے۔ چنانچہ آئین کی دفعہ 70(۳) میں ہے "اگر کسی بل کو دونوں ایوان منظور کر لیں تو اس کی منظوری کے لیے صدر کو پیش کر دیا جائیگا۔ (۸)

مختصر یہ کہ پاکستان کے آئین مجریہ 1973ء میں پاکستان کی پارلیمنٹ کو بہت عمدہ طریقے پر واضح کیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ کا اصل مقصد قانون سازی ہے اور قانون سازی کے لیے اسے مکمل طور پر آزادی دی گئی ہے۔

(ب) وفاقی اور صوبائی قوانین کے موضوعات:

دفعہ (۱۴۲) آئین کے تابع:

(ا) پارلیمنٹ کو وفاقی قانون سازی کی فہرست میں شامل کسی امر کے بارے میں قوانین بنانے کا بلا شرکت غیرے اختیار ہوگا۔

(ب) پارلیمنٹ اور کسی صوبائی اسمبلی کو بھی مشترکہ قانون سازی کی فہرست میں شامل کسی امر کے بارے میں قوانین بنانے کا اختیار ہوگا۔

(ج) کسی ایسے امر کے بارے میں جو وفاقی قانون سازی کی فہرست یا مشترکہ قانون سازی کی فہرست میں شامل نہیں ہے قوانین بنانے کا اختیار صوبائی اسمبلی کو ہوگا اور پارلیمنٹ کو نہیں ہوگا۔

(د) ان امور کے بارے میں جو دونوں میں کسی فہرست میں شامل نہیں ہیں، پارلیمنٹ کو وفاق کے ایسے علاقوں کے لیے قوانین بنانے کا بلا شرکت غیرے اختیار ہوگا جو کسی صوبے میں شامل نہیں ہیں۔ (۹)

۲۔ مالیاتی اختیارات:

پارلیمنٹ کو قانون سازی کے علاوہ بے پناہ مالیاتی اختیارات بھی حاصل ہیں۔

---

7) 6) The Constitution of Pakistan, Artical 701, pp.52.

8) Did

۹) ایضاً آئین پاکستان، دفعہ ۱۴۲، مع ذیلی دفعات

پارلیمنٹ ہی ملک کی مالیات کو کنٹرول کرتی ہے، اس لیے کہ مملکت اپنے اخراجات پورا کرنے کے لیے عوام سے مختلف اقسام کے ٹیکس وصول کرتی ہے، لہٰذا اس پر عوام ہی کے نمائندوں کو ان کو خرچ کرنے یا خرچ کی منظوری دینے کا اختیار حاصل ہوتا ہے، اسی لیے پارلیمنٹ کی مرضی کے بغیر حکومت نہ ہی کوئی ٹیکس لگا سکتی ہے اور نہ ہی اسے خرچ کر سکتی ہے۔

برطانیہ سمیت، دو ایوان رکھنے والے جمہوری ممالک میں ایوان زیریں کو (جسے برطانیہ میں دارالعوام کہتے ہیں اور باقی ممالک میں قومی اسمبلی) کو مالیات کو کنٹرول کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔(۱۰) ہمارے ملک میں جمہوری طرز رکھنے والے دوسرے ملکوں ہی کی طرح مالیات کی منظوری دینے کے تمام اختیارات قومی اسمبلی کو حاصل ہیں......اس سلسلے میں درج ذیل آئینی دفعات بڑی اہمیت رکھتی ہیں:

مالی بلوں کی بابت طریق کار:

(۱) بلالحاظ اس کے کہ دفعہ (۷۰) یا دفعہ (۷۱) میں کچھ مذکور ہو کسی مالی بل کی ابتدا قومی اسمبلی میں ہوگی اور اسے اسمبلی کی منظوری کے بعد سینٹ کو بھیجے بغیر منظوری کے لیے صدر کو پیش کر دیا جائے گا۔

(۲) اس بابت کی اغراض کے لیے کسی بل یا ترمیم کو مالی بل تصور کیا جائے گا اگر اس میں شامل تصریحات کا تعلق مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک یا تمام معاملات سے ہو یعنی:

(الف) کسی محصول کا عائد کرنا، منسوخ کرنا، تخفیف کرنا، کمی بیشی کرنا یا منضبط کرنا۔

(ب) وفاقی حکومت کی جانب سے رقم بطور قرض لینا یا کوئی ضمانت دینا یا اس حکومت کی مالی ذمہ داریوں کی بابت قانون میں ترمیم کرنا۔

(ج) وفاقی مجموعی فنڈ کی تحویل، اس میں رقوم کی ادائیگی یا اس میں سے رقوم کا اجراء۔

(د) وفاقی مجموعی فنڈ پر کوئی وجوب عاید کرنا یا کسی ایسے وجوب کو منسوخ کرنا یا اس میں کوئی تبدیل کرنا۔

(ہ) وفاق کے سرکاری حساب میں رقوم وصول کرنا، ایسی رقوم کی تحویل یا ان کا اجراء۔

(و) وفاقی حکومت یا کسی صوبائی حکومت کے حسابات کا محاسبہ اور

(ز) سابقہ پیراگرافوں میں مذکور امور میں سے کسی سے متعلق کوئی ضمنی (۱۱)

(۳) کوئی بل محض اس وجہ سے مالی متصور نہیں ہوگا کہ اس میں حسب ذیل امور کے بارے میں احکام وضع کیے گیے ہیں:۔

(الف) کوئی جرمانہ یا دیگر مالی تعزیر کے عاید کرنے یا اس میں تبدیل کرنے سے متعلق یا کسی لائسنس فیس یا کسی انجام دی گئی خدمت کی فیس یا خرچ کے مطالبہ یا ادائیگی سے متعلق، یا

(ب) مقامی مقاصد کے لیے کسی مقامی ہیئت مجاز یا ادارے کی جانب سے کوئی محصول عاید کرنے، منسوخ کرنے، تخفیف کرنے، کمی بیشی کرنے یا منضبط کرنے سے متعلق۔

---

10) The Oxford English Dictionary, New Oxford Press, New Yark 1996,p. 1058

۱۱) آئین پاکستان، ص ۳۲، مالی بلوں کی منظوری

(۴) اگر یہ سوال پیدا ہو کہ آیا کوئی بل مالی بل ہے یا نہیں تو اس پر قومی اسمبلی کے اسپیکر کی تحریر کردہ ایک سند ہوگی کہ یہ مالی بل ہے اور ایسی سند تمام اغراض کے لیے حتمی ہوگی اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جائے گا (۱۲)۔

سالانہ میزانوی کیفیت نامہ کی بابت طریق کار:

(۱) سالانہ میزانوی کیفیت نامہ (بجٹ) کے اس حصہ پر جو وفاقی مجموعی فنڈ سے واجب الادا خرچ سے تعلق رکھتا، ہو قومی اسمبلی میں بحث ہو سکتی ہے، لیکن اسے قومی اسمبلی کی رائے شماری کے لیے پیش نہیں کیا جائے گا۔

(۲) سالانہ میزانوی کیفیت نامہ (بجٹ) کا وہ حصہ جو دیگر خرچ سے تعلق رکھتا ہو، مطالبات زر کی شکل میں قومی اسمبلی میں پیش کیا جائے اور اسمبلی کو کسی مطالبے کو منظور کرنے یا منظور کرنے سے انکار کرنے یا کسی مطالبے کو اس میں صراحت کردہ رقم کی تخفیف کے ساتھ منظور کرنے کا اختیار ہوگا۔

مگر شرط یہ ہے کہ یوم آغاز سے دس سال کے عرصے تک، یا قومی اسمبلی کے دوسرے عام انتخاب کے انعقاد تک جو بھی بعد میں واقع ہو، کسی سیاسی جماعت کے امیدوار یا نامزد کردہ شخص کی حیثیت سے قومی اسمبلی کے نتیجہ کسی رکن کا ووٹ ہو جو کسی مطالبہ زر کو مسترد کرنے، یا کسی مطالبہ زر میں صراحت کردہ رقوم کو کسی تخفیف کے تابع، منظور کرنے کے حق میں دیا گیا ہو، نظر انداز کر دیا جائے گا، اگر قومی اسمبلی میں اس سیاسی جماعت کے اراکین کی اکثریت نے اس مطالبہ زر میں مصرحہ رقم میں کسی تخفیف کے بغیر، اس کی تائید میں اپنے ووٹ دیئے ہوں۔

(۳) وفاقی حکومت کی سفارش کے بغیر کوئی مطالبہ زر پیش نہیں کیا جائے گا۔

۴۔ منظور شدہ خرچ کی جدول کی توثیق:

(۱) وزیر اعظم اپنے دستخطوں سے ایک جدول کی توثیق کرے گا جس میں حسب ذیل کی تصریح ہوگی۔

(الف) ان رقوم کی جو قومی اسمبلی نے دفعہ ۸۲ کے تحت منظور کی ہوں یا منظور کی گئی متصور ہوں اور

(ب) ان مختلف رقوم کی جو وفاقی مجموعی فنڈ سے واجب الادا خرچ کو پورا کرنے کے لیے مطلوب ہوں، لیکن وہ کسی رقم کی صورت میں بھی اس رقم سے متجاوز نہ ہوگی جو قومی اسمبلی میں اس سے قبل پیش کردہ کیفیت نامہ، میں دکھائی گئی ہو۔

(۲) ایسی موثقہ جدول کو قومی اسمبلی میں پیش کیا جائے گا، لیکن اس پر بحث یا رائے شماری نہ ہو سکے گی۔

(۳) آئین کے تابع، وفاقی مجموعی فنڈ سے کوئی خرچ باضابطہ منظور شدہ متصور نہ ہوگا۔ بجز اس کے کہ اس طرح موثقہ جدول میں اس کی تصریح کر دی گئی ہو اور اس جدول کو شق (۲) کی شرط کے مطابق قومی اسمبلی کے سامنے پیش کر دیا گیا ہو (۱۳)۔

ضمنی اور زائد رقوم:

اگر کسی مالی سال کی بابت یہ معلوم ہو کہ:

(الف) مجاز کردہ رقم جو رواں مالی سال کے دوران کسی خاص خدمت پر صرف کی جاتی تھی، ناکافی ہے یا کسی ایسی نئی

---

(۱۲) ایضاً،

(۱۳) آئین پاکستان، ص ۳۶۔۳۷

خدمت پر خرچ کی ضرورت پیدا ہوگئی ہے جو اس سال کے سالانہ میزانیہ کیفیت نامہ میں شامل نہیں ہے، یا

(ب) کسی مالی سال کے دوران کسی خدمت پر اس رقم سے زائد رقم صرف کردی گئی ہے جو اس سال کے واسطے اس خدمت کے لیے منظور کی گئی تھی۔

تو وفاقی حکومت کو اختیار ہوگا کہ وفاقی مجموعی فنڈ سے خرچ کی منظوری دے خواہ وہ خرچ آئین کی رو سے مذکورہ فنڈ سے واجب الادا ہو یا نہ ہو اور قومی اسمبلی کے سامنے ایک ضمنی میزانوی کیفیت نامہ یا جیسی بھی ضرورت ہو زائد میزانوی کیفیت نامہ پیش کرائے جس میں مذکورہ خرچ کی رقم درج ہو اور ان کیفیت ناموں پر دفعات ۸۰ تا ۸۳ کے احکام کا اطلاق اسی طرح ہوگا، جیسے ان کا اطلاق سالانہ میزانوی کیفیت نامہ پر ہوتا ہے۔(۱۴)

آئین کی دفعہ ۷۵ کی رو سے قومی اسمبلی کی منظوری کے بعد یہ بل صدر مملکت کے پاس بھیجا جاتا ہے، جو سات یوم کے اندر اندر اس بل پر دستخط کرنے کے پابند ہیں۔ اگر وہ سات یوم کے اندر اندر اس بل پر دستخط نہ کریں تو مذکورہ میعاد گزرنے کے بعد یہ تصور کیا جائے گا کہ اس نے یہ منظوری دے دی ہے۔

جب صدر کسی بل کی منظوری دے دے یا یہ تصور کیا جائے کہ اس نے یہ منظوری دے دی ہے تو وہ قانون بن جائے گا اور یہ پارلیمنٹ کا ایک ایکٹ کہلائے گا۔ جب کہ دفعہ ۷۷ میں یہ صراحت ہے کہ بجز پارلیمنٹ کے کسی ایکٹ کے ذریعے یا اس کے اختیار کے تحت وفاق کے لیے کوئی ٹیکس نہیں لگایا جائے گا(۱۵)۔

۵۔ سالانہ بجٹ رپورٹ اور اس کی منظوری:

پارلیمنٹ کے اہم ترین اختیارات اور اس کے فرائض میں ایک اہم فریضہ یا اختیار سالانہ بجٹ کی منظوری بھی ہے ......اکثر جمہوری ممالک میں ان ملکوں کے سالانہ بجٹ کی منظوری پارلیمنٹ کا ایوان زیریں ہی دیتا ہے۔ پاکستان میں بھی یہی صورت حال ہے......آئین پاکستان میں ہے۔

سالانہ میزانوی کیفیت نامہ:

(۱) وفاقی حکومت ہر مالی سال کی بابت، وفاقی حکومت کی اس سال کی تخمینی آمدنی اور خرچ کا کیفیت نامہ قومی اسمبلی کے سامنے پیش کرائے گی، جس کا اس حصے میں سالانہ میزانوی کیفیت نامے کے طور پر حوالہ دیا گیا ہے۔

(۲) سالانہ میزانوی کیفیت نامہ علیحدہ علیحدہ ظاہر کرے گا۔

(الف) وہ رقوم جن کی ایسے خرچ کو پورا کرنے کے لیے ضرورت ہو جنہیں آئین میں وفاقی مجموعی فنڈ پر واجب الادا بیان کیا گیا ہے اور

(ب) وہ رقوم جو ایسے دیگر خرچ کو پورا پورا کرنے کے لیے ہوں، جن کی وفاقی مجموعی فنڈ سے ادائیگی کی تجویز ہو، اور محاصل کے حساب میں ہونے والے خرچ اور دیگر خرچ کو علیحدہ علیحدہ بتائے گا(۱۶)۔

پھر جب قومی اسمبلی میں بجٹ یا کوئی مالیاتی بل پیش کیا جاتا ہے تو آئین کی دفعہ ۸۵ کے تحت، بلالحاظ اس امر کے کہ مذکورہ

---

۱۴) آئین پاکستان، ص ۳۳۔ آرٹیکل ۷۵

۱۵) ایضاً

۱۶) آئین پاکستان، ص ۳۵

بالا احکام میں مالی امور سے متعلق کچھ مذکور ہو، قومی اسمبلی کو اختیار ہوگا کہ وہ تخمینی خرچ کی بابت یا کسی رقم کی منظور شدہ خرچ کی جدول کی توثیق ہونے تک کسی مالی سال کے کسی حصے کے لیے جو چار ماہ سے زائد نہ ہو، مذکورہ منظوری پیشگی دے دے۔(۱۷)

الغرض پارلیمنٹ کو مملکت میں قانون سازی، انتظامی اور مالی امور کو کنٹرول کرنے کے لیے وسیع اختیارات حاصل ہیں جس کے تحت وہ ملک کے تمام اہم اداروں کو کنٹرول کرتی ہے۔اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ا- انتظامیہ:

ریاست میں انتظامیہ کا سربراہ وزیر اعظم ہوتا ہے اور پارلیمانی طرز حکومت میں وہی تمام اختیارات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ وہ انتظامیہ کا سربراہ اور قوم کا قائد ہوتا ہے۔وہ پارلیمنٹ میں اکثریتی جماعت یا اکثریت رکھنے والی جماعتوں کا پارلیمانی لیڈر ہوتا ہے۔قوم کی رہنمائی کی ذمہ داری بھی اسی پر ہوتی ہے۔اسی کے اردگرد ملک کی ساری مشینری گھومتی ہے۔(۱۸)

پارلیمانی نظام حکومت میں سب سے قدیم روایت برطانوی نظام حکومت کی ہے۔ وہیں پارلیمانی نظام حکومت نے سب سے پہلے جنم لیا اور پروان چڑھا۔ وہاں ملکہ برطانیہ کی حیثیت محض نمائشی سربراہ کی ہے اور صحیح معنوں میں اختیارات کا سرچشمہ وزیر اعظم کی وزارت ہے(۱۹)۔

دنیا کے دوسرے جمہوری ممالک کی طرح پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے آئین میں بھی وزیر اعظم کے پاس زیادہ اختیارات تھے تاہم جنرل ضیاء الحق اور پاکستان کے سابقہ صدر (جنرل پرویز مشرف) کے زمانے میں ہونے والی آئینی ترمیمات کی بنا پر صدر کے پاس زیادہ اختیارات چلے گئے ہیں۔جس سے اختیارات کا توازن صدر کے حق میں ہوگیا اور اس وقت اس پہلو سے پاکستان کا آئین نہ تو پارلیمانی رہا ہے اور نہ ہی صدارتی رہا ہے۔

وزیر اعظم کے تقرر اور اس کے معزول کرنے کا اختیار قومی اسمبلی کے پاس ہے۔اسی طرح وزیر اعظم کی کابینہ تمام افراد یا قومی اسمبلی کے رکن ہوتے ہیں، یا سینٹ کے، ۱۹۷۳ء کے آئین میں ہے:

۹۱ (ا) قومی اسمبلی کے کسی عام انتخاب کے انعقاد کے بعد تیسویں دن اجلاس کرے گی بجز یہ کہ صدر نے اس کا اجلاس اس سے قبل نہ طلب کر لیا ہو۔

۹۱ (۲) اسپیکر اور ڈپٹی سپیکر کے انتخابات کے بعد قومی اسمبلی اپنے مسلمان اراکین میں سے ایک کو بلا مباحثہ وزیر اعظم منتخب کرنے کی کاروائی کرے گی۔(۲۰)

مگر ۱۹۷۳ء کے آئین میں ہونے والی موجودہ سترہویں ترمیم کی بنا پر اب صدر مملکت کسی شخص کو وزیر اعظم نامزد کرتا ہے، جو ان کی رائے میں قومی اسمبلی کی اکثریت کی حمایت رکھتا ہو اور نامزد شدہ وزیر اعظم کو حلف اٹھانا پڑتا ہے اور ۶۰ دن کے اندر قومی اسمبلی سے اعتماد کے ووٹ لینا ہوتا ہے۔(۲۱)

---

۱۷) ایضاً، ص ۳۷

۱۸) ایضاً، ص ۳۷

۱۹) ڈاکٹر صفدر محمود، ص ۸۶

۲۰) اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین منظور کردہ قومی اسمبلی ۱۹۷۳ء اور جاری کردہ قومی اسمبلی پاکستان، ۳۹۔دفعات ۹۰۔۹۱

۲۱) قومی اسمبلی۔آئین پاکستان، ص ۳۹

آئین کے آرٹیکل ۲۴۸ کے مطابق وزیراعظم اپنے اختیارات اور فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں کسی عدالت کے سامنے جوابدہ نہیں۔ آئین کی دفعہ ۹۰ (۳) کے تحت وزیراعظم اور وزراء اجتماعی طور پر قومی اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔(۲۲)

۲- صدر (President)

پارلیمانی نظام حکومت میں صدر ریاست کا آئینی سربراہ تصور ہوتا ہے۔ عام طور پر صدر کا عہدہ نمائشی اور بے اختیار ہوتا ہے۔ پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے آئین میں بھی اس کا عہدہ محض نمائشی نوعیت کا تھا، لیکن صدر جنرل محمد ضیاء الحق اور پھر جنرل پرویز مشرف کے ادوار میں ہونے والی ترمیمات کے بعد اختیارات کا پلڑا صدر کے حق میں بھاری ہو گیا ہے، ملک کے اس ریاستی سربراہ کے انتخابات اور اس کے مؤاخذہ کا اختیار مرکزی اور صوبائی اسمبلی کے پاس ہے۔(۲۳)

۴۱ (۳) صدر کا انتخاب پارلیمنٹ کے اراکین مشترکہ اجلاس میں جدول دوم کے احکام کے مطابق کریں گے۔

۴۱ (۴) صدر کا انتخاب عہدے پر فائز صدر کی میعاد ختم ہونے سے زیادہ سے زیادہ ساٹھ دن اور کم سے کم تیس دن قبل کرلیا جائے گا۔

۴۴ (۳) صدر قومی اسمبلی کے اسپیکر کے نام اپنی دستخطی تحریر کے ذریعے اپنے عہدے سے مستعفی ہو سکتا ہے۔

۴۷ (۱) صدر کی برطرفی بلالحاظ اس امر کے کہ آئین میں کچھ مذکور ہو، صدر کو اس دفعہ کے احکام کے مطابق جسمانی یا دماغی نااہلیت کی بنا پر آئین کی خلاف ورزی یا غلط روی کے کسی الزام میں اس کے عہدے سے برطرف کیا جا سکتا ہے۔(۲۴)

(۲) کسی ایوان کی رکنیت کے کم از کم آدھے اراکین قومی اسمبلی کے اسپیکر یا جیسی بھی صورت ہو، چیئرمین کو صدر کی برطرفی کے لیے قرارداد کی تحریک کرنے کے ارادہ سے تحریری نوٹس دے سکتے ہیں اور ایسے نوٹس میں اس کی نااہلیت کے کوائف یا اس کے خلاف الزام کی وضاحت ہوگی۔

(۵) اسپیکر نوٹس وصول ہونے کے بعد دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس طلب کرے گا، جو نوٹس وصول ہونے کے بعد سات یوم سے پہلے اور چودہ دن کے بعد منعقد نہ ہوگا۔

(۶) مشترکہ اجلاس اس بنیاد یا الزام کی جس پر نوٹس مبنی ہے، تفتیش کرے گا یا کروائے گا۔

(۷) صدر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ تفتیش کے دوران اگر کوئی ہو اور مشترکہ اجلاس کے سامنے حاضر ہو، اور اس کی نمائندگی کرے۔

(۸) اگر تفتیش کے نتیجہ کے غور خوض کے بعد اگر کوئی مشترکہ اجلاس پارلیمنٹ کی رکنیت کے کم از کم دو تہائی ووٹوں سے اس مضمون کی قرارداد منظور کرے کہ صدر نااہلیت کی وجہ سے عہدہ سنبھالنے کا اہل نہیں یا آئین کی خلاف ورزی یا فاسق غلط روی کا مجرم ہے تو صدر قرارداد پاس ہونے پر فوراً عہدہ چھوڑے گا۔(۲۵)

---

(۲۲) ایضاً۔ دفعہ ۹۰ (۳)

(۲۳) ڈاکٹر صفدر محمود The Constitution of Pakistan، ص ۸۹۔۹۲

(۲۴) قومی اسمبلی۔ آئین پاکستان، ص ۲۰۔۲۱ آرٹیکل ۴۱ تا ۴۷ (۸)۔

(۲۵) ایضاً

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس پہلو سے بھی ہے کہ پارلیمنٹ انتظامیہ سے بالا دست ادارہ ہے۔

۳۔عدلیہ:

پاکستان ایک وفاقی طرز رکھنے والا جمہوری ملک ہے جو چاروں صوبوں پر مشتمل ہے اور ہر جمہوری ملک میں عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ رکھا جاتا ہے۔

اکثر وفاقی ممالک میں عدلیہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، ایک عدلیہ وفاقی قانون کے لیے اور دوسری صوبائی قوانین کے لیے ہوتی ہے، لیکن پاکستان میں تمام ملک کے لیے ایک ہی عدلیہ ہے، جو صوبوں سے شروع ہو کر مرکز تک پھیلی ہوئی ہے۔ جسے سپریم کورٹ کنٹرول کرتی ہے۔

آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۷۵ کے مطابق سارے ملک کے لیے ایک ہی سپریم کورٹ اور تمام صوبوں کے لیے الگ الگ ہائی کورٹ ہوں گی۔

سپریم کورٹ چیف جسٹس اور کچھ ججوں پر مشتمل ہے، جن کی تعداد کا تعین پارلیمنٹ یا صدر پاکستان کرتا ہے۔ چیف جسٹس کا تقرر صدر مملکت وزیر اعظم کی سفارش پر کرے گا اور دوسرے ججوں کا تقرر صدر مملکت چیف جسٹس کے مشورے سے کرے گا۔

اس طرح بالواسطہ طور پر پارلیمنٹ کو عدلیہ پر بھی فوقیت اور بالادستی حاصل ہے۔

۴۔ کابینہ:

اوپر گزر چکا ہے کہ وزیر اعظم منتخب ہونے کے بعد وفاقی وزراء اور وزرائے مملکت پر مشتمل کابینہ تشکیل کرتا ہے، جس کے ارکان پارلیمنٹ کے ممبر ہوتے ہیں۔ ہر وزیر وزارت کا قلمدان سنبھالنے سے قبل صدر مملکت سے حلف لیتا ہے۔ ان وزراء میں سے ایک چوتھائی سینٹ سے اور تین چوتھائی قومی اسمبلی سے لیے جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر تمام وزراء قومی اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہیں۔

قومی اسمبلی کے ارکان کابینہ کے ارکان کا مختلف قسم کی تحاریک کے ذریعے مواخذہ کر سکتے ہیں اور وہ ایک خاص مدت کے اندر اندران کے......سوالوں کا جواب دینے کے پابند ہوتے ہیں۔

آئین پاکستان مجریہ ۱۹۷۳ء میں ہے:

"۹۲ (۱) وزیر اعظم پارلیمنٹ کے ارکان میں سے وفاقی وزراء اور وزرائے مملکت کا تقرر کرے گا، مگر شرط یہ ہے کہ ان وفاقی وزراء اور وزرائے مملکت کی تعداد جو سینیٹ کے رکن ہوں، کسی بھی وقت وفاقی وزراء کی ایک چوتھائی تعداد سے زیادہ نہ ہوگی۔ عہدہ پر فائز ہونے سے پہلے کوئی وفاقی وزیر یا کوئی وزیر مملکت جدول سوم میں مندرجہ عبارت میں صدر کے سامنے حلف اٹھائے گا۔(۲۶)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ کابینہ کے تمام ارکان بھی پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہیں اور "کابینہ" بنانے یا اس کی جواب طلبی کرنے، یا ان کا مواخذہ کرنے میں بھی پارلیمنٹ کو برتری حاصل ہے۔

پاکستان اور بھارت کو آزادی اور خود مختاری دینے کا فیصلہ۔۔۔۔۔ برطانوی حکومت نے ایک خصوصی ایکٹ کے تحت کیا تھا، جو ۱۴۔۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو نافذ العمل ہوا۔ یہ ایکٹ بنیادی طور پر "سیلون" کی آزادی کے لیے بنایا گیا تھا اور حکومت

---

26) The Oxford English Reference Dictionary, p.111

برطانیہ نے اسے بھارت اور پاکستان پر بھی نافذ کر دیا، جس میں انہیں قانون سازی کا حق محدود طریقے پر دیا گیا تھا۔(۲۷)

اس اعتبار سے بھارت اور پاکستان کی مقننہ شروع میں خود مختار اور بالادست نہیں تھی(۲۸)۔ جبکہ سیلون برطانیہ کی طرح خود مختار ہے، تاہم بعدازاں دونوں ممالک کو مکمل طور پر خود مختاری حاصل ہوگئی۔

اس حوالے سے کسی بھی ''ادارے'' کی خود مختاری جانچنے کے لیے ان دو سوالوں کا جواب ضروری ہے کہ آیا متعلقہ ادارے پر کسی قانون یا ضابطے کے تحت کوئی پابندی لگائی گئی ہے۔ یا نہیں لگائی اور یہ کہ آیا ان کی آزادی میں کسی قانون سازی کے ضمن میں کوئی فوری یا آئندہ کی پابندی شامل ہے یا نہیں؟ اور چونکہ پاکستان اور بھارتی آئین میں پارلیمنٹ میں ہونے والی کارروائی بظاہر عدالتی دخل اندازی سے ماوراء ہے۔ اس لیے دونوں ممالک کی مقننہ بظاہر بالاتر ادارے ہیں۔(۲۹)

تاہم بدقسمتی سے پاکستان میں آزادی کے سات سال بعد تک بھی بالادستی کا مسئلہ اختلاف کا ذریعہ بنا رہا۔۔۔ آزادی کا ایکٹ ۱۹۴۷ء پارلیمنٹ کی بالادستی کے متعلق واضح نہیں ہے۔ جس کے ہمراہ قانون ساز اسمبلی کی تاسیس بھی شامل تھی، جسے اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۱۹۴۷ء کے خصوصی قانون کے تحت قائم کیا تھا۔ شاہی اقتدار اعلیٰ یعنی ''ملکہ پارلیمنٹ میں'' کو زیر عمل لانا بند کر دیا گیا تھا، کیا یہ اقتدار اعلیٰ، گورنر جنرل اور اسمبلی کو مشترکہ طور پر منتقل کیا گیا تھا، یا پھر محض سادہ طریقے پر قانون ساز اسمبلی اس کی وارث بن گئی تھی۔ یہ ادارہ گورنر جنرل نے قائم کیا، اسی لیے بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ وہ اس اسمبلی کو برخاست بھی کر سکتا تھا، لہذا اس طرح کی صورت حال میں ایسی مقننہ کو بالادست نہیں کیا جا سکتا تھا، تاہم یہ بات واضح نہیں تھی کہ آیا تمام مقاصد کے لیے ہونے والی قانون سازی میں گورنر جنرل اس کا حصہ تھا یا نہیں۔۔۔ وزارت قانون کا موقف تھا کہ ایسا ہے(۳۰)۔ جب کہ قانون ساز اسمبلی میں دوسری جماعتوں کے سربراہوں کا خیال تھا کہ عام قانون سازی کی اہلیت میں، پاکستان کی قانون ساز اسمبلی، ایک بالاتر ادارہ ہے، اور اسے گورنر جنرل کی منظوری کی ضرورت نہیں اور یہ کہ وہ اسے معطل بھی نہیں کر سکتا۔ اس تناظر میں پاکستان کی مقننہ نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء تک بنیادی قوانین سازی کی اور اس کے لیے گورنر جنرل کی منظوری بھی حاصل نہیں کی۔ ان میں ایک ایسا ایکٹ بھی شامل تھا، جس نے خود اسمبلی کی حیثیت تبدیل کر دی، نیز ۱۹۵۴ء میں منظور شدہ ایسا قانون بھی شامل تھا، جس نے گورنر جنرل کے اختیارات پر پابندی لگا دی۔

تاہم اکتوبر ۱۹۵۴ء میں قومی اسمبلی کو، جو گذشتہ برسوں سے آئین میں مصروف تھی، اس وقت کے گورنر جنرل (مسٹر غلام محمد) برخاست کر دیا، جس پر مولوی تمیزالدین اسپیکر قومی اسمبلی نے سندھ ہائی کورٹ کا دروازہ جا کھٹکھٹایا اور اس کے ''رٹ'' دائر کر دی۔(۳۱)

عدالت نے گورنر جنرل کے حکم کو کالعدم قرار دے دیا، مگر ''فیڈریشن آف پاکستان سپریم کورٹ میں چلی گئی، جس نے

---

27) GeoffreyMarshall, Parliamentary sovereignty and the commen wealth Oxford, university press,1957,pp127

28) Indian Independient act under 6/6, k.O.C wheare, the Statute of west minister and status (5th ed.1953.p337)

۲۹) دیکھیے بھارتی آئین دفعہ ۱۲۲، مجریہ ۱۹۴۹ء اور پاکستانی آئین مجریہ ۱۹۵۶ء، دفعہ ۵۶، ص ۲۲، ۲۹ اور ان نکات پر بحث: باب سوم

۳۰) دیکھیے مسٹر حسین شہید سہروردی، وزیر قانون کا کراچی میں بیان۔۔۔ ۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء، Jeoffrey، ص ۱۳۳، مگر اس موقف کو تسلیم نہیں کیا گیا۔

۳۱) دیکھیے فیڈریشن آف پاکستان بمقابلہ مولوی تمیزالدین خاں، (LRWP)۳۰۶(۱۹۵۶ء)

سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کو کالعدم کر دیا۔اس کی وجہ یہ بتائی کہ جس ایکٹ کے تحت صوبائی عدالت عالیہ کو یہ اختیارات دیے گئے تھے اس کے لیے گورنر جنرل سے منظوری حاصل نہیں کی گئی تھی۔(۳۲)

اس فیصلے کے مطابق ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک قانون ساز اسمبلی نے جو قوانین بھی گورنر جنرل کی منظوری کے بغیر پاس کیے تھے، وہ سب غیر قانونی قرار پا گئے اور اس طرح اس کی قانون ساز حیثیت پر سوالیہ نشان پڑ گیا۔

گورنر جنرل نے فوری طور پر گذشتہ تاریخ سے قومی اسمبلی کے امیر جنسی کے اختیاراتی ایکٹ کی منظوری دے دی، مگر عدالت نے اسے تسلیم نہیں کیا۔عدالت نے گورنر جنرل کی طرف قومی اسمبلی کی برخاستگی کو جائز قرار دیتے ہوئے سابقہ اختیارات کی حامل نئی اسمبلی تشکیل دینے کا گورنر جنرل کا حق تسلیم کیا اور نیز یہ بھی کہ جب تک نئی اسمبلی سے منظوری حاصل نہیں کر لی جاتی، اس وقت تک گ ورنر جنرل آف پاکستان کو گذشتہ اسمبلی کے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ کرنے کا وقتی طور پر حق حاصل ہے۔(۳۳)

عدالت نے قانون سازی کے لیے گورنر جنرل کے فیصلے کو ضروری قرار دے دیا، نئی اسمبلی نے اکتوبر ۱۹۵۵ء سے کام شروع کیا اور اس نے ۳۹ قوانین کی منظوری دی، جن کے متعلق وفاقی عدالت نے دوبارہ منظوری لینے کو کہا تھا۔نئی اسمبلی نے آئین سازی کی ذمہ داری بھی اٹھائی، جسے ۹ جنوری ۱۹۵۶ء کو اسمبلی میں پیش کیا اور ۲۹ فروری کو اس کی منظوری حاصل کر لی۔یہ آئین ۲ مارچ ۱۹۵۷ء کو نافذ ہوا، اس آئین کے دیباچے (قرارداد مقاصد) میں یہ طے کیا گیا کہ بالادستی، اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے، جسے عوام کے نمائندے اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اختیارات کے تحت استعمال کریں گے جسے اس نے اپنے مقدس کلام میں بیان کیا ہے۔(۳۴)

آئین میں یہ طے کیا گیا:

No Lwa shall be enacted which is repugnant to the injunctions of Islam and laid down in the Holy Quran and Sunnah.(35)

(اسلام کے قرآن وسنت میں دیے گئے احکام کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا)۔

پاکستان کے اس آئین میں، بھارتی قانون کو بنیادی طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے اور کئی شقیں بھارتی آئین کے مطابق ہیں۔اسی طرح آئین میں بنیادی حقوق کی ضمانت دیتے ہوئے، یہ کہا گیا ہے کہ بنیادی حقوق کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔اس اعتبار سے اسے دیکھا جائے تو ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء دونوں آئینوں کے تحت پاکستان کی پارلیمان، بالادست یا برتر ادارے نہیں ہیں۔۔۔۔بلکہ ان میں طے شدہ اصول اور طریقہ کار کے مطابق قرآن وسنت بالاتر ہیں۔۔۔۔لہذا پارلیمنٹ قرآن وسنہ سے متصادم قانون سازی کی مجاز نہیں اور ہر ایسا قانون جو قرآن وسنہ سے متصادم ہو، اسے ''عدالت'' کالعدم قرار دے سکتی ہے، اس وضاحت کی روشنی میں پاکستان میں پارلیمنٹ کی بالادستی کے نظریے کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

---

۳۲) اس حوالے سے مسٹر حسین سہروردی نے ۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء کو یہ بیان دیا کہ ۱۹۵۰ء سے جب سے اسمبلی نے گورنر جنرل کی منظوری کے بغیر آئین میں تبدیلی کی۔اس وقت سے یہ اسمبلی ایک غیر قانونی ادارے کے طور پر کام کر رہی ہے اور یہ کہ برخاستگی شاید اس بنا پر درست تھی۔(ص ۱۳۴)

۳۳) دیکھیے یوسف پٹیل بمقابلہ حکومت پاکستان، PLD (1954)، ص ۵۷۶

۳۴) دیکھیے آئین پاکستان، ۱۹۵۶ء، ص ۱۳۲، پیش لفظ

۳۵) ایضا، دفعہ ۱۹۸

فصل سوم:

۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت پاکستانی پارلیمنٹ کی بالادستی کا مسئلہ

پاکستان کا یہ آئین، برطانیہ اور فرانس کے جمہوری دساتیر کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے اور جیسا کہ سابقہ صفحات میں تفصیل سے یہ دیکھا گیا کہ جدید دنیا کے دساتیر میں پارلیمنٹ کو بالاتر رکھا گیا، اس لیے پاکستان کے دستور میں بھی۔۔۔۔ پارلیمنٹ کو دوسرے اداروں (انتظامیہ اور عدلیہ) پر برتری دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس حوالے سے درج ذیل دفعات میں اس بالادستی کو برقرار رکھنے کا مضمون شامل کیا گیا ہے۔

دفعہ ۶۷: دستور کے تابع کوئی ایوان اپنے ضابطہ کار اور اپنی کارروائی کے انصرام کو منضبط کرنے کے لیے قواعد بنا سکے گا اور اسے اس امر کے باوجود کام کرنے کا اختیار ہوگا کہ اس کی رکنیت میں کوئی جگہ خالی ہو اور ایوان کی کوئی کارروائی اس بنا پر جائز نہیں ہوگی کہ کچھ اشخاص ایسا کرنے کا حق نہیں رکھتے تھے، کارروائی کے دوران بیٹھے ووٹ دیے یا کسی اور صورت میں حصہ لیتے رہے۔(۱)

اس دفعہ کی تشریح کرتے ہوئے معروف قانون دان ایم محمود لکھتے ہیں:

Like the house of commons, the parliament of Pakistan is maker of its own procedural regulations.Articale 67 provides that either of the house i.e. the National Assambly or the Senate has to make its own rules to regulate its procedure and condact of its business.(2)

برطانوی دارالعوام ہی کی طرح پاکستان کی پارلیمنٹ اپنا طریقہ کار خود وضع کر سکتی ہے، دفعہ ۶۷ کے ذریعے یہ واضح کیا گیا ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک قانون ساز ادارہ یعنی قومی اسمبلی اور سینٹ اپنے نظام کو چلانے کے لیے طریقہ کار اور اپنے بزنس کا طریقہ کار بنانے کا اختیار رکھتا ہے۔

جس سے واضح ہوتا ہے کہ پاکستان کی پارلیمنٹ بذات خود بالاتر ادارہ ہے۔

۲۔مجلس کی کارروائی عدالتی دائرہ کار سے ماورا ہوگی:

پارلیمنٹ کی بالادستی کو یقینی اور موثر بنانے کے لیے آئین میں یہ دفعہ بھی شامل کی گئی ہے کہ پارلیمنٹ کسی کارروائی کی عدالت میں زیر بحث نہیں لائی جا سکے گی، الفاظ یہ ہیں:

۶۹: عدالتیں مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کی کارروائی کی تحقیقات نہیں کر سکیں گی۔

(ر) مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کا کوئی افسر یا رکن جسے دستور کی رو سے یا اس کے تحت مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) میں ضابطہ کار یا انصرام کارروائی کو منضبط کرنے یا نظم برقرار رکھنے کے اختیارات دیے گئے ہوں، ان اختیارات کے استعمال کی نسبت کسی

---

۱) آئین پاکستان، مطبوعہ منصور بک ڈپو، لاہور، ص ۱۱۵، دفعہ ۶۷

2) M. Mahmood The Consitutions of Islamic republic of Pakistan 1973 pub. by Pakistan law Times Publication, pp 455

۳) آئین پاکستان مطبوعہ منصور بک ڈپو، ص ۱۱۵، دفعہ ۶۷

عدالتی اختیار سماعت کے تابع نہیں ہوگا۔(۳)

اس دفعہ کی تشریح کرتے ہوئے۔ممتاز قانون دان ایم محمود نے لکھا ہے:

Those princepal print out the independence of the legislature and the Assembliese such plenary powers are comtemplated in various articles of the constitution including article No.127. These powers and the collection privoleges contemplated by the provisions of constitution which are be liberally interpreted leads to the conclusoon that the procedural irregularities of any in the proceeding of the Assembly can not be secrutinized by High Court in excercise of its constitutional jurisdiction.(4)

''یہ اصول اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ مقننہ اور اسمبلیاں آزاد ہیں،ان لامحدود اختیارات کا اظہار مختلف دفعات سے ہوتا ہے۔بشمول دفعہ ۱۲۷،ان اختیارات اور ان خصوصی استحقاق کا اظہار آئین سے ہوتا ہے،جس کی آزادی سے کی جانے والی تشریح کی بنا پر اس نتیجے تک پہنچا جا سکتا ہے کہ اسمبلی کے طریقہ کار سے متعلقہ قواعد کا اگر کوئی ہوں،آئینی حدود کا کار میں رہتے ہوئے۔ہائی کورٹ جائزہ نہیں لے سکتی''۔

جب کہ آئین کی اس سے اگلی دفعہ(۷۰)میں۔۔۔۔پارلیمنٹ کی بالادستی کو اس کے لیے تجویز کردہ طریقہ کار کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

وفاقی قانون سازی کی فہرست یا مشترکہ قانون سازی کی فہرست میں کسی امر کے بارے میں کسی بل کی ابتداء کسی بھی ایوان میں ہو سکے گی۔اور اگر وہ اسے منظور کر لے،جس میں اس کی ابتداء ہوئی تھی،تو اسے دوسرے ایوان میں بھیج دیا جائے گا اور اگر دوسرا ایوان بھی اسے ترمیم کے بغیر منظور کر لے،تو اسے منظوری کے لیے صدر کو پیش کر دیا جائے گا۔

(۲)اگر شق(۱)کے تحت کسی ایوان کو بھیجا ہوا،کوئی بل مسترد ہو جائے،یا اس کی وصولی کے نوے دن کے اندر منظور نہ ہو،یا ترمیم کے ساتھ منظور ہو۔تو اس بل پر اس ایوان کی درخواست پر،جس میں وہ پہلے پیش کیا گیا تھا،غور اور اس کے حل کے لیے آرٹیکل ۷۱ کے تحت تشکیل کردہ مصالحت کمیٹی کے حوالے کیا جائے۔(۵)

آئین پاکستان کی ان دفعات کو ماہرین قانون نے پاکستان کی مقننہ کی خودمختاری اور بالادستی کے مفہوم میں لیا ہے اور واضح کیا ہے کہ واقعی پاکستان کے آئین پارلیمنٹ کو خودمختار اور بالاتر ادارہ قرار دیتا ہے۔

کیا کوئی بھی پارلیمنٹ حقیقت میں سب اداروں پر برتری کی حامل ہوتی ہے۔اس سلسلے میں حقیقی اور عملی بات یہی ہے کہ اصولی طور پر پارلیمنٹ کی بالادستی تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اس پر کچھ پابندیاں بھی ہوتی ہیں اور کچھ عوامل اس کی بالادستی کو ختم بھی کر دیتے ہیں۔گذشتہ سطور میں آئین پاکستان کی مختلف شقوں کے حوالے سے واضح کیا گیا ہے کہ پاکستان کی پارلیمنٹ ایک آزاد اور خودمختار ادارہ ہے۔لیکن اس خودمختاری کی روح کو اس سیاق وسباق میں سمجھا جائے کہ جس طرح اسلام کے تصور آزادی کا جدید

---

4) THe constitution of Islamic republic,p460,with refference pld. 1990, Lah. 401

۵) آئین پاکستان،دفعہ ۷۰،ص ۱۱۷۔۱۱۸

مغربی تصور آزادی میں فرق ہے اسی طرح اسلامی اور مغربی پارلیمنٹ کی آزادی کے تصور میں بھی فرق ہے۔ پاکستانی پارلیمنٹ ان معنوں میں آزاد نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا قانون نہیں بناسکتی جو شریعت اسلامیہ کی مخالفت پر مبنی ہو۔ اسی بات کا ذکر قرارداد مقاصد میں کیا گیا ہے۔ پاکستانی پارلیمنٹ قرآن وسنت، اجماع صحابہ اور اجماع امت کی روشنی میں اسلامی عرف کو ملحوظ رکھتے ہوئے اجتہاد یا مصالح مرسلہ، استصلاح یا استحسان کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے قانون سازی کرے گی۔ منصوص احکام کے علاوہ اجماع امت کی مخالفت نہیں کرسکتی۔ جبکہ جدید پارلیمنٹ پر اس طرح کی کوئی قدغن نہیں ہے وہ اگر چاہے تو عورت کو مرد اور مرد کو عورت قرار دے سکتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے وفاقی شرعی عدالت اسی مقصد کے لیے تشکیل دی تھی کہ وہ یہ دیکھے کہ پارلیمنٹ کوئی خلاف اسلام قانون تو نہیں بنا رہی۔۔۔۔۔۔۔

وفاقی شرعی عدالت کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ پاکستان کے کسی بھی قانون یا اس کی ذیلی دفعہ کو قرآن وسنت سے متصادم ہونے کی بناء پر کالعدم قرار دے سکتی ہے اور حکومت کو یہ سفارش کرسکتی ہے کہ اس کی جگہ متبادل قانون سازی کی جائے (۶)۔ وفاقی شرعی عدالت کے اس اختیار کے باوجود اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آئین پاکستان کی رو سے، پارلیمنٹ خودمختار اور بالاتر ادارہ نہیں ہے اور جس طرح مغربی ممالک خصوصا برطانیہ، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا وغیرہ میں ''بنیادی انسانی حقوق'' میں پارلیمنٹ کو بھی قانون سازی کا حق حاصل نہیں ہے یا برطانیہ میں جمہوریت کے بارے میں غیر تحریری آئین کی خلاف ورزی کی بھی اجازت نہیں ہے اور ایسے قوانین کو عدالت کالعدم قرار دے سکتی ہے۔ علم سیاسیات کا یہ ایک اہم سوال ہے کہ دنیا کی کوئی بھی پارلیمنٹ مطلقا آزاد نہیں ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کی پارلیمنٹ اپنی اپنی روایات اور دیگر اصولوں اور حدود سے تجاوز نہیں کرسکتیں۔ حالانکہ اصولاً کہا بھی جاتا ہے کہ یہ پارلیمنٹس آزاد ہیں۔

پاکستان کی پارلیمنٹ کی آزادی اور خودمختاری کی راہ میں اس داخلی پابندی کے علاوہ پاکستان کی سیاسی حکومتیں بھی اس پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔۔۔ اور پارلیمنٹ کو کوئی ایک فرد (جیسے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو، صدر جنرل محمد ضیاء الحق، وزیراعظم بے بھٹو، نواز شریف اور پرویز مشرف) اپنی مرضی کے مطابق پارلیمانوں کو چلاتے رہے ہیں۔

اسلام کے نام پر حاصل ہونے والی، اس عظیم اسلامی مملکت میں، پارلیمنٹ کا ادارہ کبھی بھی آزاد اور خودمختار نہیں رہا اور آئین بنانے والی شخصیت ذوالفقار علی بھٹو نے۔۔۔ آئین میں ابتدائی سات ترامیم کرکے، جن میں سے چند ترامیم بنیادی حقوق معطل کرنے اور ملک میں مارشلا لگانے پر مشتمل تھیں (۷) پارلیمنٹ کی بالادستی پر سوالیہ نشان لگادیا اور پارلیمنٹ، وزیراعظم بھٹو کی طرف سے پاکستان کے دو صوبوں (سرحد وبلوچستان) میں ہونے والی مداخلت اور وسیع پیمانے پر ہونے والی اکھاڑ پچھاڑ میں وزیر اعظم کا ہاتھ نہیں روک سکی۔ (۸)

اس سے قبل بھی بار بار پارلیمنٹ تحلیل کی گئی اور اس تحلیل کا بنیادی مقصد سیاسی اور فوجی طالع آزماؤں کی مطلق العنان ذہنیت تھی۔ اگر پارلیمنٹ کی خودمختاری کو اس زاویے سے دیکھا جائے کہ کیا پارلیمنٹ کا ہر فرد اپنی مرضی اور ضمیر کے مطابق حق رائے استعمال کرسکتا ہے تو پارلیمنٹ کی آزادی اور خودمختاری ایک سراب دکھائی دیتی ہے۔ کوئی بھی ممبر اپنی ذاتی رائے دینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا ممبران اپنی پارٹی کے نقطہ نگاہ کی حمایت کے پابند ہوتے ہیں۔ نہ صرف اسمبلی کے اندر بلکہ باہر بھی کوئی رکن پارلیمنٹ

---

۶) آئین پاکستان۔۔ دفعات ۲۰۳۔۔ ذیلی دفعات

۷) دیکھیے۔۔ آئین پاکستان۔۔۔ دفعہ (بذیل ترمیمات

۸) ایضا

پارٹی ڈسپلن کی پابندی کرنے اور محض اپنی پارٹی کے موقف کے مطابق بات کرنے کا پابند ہوتا ہے ورنہ پارٹی نظم وضبط کی خلاف ورزی پر اس کی رکنیت ختم ہوسکتی ہے۔ برطانیہ جیسے ملک میں کوئی رکن پارلیمنٹ پارٹی کے نقطۂ نگاہ سے اگر انحراف کرتا ہے تو اسے اپنی رکنیتِ پارلیمنٹ سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ اس لیے کوئی رکن پارلیمنٹ پارٹی سے اختلاف کی حماقت کر کے اپنی سیٹ ضائع نہیں کرتا۔ اس سے واضح ہوا کہ بالادست تو سیاسی پارٹی ہوئی جس کے ٹکٹ اور احسان کی بدولت وہ پارلیمنٹ میں پہنچا اور اب پارٹی کا ہمنوا بنے رہنے کا پابند ہے۔

سپریم کورٹ آف پاکستان عدلیہ کا سب سے بلند مرتبہ ادارہ ہے۔ عدلیہ ملک میں قانون کی بالادستی اور حکمرانی قائم کرنے والا ادارہ ہے۔ سپریم کورٹ کے دائرہ اختیار میں یہ بات شامل ہے کہ اس بات کی نگرانی کرے کہ مقننہ آئین کے مطابق کام کر رہی ہے یا نہیں۔ مقننہ آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قانون سازی تو نہیں کر رہی۔ اگر ایسا ہو تو وہ کسی بھی قانون کو خلاف آئین قرار دے سکتی ہے۔ کسی بھی ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کو اس طرح کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح اس پہلے سے پارلیمنٹ کی آزادی محدود ہوتی ہے۔

۵۸/۲B اور پارلیمنٹ کی آزادی وخودمختاری:

پھر جب ملک میں بڑھتی ہوئی سیاسی بے چینی کی بناء پر۔۔۔۔۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو اس وقت کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کرلیا اور آئین کو معطل کر دیا تو ''پارلیمنٹ'' ایک مرتبہ پھر تحلیل ہوگئی اور جب ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں پارلیمنٹ بحال ہوئی تو صدر مملکت نے مارشل لاء اٹھانے کے لیے یہ شرط رکھی کہ اس کے زمانے میں ہونے والے مارشل لاء کے اقدامات اور آئین میں ضروری ترامیم کو دو تہائی اکثریت کے ساتھ منظور کیا جائے، چنانچہ پارلیمنٹ (قومی اسمبلی اور سینٹ) نے ضیاء الحق کی اس شرط کو پورا کرتے ہوئے ترامیم کو منظور کرلیا اور اس طرح آئین پاکستان میں ۵۸(۲)B کا اضافہ کر دیا گیا جس کی عبارت درج ذیل ہے:

''۵۸(۲) آرٹیکل کی شق (۲) میں شامل کسی امر کے باوجود صدر بھی اپنی صوابدید پر قومی اسمبلی توڑ سکے گا۔ جب کہ اس کی رائے میں:

(الف) وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ منظور کیے جانے کے بعد، قومی اسمبلی کے کسی رکن کا دستور کے احکام کے مطابق قومی اسمبلی کے ارکان کی اکثریت کا اعتماد رکھنے کا امکان نہ ہو''۔

(ب) ایسی صورت حال پیدا ہوگئی ہو جس میں وفاق کی حکومت دستور کے احکام کے مطابق چلائی نہ جاسکتی ہو اور انتخاب کنندگان سے فیصلہ چاہنا ضروری ہو۔(۹)

چنانچہ اس آئینی شق کے تحت۔۔۔۔۲۴ مئی ۱۹۸۸ء کو وزیراعظم محمد خان جونیجو کی حکومت کو برطرف کیا گیا۔

بعد ازاں صدر اسحاق خان نے ۱۹۹۰ء میں بے نظیر حکومت کو، ۱۹۹۳ء میں نواز شریف حکومت کو اور اس وقت کی اسمبلیوں کو برخاست کر دیا۔ جب کہ صدر فاروق خان لغاری نے ۱۹۹۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت کو رخصت کیا ۱۹۹۷ء میں اکثریت حاصل ہونے پر تیرہویں ترمیم کے تحت شق ختم کی گئی، لیکن ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اس وقت کے کمانڈر انچیف پرویز مشرف نے حکومت پر قبضہ

---

(۹) آئین پاکستان، مطبوعہ منصور بک ڈپو، دفعہ ۵۸/۲/B، ص ۱۱۰-۱۱۱

کرلیا۔۔۔اور۲۰۰۲ء میں پارلیمنٹ کودوبارہ اس کے بنائے ہوئے قوانین ایل ایف او کو منظور کرنے پر مجبور کیا۔جس کے تحت یہ شق دوبارہ بحال ہوگئی اور قومی اسمبلی اور سینٹ کے سر پر دوبارہ تلوار معلق ہوگئی۔

۲۰۰۸ء میں برسراقتدار آنے والی دونوں بڑی جماعتوں (پی پی پی اور پی ایم ایل (ن) کے مابین اصولی طور پر اس شق کو ختم کرنے پر اتفاق رائے کے باوجود یہ شق دسمبر ۲۰۰۹ء تک آئین میں موجود ہے۔(۱۰)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ پاکستان میں پارلیمنٹ حقیقی خودمختار اور بالاتر ادارہ نہیں ہے۔بلکہ وہ مختلف آمروں کی آمریت کے تحت کام کرنے پر مجبور ہے۔اس طرح پاکستان کی پارلیمنٹ داخلی اور خارجی دونوں طرح سے نہ تو خودمختار ہے اور نہ ہی بالاتر ادارہ ہے اور چند برسوں سے عدالتوں کا عمل دخل بڑھ جانے سے۔۔۔اب پارلیمنٹ اور عدلیہ میں محاذ آرائی کی سی کیفیت موجود ہے۔

خلاصہ بحث:

اس تمام بحث کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(۱)اصولی طور پر پارلیمنٹ کو بالاتر اور خودمختار ادارہ ہونا چاہیے جیسا کہ مغرب میں صدیوں سے یہی تصور رہا ہے۔

(۲) پاکستان میں پارلیمنٹ کی ابتداء محدود آزادی سے ہوئی،بعدازاں پارلیمنٹ نے خود کو آزاد اور خودمختار بنالیا،لیکن جب گورنر جنرل غلام محمد نے قومی اسمبلی کو برخاست کیا تو عدالت نے فیصلہ دیا کہ اسمبلی نے جو قوانین گورنر جنرل کو منظوری کے بغیر بنائے ہیں،وہ کالعدم تصور ہوں گے۔چنانچہ آئندہ گورنر جنرل یا صدر کی منظوری کسی بھی پارلیمنٹ کے کسی بھی منظور کردہ قانون کے لیے ضروری قرار دی گئی۔

(۳) ۱۹۷۳ء کے آئین میں پارلیمنٹ کو سب سے بالاتر (Sovereing) رکھنے کی کوشش کی گئی،لیکن جلد ہی اس پر فردواحد کی آمریت مسلط ہوگئی۔B-۵۸۲ نے اسے صدر کا ماتحت بنائے رکھا۔۔۔اس وقت یہ شق ختم ہوگئی ہے،لیکن آئین کے دیباچہ کی رو سے۔۔۔اسے قرآن وسنہ اور بنیادی انسانی حقوق سے متصادم قانون بنانے کی اجازت نہیں ہے،اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کی پارلیمنٹ محدود آزادی رکھتی ہے۔

---

۱۰) یہ شق اپریل ۲۰۱۰ء میں پارلیمنٹ نے اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے دوبارہ ختم کردی ہے،لیکن اس ترمیم کی بعض دفعات کو عدالت میں چیلنج کردیا گیا ہے (دیکھیے روزنامہ نوائے وقت،مورخہ ۲۸ مئی ۲۰۱۰ء۔۔۔سپریم کورٹ میں وزارت قانون کا تحریری بیان۔

باب سوم

اجتہاد اور پارلیمنٹ کے طریق قانون سازی میں فرق

فصل اول:

اجتہاد کا شریعت اسلامیہ میں مقام وحیثیت

فصل دوم:

مجتہد کے اوصاف وشرائط

فصل سوم:

شوریٰ اور مشورہ کا اسلامی تصور

فصل چہارم:

پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) کی رکنیت کے لیے ضروری شرائط

فصل پنجم:

مجتہد اور رکن پارلیمنٹ کے اوصاف وکردار کے حوالہ سے موازنہ

فصل اول:

اجتہاد کا شریعت اسلامیہ میں مقام وحیثیت

۱۔ اجتہاد کے لغوی معنی:

اجتہاد عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی درج ذیل ہیں:

نامور ماہر لغت۔امام ابن منظور الافریقی لکھتے ہیں:

بذل الوسع والمجهود وفی حديث معاذ اجتهد برای الاجتهاد بذل الوسع فی طلب الامر وهو افتعال من الجهد الطاقة(۱).

یعنی کسی کام کے لیے اپنی پوری کوشش اور محنت صرف کرنا، حضرت معاذ کی حدیث میں ہے: میں اجتہاد والی رائے تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ کسی کام کو تلاش کرنے کے لیے پوری کوشش کرنا...... یہ جہد بمعنی طاقت سے باب افتعال کا مصدر ہے۔

دوسرے علمائے کرام نے بھی اس کے لغوی معنی یہی لکھے ہیں، امام ابوبکر الجصاص رازی فرماتے ہیں:

واما الاجتهاد فهو بذل المجهود فی ما يقصده المجتهد يتحراه(۲).

یعنی ''اجتہاد سے مراد مجتہد کا اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس پر غور وفکر کے ذریعے پوری کوشش اور محنت کا صرف کرنا ہے''۔

نامور مسلمان عالم علامہ محمد ابن اعلی التھانوی نے لکھا ہے:

الاجتهاد فی اللغة استفراغ الوسع فی تحصيل امر من الامور مستلزم للكلفة والمشقة ولهذا يقال اجتهد فی حمل الحجر ولا يقال اجتهد فی حمل الخردلة(۳).

لغت میں اجتہاد کے معنی کسی معاملے کو حاصل کرنے کے لیے پوری طاقت صرف کرنے کے ہیں۔ جس سے محنت اور مشقت لازم آتی ہے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے پتھر اٹھانے میں پوری مشقت اٹھائی اور یہ نہیں کہا جاتا کہ اس نے رائی کے دانے کو اٹھانے میں مشقت اٹھائی۔

(۲) اجتہاد کے اصطلاحی معنی ومفہوم

اجتہاد ایک کثیر الاستعمال شرعی اصطلاح ہے، اسی بناپر فقہاء کے ہاں ''اجتہاد'' کے معنی ومفہوم پر، بہت وسعت کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اس کے اصطلاحی معنی کی توضیح وتشریح بڑی شرح وبسط کے ساتھ کی گئی ہے۔

تاہم ہمیں، فقہائے کرام کے الفاظ اور عبارتوں میں، اجتہاد کے معنی ومفہوم کے حوالے سے قدرے اختلاف نظر آتا ہے۔

---

۱) ابن منظور، لسان العرب، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۸ء، ۳۹۶/۲۷ بذیل مادہ جہد

۲) الجصاص ابوبکر احمد بن علی الرازی (م ۳۷۰ھ)، الفصول فی الاصول، مکتبہ علمیہ لاہور، ص ۵۷، ص ۵۸

۳) التھانوی، محمد بن علی بن علی التھانوی، کشاف اصطلاحات الفنون، مطبع خیاط، بیروت، ۱۹۶۶ء، ۱/۱۹۸ بذیل مادہ اجتہاد

لیکن حقیت میں الفاظ میں اختلاف کے باوجود اس کے اصطلاحی معانی بڑی حد تک ایک ہی ہیں، ابن منظور اور فریقی (صاحب لسان العرب) لکھتے ہیں:

''رد القضية التى تعرض للحاكم من طريق القياس الى الكتاب والسنة''(۴)۔

یعنی اس معاملے (یا قضیہ) کو جو حاکم سامنے پیش کیا جاتا ہے، قیاس کے طریقے سے کتاب وسنہ کی طرف پھیر دینا، اجتہاد ہے۔

یہ اصطلاحی مفہوم تو ایک لغوی امام کا بیان کردہ تھا، جبکہ علامہ ابواسحاق الشاطبی، صاحب الموافقات نے اس کا اصطلاحی مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

الاجتهاد استفراغ الجهد وبذل الوسع: اما فى درك الاحكام الشرعية واما فى تطبيقها.(۵)

اجتہاد سے مراد یا تو شرعی احکام معلوم کرنے کے لیے یا ان احکام میں تطبیق کے لیے پوری کوشش اور ہمت صرف کرنا ہے۔

امام ابوبکر الجصاص رازی، (م ۳۷۰ء) نے اجتہاد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

قد اختص فى العرف باحكام الحوادث التى ليس لله تعالى عليها دليل يتوصل الى العلم بالمطلوب عنها(۶).

''یعنی عرف میں اجتہاد کا لفظ ایسے نئے پیش آنے والے مسائل کے احکام سے مختص کر دیا گیا ہے، جن کے بارے میں اللہ تعالی نے کوئی دلیل قائم نہ کی ہو، جو اس کے متعلق مطلوب علم تک پہنچاتی ہو''۔

امام الجصاص رازی کی یہ تعریف: عام ڈگر سے ہٹ کر ہے، موصوف نے اس تعریف میں قرآن وسنت میں اس کے حکم کی غیر موجودگی کو مدار بنایا ہے۔

چھٹی صدی ہجری کے نامور عالم اور فلسفی امام فخر الدین رازیؒ نے بھی اجتہاد کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

هو استفراغ الوسع فى النظر فى ما لا يلحقه فيه لوم مع استفراع الوسع فيه(۷).

''یعنی وہ غور وفکر کے ذریعے، کسی ایسے معاملے میں پوری محنت وکوشش صرف کرنا ہے، جس میں ملامت کا گزر نہ ہو، نیز یہ کہ اس میں پوری محنت اور کوشش صرف کی جائے''۔

امام فخر الاسلام علی بن محمد البزدوی نے اجتہاد کی تعریف، ان جامع الفاظ کے ساتھ کی ہے:

'اجتهاد هو بذل المنح الجمهود فى طلب الحق بقياس وغيره(۸).

یعنی قیاس وغیرہ کے ذریعے حق کی تلاش وتحقیق کے لیے تمام کوشش اور محنت صرف کرنا ہی......اجتہاد ہے''۔

ایک اور فقیہ اور محقق علامہ الآمدی نے اجتہاد کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ کی ہے:

---

۴) لسان العرب، مطبوعہ قاہرہ، ۳۹۶/۱

۵) الشاطبی، ابواسحاق ابراہیم بن موسی، المالکی الفرغانی، (م ۷۹۰ء) الموافقات فی اصول الفقہ، مطبوعہ المکتبۃ التجاریہ الکبری، (بدون تاریخ) ۸۹/۴)

۶) ابوبکر الجصاص الرازی، الحنفی (م ۳۰۲ھ) الفصول فی الاصول، طبع سعید اللہ، مطبوعہ مکتبۃ العلمیہ، لاہور، ص ۵۸۔۵۹)

۷) الرازی، فخر الدین محمد بن عمر (۶۰۶ھ) المحصول فی علم الاصول الفقہ، المستند الرسالۃ، بیروت، باردوم ۱۹۹۲ء ۶/۶

۸) البزدوی، عبد العزیز، البخاری کشف الاسرار علی اصول فخر الاسلام للبزدوی، ۲۶۸/۳

استفراغ الوسع فی طلب الظن بشیء من احکام الشرعیة علی وجه یحس من النفس العجز عن المزید فیه(۹).

یعنی احکام شرعی میں سے کسی حکم میں گمان غالب کے حصول کے لیے اس طرح پوری کوشش صرف کرنا، کہ انسانی نفس اس سے زیادہ کوشش صرف کرنے سے قاصر ہو"۔

نامور محقق اور شافعی عالم، امام ابوحامد الغزالی (م ۵۰۵ھ) نے بھی قریب قریب اسی موقف اور مسلک کو اختیار کیا ہے۔ امام غزالیؒ نے اجتہاد کو دو صورتوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک عام درجے کا اجتہاد ہے اور ایک کامل و مکمل درجے کا اجتہاد ہے۔ دونوں میں فرق حکم کی تحصیل میں صرف کی جانے والی سعی بلیغ کا ہے، وہ فرماتے ہیں:

الاجتھاد ان یبذل المجتھد وسعه فی طلب العلم باحکام الشریعة والاجتھاد التام ان یبذل الوسع فی الطلب بحیث یحس من نفسه بالعجز عن مزید طلب(۱۰).

"کسی شرعی حکم کی تلاش وتحقیق کے لیے سعی بلیغ صرف کرنا اجتھاد ہے، جبکہ اجتہاد تام (مکمل اور کامل درجے کا اجتہاد) یہ ہے کہ کسی حکم کی تلاش اور تحقیق میں اتنی کوشش صرف کی جائے کہ انسانی جان یہ محسوس کرنے لگے کہ اب مزید تلاش اور تحقیق کی گنجائش نہیں ہے"۔

امام ابن الہمام الحنفی نے بھی طاقت وکوشش کے صرف کرنے کو اجتہاد کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"الاجتھاد ھو لغة بذل الطاقة فی تحصیل ذی کلفة واصطلاحاً ذالک من الفقیه فی تحصیل حکم شرعی ظنی"۔(۱۱)

لغوی طور پر اجتہاد سے مراد کسی مشقت والے کام کی تلاش وتحقیق میں ہمت وکوشش صرف کرنے کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد کسی فقیہ کی طرف سے کسی گمان غالب والے شرعی حکم کی تلاش وتحقیق کے لیے کوشش اور محنت صرف کرنا اجتہاد ہے"۔

علامہ تفتازانی شافعی نے تلویح شرح توضیح جلد۲ صفحہ ۱۱۷ پر لکھا ہے اور ایسے ہی امام غزالیؒ نے مستصفٰی جلد۲ صفحہ ۳۵۰ اور احکام الاحکام آمدی جلد۴ صفحہ ۱۱۸ پر ہے کہ اجتہاد لغت میں تو مشقت برداشت کرنا ہے اور اصطلاح شرع میں فقیہہ کا اپنی پوری طاقت وقوت کو کسی حکم شرعی کے گمان غالب کے درجہ میں حاصل کرنے کے لئے اس درجہ عمل میں لانا ہے کہ دل یہ محسوس کرے کہ وہ اس سے زیادہ کی محنت کی استعداد نہیں رکھتا۔ لہٰذا غیر فقیہ کا (یعنی اصول سے ماخوذ احکام جزئیہ فرعیہ کے ماہر کے علاوہ کا) بے دریغ کوشش کرنا بھی اجتہاد نہیں۔ اور فقیہہ ومفتی کا یقینی احکام (مثلاً عقائد یا اعمال متواترہ) میں ایسی کوشش نہ اجتہاد ہے نہ کسی کو اس کا حق ہے اور نہ غیر شرعی (دنیوی) امور میں یہ کوشش اجتہاد ہے۔

عصر حاضر میں ان مشکل اور کسی قدر طویل تعریفوں کے بجائے مختصر تعریف پر زور دیا جاتا ہے، چنانچہ حسین حامد حسان نے

---

۹) الآمدی، ابوالحسن، احکام الاحکام، مطبوعہ دار المعارف، القاہرہ، ۱۱۵/۳

۱۰) ابوحامد الغزالی (۵۰۵ھ) المستصفی من علم الاصول، مطبوعہ قاہرہ، ۱۰۱/۲

۱۱) ابن الہمام کمال الدین محمد بن عبدالواحد، الحنفی (م ۸۶۱ھ) التحریر فی اصول الفقہ، مطبع مصطفی البابی الحلبی، وشرہ، ۱۳۵۱ھ، ص ۵۲۳

اس کی درج ذیل تعریف کی ہے:

"بذل الجهد فی استنباط حکم شرعی من ادلته واخذه من مصادره اذا لم تنص هذه الادلة او تلک المصادر علی الحکم صراحة" (۱۲)

یعنی کسی شرعی حکم کو اس کے دلائل (قرآن وسنت) اور اس کے مصادر سے استنباط کرنے کے لیے پوری کوشش اور محنت صرف کرنا، بشرطیکہ ان دلائل یا ان مصادر میں کسی حکم کی صراحت موجود نہ ہو۔

عصر حاضر ہی کے ایک اور فاضل محقق عبدالخلاف نے اس کی یوں تعریف کی ہے:

"فالاجتهاد بالرای هو بذل الجهد الی الحکم فی و اقعة لا نص فیها بالتفکیر و استخدام الوسائل التی هدی الشرع الیها للاستنباط بها فی ما لا نص فیه" (۱۳)۔

اپنی رائے کے ساتھ اجتہاد سے مراد کسی ایسے واقعے کے حکم کے لیے غور وفکر اور شریعت کے بتائے ہوئے طریقوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، پوری کوشش اور محنت صرف کرنا ہے بشرطیکہ مصادر میں پہلے سے کوئی صریح حکم موجود نہ ہو۔

اس تفصیل سے درج ذیل امور کا اثبات ہوتا ہے۔

1۔ اجتہاد صرف ان مواقع میں کیا جاتا ہے، جہاں پہلے سے کوئی صریح حکم موجود نہ ہو اور جہاں پہلے سے کوئی حکم موجود ہو۔ وہاں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہوتی۔

2۔ اجتہاد کرنے کے لیے قرآن مجید، احادیثِ نبویہ اور اجماع امت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور ایک مخصوص طریقہ کار اختیار کر کے علت و معلول کا تعین کیا جاتا ہے۔

3۔ اجتہاد کی درستگی کے لیے ضروری ہے کہ قرآن وسنت کے کسی حکم کی دریافت کے لیے تمام ضروری وسائل بروئے کار لائے جائیں اور پوری کوشش اور محنت صرف کی جائے۔

4۔ امام الغزالیؒ کے مطابق اجتہاد کی دو صورتیں ہیں، یعنی عام درجے کا اجتہاد اور "اجتہاد تام"، یعنی مکمل اجتہاد جس کے لیے اتنی کوشش اور محنت کی جائے کہ مزید کوشش اور محنت کی گنجائش باقی نہ رہے۔

5۔ امام ابوبکر الجصاص کے مطابق، کسی ایسے مسئلے کا حکم دریافت کرنے کا نام اجتہاد ہے جس کے متعلق کوئی صریح نص موجود نہ ہو۔

اجتہاد کا حق کس کو حاصل ہے؟

اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے، کہ اجتہاد کسی عام شخص کی سوچ بچار یا غور وفکر کا نام نہیں ہے اور نہ ہی یہ عام سطح کی سوچ بچار ہے۔ اسی طرح لوگوں کی رائے معلوم کرنے کا نام بھی اجتہاد نہیں ہے، یہ تو مکمل طور پر ایک تکنیکی معاملہ ہے، جو صرف ایسے فقہاء ہی انجام دے سکتے ہیں، جو شرعی اور قانونی دلائل پر گہری نظر رکھتے ہوں۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کو جو بھی مسئلہ درپیش ہو، شریعت میں اس کا حکم صراحتاً یا دلالتاً موجود ہوگا۔ اگر بعینہٖ اس

---

۱۲) حسین حماد، المدخل لدراسة الفقه، ص ۳۷

۱۳) عبدالوہاب خلاف، مصادر التشریع الاسلامی، دارالقلم الکویت، ۱۹۷۰ء بار اول، ص ۷۰

مسئلہ کے بارے میں کوئی حکم ہوتو اُسے اس کی اتباع کرنی چاہیے، اگر ایسا نہ ہوتو اسے اجتہاد کے ذریعہ بات دریافت کرنی چاہیے۔ اسی کو اجتہاد اور قیاس کہا جاتا ہے۔(۱۴)

محمد بن حسنؒ کہتے ہیں: جو شخص کتاب وسنت اور اقوالِ صحابہؓ کا عالم ہو اور فقہاءؒ کے نزدیک جو چیزیں مستحسن رہی ہیں ان کو جانتا ہو۔ تو اسے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کا حق ہے۔ وہ نماز، روزہ، حج اور تمام مامورات ومنہیات کے بارے میں فتویٰ دے سکتا اور اسے نافذ کرسکتا ہے، اگر اس نے غور وفکر اور اجتہاد میں اور مسئلہ سے ملتے جلتے احکام پر قیاس کرنے میں کوتاہی نہیں کی ہے تو اس پر عمل بھی کرسکتا ہے، چاہے وہ عملاً صحیح نتیجہ تک نہ پہنچ سکا ہو۔(۱۵)

فقہ حنفی میں دین اور ان کی اتباع کرنے والے علماء وفقہا کے سات طبقات بتائے گئے ہیں: یہ طبقات اجتہاد کا حق رکھنے میں ایک دوسرے سے فرق رکھتے ہیں لیکن اجتہاد کا حق انہی علماء کو حاصل ہے

پہلا طبقہ 'مجتہدین فی الشراع' کا ہے، جنھوں نے شریعت کے احکام سے براہِ راست اجتہاد کیا۔ جیسے ائمہ اربعہ یا ان جیسے دوسرے ائمہ، جنھوں نے کتاب وسنت کو سامنے رکھا اور ان کی روشنی میں اجتہاد کے اصول وضع کیے اور ان پر عمل کیا۔

دوسرا طبقہ 'مجتہدین فی المذہب' کا ہے۔ فقہ حنفی میں امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے دوسرے تلامذہ کا شمار اسی طبقہ میں ہوتا ہے۔ یہ لوگ فروع اور جزئیات میں بسا اوقات امام صاحب سے اختلاف بھی کرتے ہیں، لیکن اصول میں وہ ان سے متفق ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لوگ فقہ حنفی کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ وغیرہ کو اصول سے بھی اختلاف ہے، اس لیے ان کا فقہی مسلک دوسرا سمجھا جاتا ہے(۱۶)۔

تیسرا طبقہ 'مجتہدین فی المسائل' کا ہے۔ یہ لوگ فقہ حنفی کے اصول وفروع کسی بھی چیز سے اختلاف نہیں کرسکتے، البتہ جن مسائل میں ان کے ائمہ نے صراحت نہیں کی ہے، ان کی بتائی ہوئی تفصیلات کی روشنی میں ان کا حکم بیان کرسکتے ہیں۔ اس طبقہ میں جصاصؒ، طحاویؒ، کرخیؒ، شمس الائمہ حلوائیؒ، شمس الائمہ سرخسیؒ، علامہ بزدویؒ اور قاضی خاںؒ جیسے اصحابِ علم داخل ہیں۔

چوتھا طبقہ 'اصحابِ تخریج' کا ہے، جو اجتہاد کی صلاحیت تو نہیں رکھتے، البتہ اپنے ائمہ کے اصول اور ان کے مآخذ سے اچھی طرح واقف ہیں اور انھوں نے جو مسائل مستنبط کیے ہیں ان پر قیاس کرسکتے ہیں۔ اس لیے ان کے کسی بھی مجمل یا مبہم قول کی، جس کے ایک سے زیادہ پہلو ہوسکتے ہیں، تعیین اور توضیح کرسکتے ہیں، جیسے رازیؒ اور کرخیؒ وغیرہ۔

پانچواں طبقہ 'اصحابِ ترجیح' کا ہے۔ یہ لوگ اپنے مذہب کی مختلف روایات میں کسی ایک کو ترجیح دے سکتے ہیں۔ ابوالحسن قدوریؒ اور صاحب ہدایہ اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

چھٹا طبقہ ان علماء کا ہے جو اپنے مذہب کی مختلف روایات میں یہ فرق کرسکتے ہیں کہ ان میں کون قوی ہے اور کون ضعیف؟ اور ظاہر روایت کیا ہے اور شاذ روایت کیا؟ جیسے 'کنز الدقائق' درمختار' وقایہ وغیرہ کے مصنفین۔

ساتواں طبقہ ان مقلدین کا ہے جو اپنے مذہب کی کم زور اور مضبوط اور غلط اور صحیح روایات میں کوئی فرق نہیں کرپاتے۔(۱۷)۔

---

(۱۴) کتاب ''تحقیقات اسلامی''، باب ''باب شریعت میں اجتہاد کا عمل''(صفحہ نمبر ۱۷)

(۱۵) ایضا

(۱۶) کتاب ''تحقیقات اسلامی''، باب ''باب شریعت میں اجتہاد کا عمل''(صفحہ نمبر ۱۸)

(۱۷) کتاب ''تحقیقات اسلامی''، باب ''باب شریعت میں اجتہاد کا عمل''(صفحہ نمبر ۱۹)

(۲) اجتہاد کا مقام ورتبہ

اسلام میں اجتہاد کو بہت بلند اور بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد اور اجتہاد کرنے والوں کی تعریف فرمائی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات درج ذیل ہیں:

حضرت عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا حکم الحاکم فاجتهد فاصاب فله اجران و اذا حکم فاجتهد فاخطا فله اجر (۱۸)

اگر کوئی حاکم فیصلہ کرے اور اس پر اچھی طرح غور وخوض کرے اور پھر فیصلہ کرے جو درست بھی ہو، تو اسے دوگنا اجر ملے گا اور اگر کوئی (غور وفکر کے بعد) فیصلہ کرے، مگر یہ فیصلہ درست نہ ہو، تو اسے ایک گنا اجر ملے گا۔

علماء نے لکھا ہے کہ غلطی کرنے کے باوجود اسے جو ایک گنا اجر ملے گا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے صحیح فیصلہ تک پہنچنے کے لیے پوری محنت اور اجتہاد کیا تھا، لہٰذا اسے اس کی محنت اور اجتہاد کا اجر ملے گا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہر مجتہد ہمیشہ صحیح نہیں ہوتا، بلکہ اس میں درستگی اور غلطی دونوں کا امکان رہتا ہے۔ (۱۹)

حضرت معاذؓ بن جبل کو اجتہاد کی تاکید

نامور صحابی حضرت معاذؓ بن جبل سے روایت ہے:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں یمن کے علاقے میں قاضی اور حاکم بنا کر بھیجا، تو پوچھا: اے معاذ! جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے فیصلہ کے لیے پیش ہوگا، تو تم کیسے فیصلہ کرو گے؟ کہا: میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پوچھا اگر تمہیں وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ملا تو کیا کرو گے؟ کہا: میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پوچھا: اگر تمہیں وہ مسئلہ نہ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ملے اور نہ ہی اللہ کی کتاب میں ملے تو تم کیا کرو گے؟ کہا: میں اپنی رائے کے ساتھ اجتہاد کروں گا اور کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر ہاتھ مارا اور کہا: ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول (قاصد) کو ایسے امر کی توفیق بخشی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے''۔ (۲۰)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں اجتہاد کو بہت اعلیٰ وارفع مقام حاصل ہے۔ دراصل اجتہاد کا تصور اور اس کا یہ ادارہ اسلام کی مستقبل کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کے توسیع پسند معاشرے اور اس کی بڑھتی ہوئی قانونی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے یہ سب سے اہم ذریعہ ہے اور اسلام نے اس ادارے

---

۱۸) ابوداؤد، الجامع السنن، مطبوعہ دار الطباعۃ للنشر والتوزیع، بیروت ۱۳۸۳ھ/۱۸۷۳ء، ۶/۴، حدیث نمبر ۳۵۷۴، البخاری، الجامع الصحیح کتاب الاعتصام بالسنۃ، ۱۳۲/۹، باب اجر الحاکم اذا اجتہد

۱۹) نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: قاضی (جج) تین طرح کے ہیں، ان میں سے ایک جنت میں اور دو دوزخ میں جائیں گے۔ جنت میں ایسا قاضی جائے گا جس نے حق کو پہچانا اور اسی کے مطابق فیصلہ دیا اور جس شخص نے حق کو پہچانا مگر ظالمانہ فیصلہ دیا اور دوسرا وہ کہ جس نے جہالت کی بنیاد پر فیصلہ دیا، یہ دونوں جہنم میں جائیں گے۔ (ابوداؤد، السنن ۵/۴، کتاب الاقضیہ، باب ۲، حدیث ۳۵۷۳، الترمذی، ۶۱۳/۳، کتاب الاحکام، الحدیث ۱۳۲۲

۲۰) احمد بن حنبل مسند، ۲۳۰/۵، الدارمی، السنن ۶۰/۱، المقدمہ۔۔۔ ابوداؤد، السنن، ۱۸/۴، کتاب الاقضیہ (۱۸) باب ۱۱، حدیث ۳۵۹۲، الترمذی، ۶۱۶/۳، کتاب الاحکام ۱۳/ باب ۳، حدیث ۱۳۲۷۔

اور اس ادارے کے ذریعے، تا قیامت آنے والے مسلمانوں اور ان کے معاشروں کی ہر طرح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی عملی ضمانت عطا کی ہے۔

معروف ماہر قانون، ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم نے، اسلام کے اصول فقہ اور فقہ کو قرآن مجید کی درج ذیل آیت کی عملی تعبیر قرار دیا ہے۔ جس میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ﴾ (۲۱)

ترجمہ: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالی نے پاکیزہ کلمے کی پاکیزہ درخت کے ساتھ مثال بیان کی ہے۔ جس کی جڑیں تو زمین میں ثبت ہوتی ہیں اور اس کی شاخیں آسمان تک پھیل جاتی ہیں۔

اسلام کے اسی اصول اجتہاد کی یہ کرشمہ سازی ہے کہ اسلام کی ساڑھے چودہ سو سالہ تاریخ میں جہاں بھی اور جب بھی کوئی قانونی ضرورت پیش آئی یا قرآن وسنت کا نقطہ نظر معلوم کرنے کا موقع آیا تو مسلمان ماہرین قانون نے اسلام کے عطا کردہ اجتہاد کے اسی تصور کے تحت مسلمان معاشرے کی تمام ضرورتوں کو پورا کیا اور اسی اصول کے تحت اب تک اسلامی قانون عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے میں مصروف ہے۔ (۲۲)

۳۔ عہد نبوی میں اجتہاد کا ادارہ

اجتہاد کی اہمیت اور اس کی عظمت کا مزید اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اگر چہ یہ بات مختلف فیہ ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرماتے تھے یا نہیں، تاہم یہ بات یقینی اور قطعی ہے کہ عہد نبوی میں اجتہاد کے اصول پر عمل ہوتا رہا ہے اور صحابہ کرام مختلف مواقع پر اجتہاد کے اصول پر عمل پیرا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض صحابہ کرامؓ کے اجتہادات برقرار رکھے گئے اور بعض صحابہ کرامؓ کے اجتہادات کو بارگاہ نبوت سے رد کر دیا گیا۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود اجتہاد فرماتے تھے یا نہیں؟ اس کے متعلق اشاعرہ اور معتزلہ کی رائے یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود اجتہاد نہیں فرماتے تھے، بلکہ آپ مختلف موقعوں پر وحی الٰہی کا انتظار فرماتے تھے اور فوری طور پر فیصلہ نہیں فرماتے تھے۔ جیسا کہ واقعہ ظہار (۲۳) اور واقعہ لعان (۲۴) کے موقعوں پر ہمیں اس کا عملی طور پر مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے۔ اس مکتب فکر کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فیصلے کو آپ کے اجتہاد کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ امکان بہر حال موجود ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ظاہر نہ فرمایا ہو کہ آپ پر وحی آئی ہے یا نہیں۔ مگر آپ نے وہ حکم وحی الٰہی کے تحت صادر فرمایا ہو۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اجتہاد کی نسبت کرنا درست نہیں ہے۔ (۲۵)

البتہ جمہور علماء اور فقہاء نے قرآن مجید اور احادیث نبویہ کی بعض تصریحات سے یہ ثابت کیا ہے کہ بوقت ضرورت نبی

---

(۲۱) ابراہیم ۱۴/ ۲۴

(۲۲) محمد حمید اللہ ڈاکٹر، خطبات بہاول پور، ص ۳۰

(۲۳) القرآن الکریم، المجادلہ، ۱۔۴

(۲۴) النور، ۶۔۹

(۲۵) ثناء اللہ پانی پتی قاضی محمد، مظہری، ۲/ ۲۱:۲ (تفسیر سورۃ النساء، آیت ۱۰۵

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود بھی اجتہاد کیا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اجتہادات شریعت الٰہیہ ہی کا حصہ ہیں۔ جس کا جواز خود اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت کیا ہے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰکَ اللّٰہُ (۲۶)

یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھایا ہے۔

یہاں بہت سے مفسرین نے ''اراک اللہ'' میں اراک سے مراد ''رائے'' یا ''علم'' لیا ہے۔ مطلب یہ کہ آپ لوگوں کے مابین اس رائے یا اس علم کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو رائے یا علم کے طور پر عطا کیا ہے۔ چنانچہ جمہور امت کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لشکروں کی ترسیل، جنگوں میں پڑاؤ لگانے کے مواقع اور مقامات نیز جنگ میں حملہ کرنے کے طریقے اور حکمت کا تعین اپنی رائے یا اجتہاد سے کرتے تھے (۲۷)

بایں ہمہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد۔ عام مجتہدین کے اجتہاد اور ان کی فقہی آراء کے مماثل ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے کہ عام مجتہدین اور فقہا کا اجتہاد خطاء اور غلطی کے تصور سے مبری نہیں ہوتا، جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد خطا اور غلطی کے امکان سے مبری ہے۔ اس لیے کہ نبی کی عام سوچ اور فکر بھی غلطی کے امکان سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس لیے نبی علیہ السلام کا اجتہاد بھی، لوگوں کے لیے واجب التقلید ہے، جبکہ عام مجتہدین کے اجتہاد کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔

چنانچہ نامور فقیہ امام ابن شہاب الزہریؒ حضرت عمرؓ بن الخطاب سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا:

یٰا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ الرَّأیَ اِنَّمَا کَانَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُصِیْبًا لِاَنَّ اللّٰہَ کَانَ یُرِیْہِ وَاِنَّمَا ھُوَ مِنَّا الظَّنُّ وَالتَّکَلُّفُ (۲۸)

لوگو! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد اور رائے بہر حال درست تھی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو (حق کا راستہ) دکھاتا تھا جبکہ ہمارا اجتہاد محض اٹکل اور تکلف ہے۔

۴۔ احادیث نبویہ سے استدلال

جمہور علماء نے اس مقصد کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث مبارکہ سے بھی استدلال کیا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت زینبؓ ام سلمہ رضی اللہ عنہما اپنی والدہ محترمہ حضرت ام سلمہ سے روایت کرتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَاِنَّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ وَلَعَلَّ بَعْضُکُمْ اَنْ یَّکُوْنَ اَلْحَنُ بِحُجَّتِہٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِیُ لَہٗ عَلٰی نَحْوِ مَا اَسْمَعُ مِنْہُ فَمَنْ قَضَیْتُ لَہٗ مِنْ حَقِّ اَخِیْہِ بِشَیْءٍ فَلَا یَاْخُذُ مِنْہُ شَیْئًا فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَہٗ مِنَ النَّارِ (۲۹)

---

(۲۶) النساء، ۱۰۵/۴

(۲۷) محمد ثناء اللہ پانی پتی، قاضی، تفسیر مظہری، ۲/۲:۲۳۱، مطبوعہ ندوۃ المصنفین، دھلی، ۱۹۵۳

(۲۸) ابوداؤد، السنن، کتاب الاقضیہ، باب (۷) قضاء القاضی اذا اخطاء حدیث ۳۵۸۶، اس حدیث کے متعلق امام المنذری نے لکھا ہے کہ یہ منقطع ہے، اس لیے کہ ابن شہاب الزہریؒ نے حضرت عمر بن الخطاب کا زمانہ نہیں پایا (انہوں نے درمیان کے کسی راوی کا نام چھوڑ دیا ہے)، حواشی ابوداؤد، ۱۵/۴، ۱۷

(۲۹) البخاری، ۲۳۵/۳ (کتاب الشہادات، باب کیف یستحلف) و کتاب الحیل، باب ۱۰: و کتاب الاحکام، باب ۳: مسلم، کتاب الاقضیہ، حدیث ۱۷۱۳: الترمذی، کتاب الاحکام، حدیث ۱۳۳۹، باب الحکم بالظاہر، ابن ماجہ، کتاب الاحکام، حدیث ۲۳۱۷: ابوداؤد، ۱۴/۴، کتاب الاقضیہ، باب ۷، حدیث ۳۵۱۴۔ اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جب ان صحابہ کرامؓ نے یہ بات سنی تو انہوں نے اپنا حق دوسرے کو چھوڑ دیا، جس پر نبی اکرم ﷺ نے انہیں وہ شے تقسیم کر دی۔

بے شک میں ایک انسان ہوں اور بے شک تم لوگ میرے سامنے جھگڑے پیش کرتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک شخص تم میں سے، دوسرے شخص کے مقابلے میں اپنی دلیل اور اپنی حجت بہتر طریقے سے پیش کرنے والا ہو اور پھر میں نے اس سے جو دلیل سنی ہو، میں اس کے مطابق فیصلہ کردوں۔ لہذا اگر میں کسی شخص کے حق میں اس کے بھائی کے حق سے فیصلہ کر کے اسے کچھ دلا دوں (جو حقیقت کے اعتبار سے اس کا نہ ہو) تو وہ اسے ہرگز نہ لے۔ اس لیے کہ میں جہنم کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اسے دے رہا ہوں۔

اس طرح حضرت ام سلمہؓ سے ہی یہ مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلَانِ يَخْتَصِمَانِ فِيْ مَوَارِيْثَ وَاَشْيَاءَ قَدْ دَرَسَتْ فَقَالَ انِّي اِنَّمَا اَقْضِيْ بَيْنَكُمْ بِرَايِيْ فِيْ مَا لَمْ يَنْزِلْ عَلَيَّ فِيْهِ۔ (۳۰)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو آدمی ایسی وراثت اور ایسی اشیاء کے متعلق جھگڑا لے کر آئے جو مٹ چکی تھیں اور کوئی گواہ بھی موجود نہ تھا، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن امور میں مجھ پر وحی نازل نہ ہوئی ہو، ان میں، میں اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں''

اس سے واضح ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حسب موقع اور حسب ضرورت اجتہاد اور رائے سے بھی کام لیتے تھے۔

۲۔ صحابہ کرام کے دور میں اجتہاد و قیاس اور اس کے مناہج:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلیٰ ترین مقاصد کے لیے امت کو جس اجتہاد اور جس قیاسی منہج اور اصول کی تعلیم دی اور ضرورت اور موقع پیش آنے پر، خود بھی اس سے استفادہ کیا، اجتہاد اور رائے کا یہ منہج و موقف خلفائے راشدین اور بعد کے ادوار میں پوری طرح زیر عمل رہا اور اس دور میں، اس میں پوری شدت اور قوت پیدا ہوگئی۔

اس کی فوری وجہ یہ ہوئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد، دنیائے اسلام کے سیاسی حالات میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوگئی۔ مسلمانوں اور کفار کے مابین ہونے والے تصادم سے، نیز مسلمانوں کی فوجی اور سیاسی فتوحات سے، بہت سے مسائل پیدا ہونے لگے، دوسری طرف وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے پردہ فرمالیا، لہذا مسلمانوں کو اپنے مسائل کے حل کے لیے ایسے منہج اور اصول کی ضرورت پیش آئی جس سے نئے مسائل کو حل کیا جاسکے۔ اس لیے اس ذریعے سے استفادہ ناگزیر ہوگیا تھا (۳۰-الف)۔ اس دور میں اجتہاد کا منہج اور اس کا طریقہ کیا تھا، اس پر امام ابن القیم نے اپنی کتاب اعلام الموقعین میں یوں روشنی ڈالی ہے:

''جب حضرت ابوبکرؓ کے سامنے کوئی مقدمہ/ معاملہ پیش ہوتا تو وہ اللہ کی کتاب قرآن مجید میں نظر ڈالتے اگر انہیں کتاب اللہ میں اس کے متعلق کچھ مل جاتا تو وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر انہیں قرآن مجید میں کچھ نہ ملتا، تو پھر اگر انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کے مطابق اس کا کوئی حل معلوم ہوتا تو وہ اس کے مطابق عمل کرتے۔ اگر انہیں اس کا کوئی علم نہ ہوتا تو وہ باہر نکل کر مسلمانوں سے اس کے متعلق پوچھتے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر اس کے متعلق کوئی فیصلہ کیا ہو تو مجھے بتاؤ، بعض اوقات ان کے پاس کئی ایسے لوگ آجاتے جو اس مسئلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بیان کرتے تو وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتے، اس پر

---

۳۰) احمد بن حنبل، مسند، ۶ر۳۲۰: ابوداود، السنن، کتاب الاقضیہ (۱۸) باب فی قضاء القاضی، اذا اخطاء (۷) حدیث ۳۵۸۴۔۔۔ یہ حدیث سابقہ حدیث کا حصہ ہے، جس کا ذکر حاشیہ نمبر ۳۱ میں آیا ہے۔

۳۰الف) دیکھیے، الہیثمی، مجمع الزوائد، ۱ر۱۸۲، موسسۃ الرسالۃ، بیروت

حضرت ابوبکرؓ فرماتے ''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس نے ہمارے اندر ایسے لوگ پیدا فرمادیے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ باتیں یاد رکھتے ہیں اور اگر ایسا کوئی فیصلہ نہ ملتا تو وہ لوگوں کے سرداروں اور ان میں سے اچھے لوگوں کو جمع کرتے، اگر ان کی اس بارے کوئی اجماعی رائے ہو جاتی تو وہ اس کے مطابق فیصلہ فرماتے۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی اسی طریقے پر عمل پیرا رہے۔ تاہم اگر انہیں کتاب وسنت میں اس کے مطابق کوئی حل نہ ملتا تو وہ یہ دیکھتے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانے میں اس کا کیا فیصلہ کیا تھا۔ اگر حضرت ابوبکرؓ نے کوئی فیصلہ کیا ہوتا، تو وہ اس پر عمل کرتے، ورنہ وہ مسلمانوں میں سے سرکردہ لوگوں کو بلاتے اور ان کا جس رائے پر اتفاق ہوتا۔ اس پر عمل کرتے (۳۱)

اس طرح عہد خلافت راشدہ میں اجتہاد نے اجماع کی صورت کو جنم دیا اور خلفائے راشدین نے امت کو اختلاف اور انتشار سے بچانے کے لیے تمام لوگوں یا کم از کم اس وقت کے سرکردہ لوگوں کو ایک جگہ بٹھا کر کسی نتیجے تک پہنچنے کا اصول اور منہج اختیار کیا۔ اس طرح اجتہاد کی عملی تربیت کے ساتھ ساتھ ''اجماع'' کی تربیت بھی ہوتی رہی۔

تاہم اس عہد میں انفرادی سطح پر بھی اجتہاد کی مثالیں موجود ہیں، خصوصاً خلفائے راشدین اور دوسرے سرکردہ صحابہ کرام کے ہاں اجتہاد کی صورت بھی زیر عمل تھی اور وہ حسب موقع اس اہم ذریعے کو مسائل کے حل کے لیے استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے ایک کاتب نے ایک خط میں یہ لکھ دیا ''هذا ما رای الله وعمر'' (یہ اللہ تعالیٰ کی اور حضرت عمرؓ کی رائے ہے)، اس پر حضرت عمرؓ سخت خفا ہوئے اور فرمایا: تونے غلط لکھا ہے۔ تجھے یوں لکھنا چاہیے: یہ عمر کی رائے ہے اگر صحیح ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اگر یہ غلطی اور خطا ہے۔ تو یہ عمر کی طرف سے ہے۔ سنت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے مقرر کر دی ہے اور غلطی کرنے والی خطا کو امت کے لیے سنت قرار نہ دو۔ (۳۲)

اسی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ سلم کے وصال مبارک کے بعد قانون سازی اور فقہ اسلامی کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا تھا جو بظاہر پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا اور جس کے حوالے سے امت کو ایک عظیم چیلنج درپیش تھا۔ یہ خلا اور چیلنج صحابہ کرام ''خصوصاً خلفائے راشدینؓ نے اجتہاد کا منہج اختیار کر کے پورا کیا اور فقہ اسلامی کی ایسی مضبوط اور مستحکم بنیادیں رکھیں کہ اس کے بعد کے ادوار میں امت کو کوئی دقت اور دشواری پیش نہ آئی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد ہی اجتہاد و قیاس کی ضرورت واضح ہو گئی تھی، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے خلیفہ کے طور پر انتخاب، دنیائے اسلام کا پہلا اجتہاد تھا۔ جس پر بعد ازاں تمام صحابہ کرام کا اجماع ہو گیا۔ اس لیے کہ اس بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی واضح اور صریح حکم موجود نہ تھا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے نامزد کرکے دوسرے خلیفہ راشد اور مسلمانوں کے امیر کے طور پر حضرت عمرؓ کا انتخاب اور حضرت عمرؓ کے بعد تین رکنی کمیٹی کی طرف سے حضرت عثمانؓ کا انتخاب اسی سلسلہ کی دوسری مثالیں ہیں۔

پھر حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے مرتدین کے خلاف جنگ کرنا ابتدائی طور پر حضرت ابوبکرؓ کا شخصی اجتہاد تھا۔ (۳۳) خصوصاً

---

۳۱) اعلام الموقعین، ۱/۱۱۸

۳۲) ایضا

۳۳) البخاری، کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکاۃ، حدیث نمبر ۱۳۹۹، ۴۰۰، ۳/۲۶۲، مسلم، کتاب الایمان، باب الامر بقتال الناس، حدیث ۲۱: الترمذی، کتاب الایمان، حدیث ۲۶۰۹، ۲۶۰۱: النسائی، کتاب المحاربہ، حدیث ۳۹۸۳: ابوداؤد، ۲/۱۹۸۔ کتاب الزکوۃ، باب ۱، حدیث ۱۵۵۶، جامع الصغیر میں ہے کہ اس حدیث کو ایک بڑی جماعت نے روایت کیا، اس کی حیثیت حدیث متواتر کی ہے۔

اس بنا پر کہ بہت سے صحابہ کرام خصوصاً مانعین زکواۃ کے ساتھ جنگ کے قائل نہ تھے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر اعلان کیا:

وَاللّٰهِ لَاُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلٰوةِ وَالزَّكَاةِ وَلَوْ مَنَعُوْنِيْ عِنَاقًا كَانُوْا يُؤَدُّوْنَهَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلٰى مَنْعِهَا (۳۴)

اللہ کی قسم جو شخص نماز اور زکواۃ میں فرق کرے گا تو میں اس سے لڑوں گا حتیٰ کہ اگر کسی شخص نے ایک ''اونٹ کا بچہ'' بھی ادا نہ کیا جسے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دیتا تھا تو میں اس سے اس کے روکنے پر بھی جنگ کروں گا۔

بعدازاں تمام صحابہ کرامؓ حضرت ابوبکرؓ کے اس فیصلے سے متفق ہو گئے، یوں یہ فیصلہ بھی اجماعی فیصلہ ہو گیا۔

حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو خط لکھا اور اس میں تحریر کیا:

وقس المامور عندذالک (۳۵)

ترجمہ: اسی طرح معاملات کو قیاس کرو۔

اسی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

لقد اتی علینا زمان ولسنا نقضی ولسنا ھناک فمن عرض لہ قضاء فلیقض بما فی کتاب اللہ تعالیٰ وان لم یکن فی کتاب اللہ تعالیٰ فبسنۃ رسول اللہ ﷺ فان لم تکن فی سنۃ رسول اللہ ﷺ فلیجتھد برایۃ۔ (۳۶)

ترجمہ: ہم پر ایسا دور آ چکا ہے کہ ہم فیصلہ نہ کرتے تھے اور نہ ہی ہم اس کے اہل تھے، لہذا جس شخص کو کوئی فیصلہ کرنا پڑے تو وہ اس کے مطابق فیصلہ کرلے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے اور اگر وہ مسئلہ اللہ کی کتاب میں موجود نہ ہو، تو پھر اس حکم کے مطابق فیصلہ کرلے جو اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی سنت مبارک میں ہے۔ اور اگر رسول اکرم ﷺ کی سنت میں بھی وہ حکم نہ ملے تو پھر وہ اپنی رائے سے اجتہاد کرے۔

اس بحث سے درج ذیل امور کا اثبات ہوتا ہے:

۱۔ اجتہاد اسلام کی عظمت، اس کی آفاقیت اور عالمگیریت کے پہلوؤں کا عملی اظہار ہے۔

۲۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے ادوار میں اجتہاد پر عمل ہوتا رہا۔

۳۔ اجتہاد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور امت کے بزرگوں کی سنت ہے۔

عہد نبویؐ اور زمانہ ہائے مابعد میں اجتہاد کا منہج واسلوب، آداب، حدود وشرائط اور اس کے جواز کی بنیادیں بھی بیان کردی گئی ہیں کہ اجتہاد کیا چیز ہے اور کیا محض آزادانہ رائے ہے۔ گویا وہ سانچہ تیار کر کے دے دیا گیا ہے جس میں ڈھلنے والی چیز کو ہی ہم اجتہاد کہیں گے اور اس سانچے کے علاوہ کسی اور ساخت پر وجود میں آنے والی شے کو اجتہاد کے علاوہ کچھ اور کہیں گے اجتہاد نہیں کہیں گے۔

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں فکری آزادی موجود ہے لیکن یہ آزادی قرآن وسنت اور اجماع امت کے دائرے کے اندر ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ فکری ارتقاء پر جس قدر اسلام زور دیتا ہے اس کی

---

۳۴) ابوداؤد، ۲/۱۹۸، کتاب الزکاۃ، باب ا، حدیث ۱۵۵۶ نیز دیکھیے حاشیہ ۳۵

۳۵) احمد بن حنبل، مسند احمد (مسند ابوموسیٰ الاشعری)

۳۶) احمد بن حنبل، مسند احمد (مسند عبداللہ بن مسعود)

مثال کوئی اور مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اجتہاد کی عظمت و اہمیت سے انکار نہیں کیا سکتا۔

۳۔ اجتہاد کی صورتیں اوران کے احکام

نامور حنفی فقیہ علامہ الجصاص رازی نے اجتہاد کی درج ذیل تین صورتیں بیان کی ہیں:

ا۔القیاس الشرعی

ان کے نزدیک اجتہاد کی پہلی صورت ''شرعی قیاس'' پر مشتمل ہے۔ جس سے مراد قرآن وسنت میں موجود حکم سے علت کا استنباط یا علت کی صراحت کی بنیاد پر کسی فرع کو اصل (شرعی حکم) کی طرف لوٹانا اور دونوں پر ان کے اندر موجود مشترک علت یا مفہوم کی بنا پر ایک ہی جامع حکم لگانا ہے۔ (۳۷)

۲۔فرع کو اصل کی طرف لوٹانا

دوسری صورت ایسے اجتہاد کی ہے، جو علت کے بغیر ظنی طور پر معلوم ہو اور اس کی بنا پر فرع کو اصل صورت پر قیاس کرنا ضروری ہو، جیسے کہ ان لوگوں کے لیے، جو بیت اللہ شریف سے دور ہوں، قبلہ کے تعین کے لیے غور وفکر (تحری) کرنا ہے'' یا جیسے کہ تلف ہونے والی شے کی قیمت کا تخمینہ لگانا یا احرام کی حالت میں شکار کے بدلے کا تعین کرنا ہے۔ اجتہاد کی ان تمام صورتوں میں علت کے بغیر محض ظنی حکم والی فرع کو اصل پر لوٹا دیا جاتا ہے۔

۳۔الاستدلال بالاصول

علامہ الجصاص رازیؒ کے نزدیک اجتہاد کی تیسری صورت ''اصول سے استدلال'' کرنا ہے۔ اس صورت کا اطلاق حقیقی اور شرعی باتوں سے استدلال پر بھی کیا جاتا ہے۔ (۳۸)

جبکہ عصر حاضر کے فقہائے کرام نے اجتہاد کو درج ذیل صورتوں میں تقسیم کیا ہے:

ا۔اجتهاد فی تفسیر النص وبیان معناه (کسی نص (صریح حکم) کی تشریح اوراس کے معانی کا بیان):

اس سے مراد کسی شرعی حکم میں شامل کس حکم یا قضیہ (مسئلہ) پر غور وفکر کر کے اسے بیان کرنا ہے، یہ ایسے احکام پر مشتمل ہوتا ہے، جن احکام کا اس نص کے تحت داخل ہونا، نص کے الفاظ پر غور وفکر کے بعد واضح ہوتا ہو۔

اجتہاد کی یہ قسم عربی زبان اوراس کے الفاظ کی گہری معرفت پر موقوف ہے۔ (۳۹)

۲۔ اجتهاد فی قضیة لا نص فیه (ایسے واقعے یا قضیہ میں اجتہاد کرنا جس میں کوئی نص موجود نہ ہو):

اس سے مراد یہ ہے کہ کسی ایسے مسئلے یا معاملے کا حکم دریافت کیا جائے، جس کے متعلق شریعت میں کوئی شرعی حکم (نص) موجود نہ ہو۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ کسی ایسے حکم پر اس مسئلے کو قیاس کیا جائے کہ جن دونوں میں مشترکہ علت موجود ہو۔ ان میں سے دوسرا مسئلہ پہلے مسئلہ کے تحت داخل نہیں ہے، لیکن یہ دوسرا مسئلہ پہلے واقعہ کے مماثل ہے، چنانچہ یہ دوسری صورت پہلی صورت کے مشابہ ہونے کی بنا پر، اس نص کے تحت داخل شمار تصور کی جائے گی، اجتہاد کی یہی صورت اصل اجتہاد ہے۔ (۴۰)

---

۳۷) الجصاص رازی، الفصول فی الاصول، ص ۵۸۔۵۹

۳۸) ایضاً، ص ۵۸، ۵۹

۳۹) حسین حامد، المدخل لدراسة الفقه، ص ۲۹

۴۰) ایضاً ۲۹

۳۔ کسی ایسے مسئلے کا حکم دریافت کرنا جو نہ تو نص (شرعی) حکم کے تحت داخل ہو اور نہ ہی وہ کسی ایسے حکم کے مشابہ ہو، جس کا ذکر نص میں موجود ہے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو وہی حکم دیا جائے۔ جو قواعد کلیہ اور مبادی عامہ کے تحت اس کا ہوسکتا ہے اور اس میں کوئی ایسی مصلحت پائی جاتی ہو کہ جس مصلحت کو مکمل کرنے کے لیے شریعت زور دیتی ہو، لہٰذا یہ دوسرا واقعہ اس کی توضیح وتشریح اور اس کے معانی کی وضاحت کے ساتھ اس سابقہ حکم کے تحت داخل تصور ہو اور نہ ہی اسے کسی ایسے واقعے پر قیاس کرنا ممکن ہو، جس کے متعلق شرعی حکم آیا ہے۔ لہٰذا فقیہ اسے کوئی ایسا حکم دے گا جو شریعت کے عام مقاصد اور مصالح کلیہ کے تحت اسے دیا جاسکتا ہو۔ اس کی واضح مثال حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں پیش آنے والا یہ واقعہ ہے کہ ان کے دور میں ایک گاؤں کے لوگوں نے مل کر ایک شخص کو قتل کر دیا۔ چونکہ یہ صورت ''النفس بالنفس'' (جان کے بدلے جان) (۴۱) کے قرآنی حکم کے تحت داخل نہ ہوسکتی تھی، اس لیے کہ یہاں ''جان'' کو تلف کرنے والے ایک سے زیادہ لوگ تھے۔ لہٰذا حضرت عمر فاروقؓ نے اس مسئلے میں شریعت کے مقاصد اور اس کی مصالح کے تحت اجتہاد کیا۔ اور انہوں نے یہ دیکھا کہ شریعت کا اصل مقصد جان کی حفاظت اور اسے ضائع ہونے سے بچانا ہے اور اگر ایک سے زیادہ قاتل ہونے کی صورت میں انہیں قصاص سے مستثنیٰ کیا جانے لگا تو ایسی صورت میں شریعت کا اصل مقصد اور اس حکم کی مصلحت از خود ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ایک شخص کو اگر ایک بستی کے لوگ مل کر قتل کریں تو ان سب کو اس کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا اور یہ حکم انہوں نے شریعت کے مقاصد اور اس کی مصالح کو سامنے رکھ کر اخذ کیا (۴۲)۔

اسلامی ریاست میں اجتہاد کو قانون کا مرتبہ کس طرح حاصل ہوگا

بادی النظر میں اس کا آسان طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے تمام مکاتب فکر کے صاحب الرائے (یعنی ملکہ استنباط رکھنے والے) چند اعلام کی حکومتی سطح پر ایک کمیٹی تشکیل دی جائے اور وہ تمام نئے پیش آمدہ مسائل پر آزادانہ فضا میں مکمل غور وفکر کریں اور جس نتیجہ پر پہنچیں اس کی سفارش حکومت کو پیش کریں۔ اور حکومت اپنے خصوصی اختیارات کی بنا پر اسے قانون کا درجہ دے کر نافذ کر لے۔

واللّٰہ سبحانہ ولی التوفیق و بیدہ زمۃ التحقیق و ما علینا الا البلغ۔

ان تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ جس چیز کو اجتہاد کہا جاتا ہے وہ محض غور وفکر نہیں بلکہ وہ علمی ودینی شرائط سے مشروط ہے کسی ادارے یا پارلیمنٹ میں بیٹھ کر مطلق غور وفکر اور اجتہاد میں نمایاں فرق ہے۔

---

(۴۱) القرآن الکریم، المائدہ، (۴۵/۵)

(۴۲) حسین حماد، ص ۳۰،۲۹

فصل دوم:

مجتہد کی اوصاف وشرائط

اجتہاد کی اہمیت اور شریعت میں اس کے مقام ومرتبہ کی مذکورہ بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ...... اجتہاد دراصل قرآن سنت کے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے ذریعے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا معلوم کرنے کا نام ہے، جس کے لیے...... قرآن وسنت کے وسیع علم اور اس کے گہرے مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے اجتہاد کرنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے.

اس سے...... مغربی قانون سازی اور اسلامی قانون سازی کے طریق کار میں فرق کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے، مغرب میں قانون (Law) کی کوئی بنیاد اور اساس مقرر نہیں ہے، اسی لیے وہاں قانون سازی عوامی رائے، لوگوں کی ضرورت اور علاقائی رسم ورواج کے تابع ہوتی ہے۔ اور وقتاً فوقتاً اس میں تبدیلی اور ترمیم وتنسیخ کا عمل جاری رہتا ہے، جب کہ اسلام میں، اس کے برعکس قانون اور شریعت (اسلامک لاء) میں فقہ (لاء) کی دو مضبوط اور مستحکم بنیادیں مہیا کی گئی ہیں، اسی لیے...... اسلامی قانون اور شریعت...... لوگوں کی رائے بدلنے سے نہیں بدلتے، بلکہ اس کی تبدیلی...... کچھ مقررہ قواعد اور شرائط کے تابع ہوتی ہے اسی بنا پر فقہاء نے...... مجتہد کے لیے...... متعدد شرائط اور اوصاف ضروری قرار دیئے ہیں اور یہی شرائط واوصاف ہی مجتہد کے لیے قانون کی اساس سمجھی جاتی ہے۔

(الف) مجتہد کی علمی استعداد:

جو لوگ اجتہاد کے منصب عالیہ پر فائز رہے ہیں اور جنہوں نے مسلمانوں کے فقہی، عائلی اور معاشی مسائل میں قانون سازی کر کے ان کی علمی اور فکری رہنمائی کی ہے۔ یہ لوگ علمی، فکری اور اخلاقی طور پر بھی اعلیٰ ترین مقام ومرتبے پر فائز تھے، جس کی بنا پر ان کے اجتہادات اسلامی دنیا میں مقبول ہوئے، اور بعد کے لوگوں نے ان کے اجتہادات کو دلیل کے طور پر تسلیم کیا...... اس کی مزید تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ علمی معیار

اجتہاد چونکہ ایک مقدس اور متبرک کام ہے، اور اس کی ساخت میں کمال درجے کی محنت اور جدوجہد کا مفہوم شامل ہے جس کی بنا پر فقہاء نے مجتہد کے لیے ایک علمی معیار مقرر کیا ہے اور جو شخص اس مرتبے اور اس درجے پر فائز نہ ہوا سے اجتہاد کرنے کا حق نہیں دیا گیا، قرآن کریم میں اس حوالے سے، اہل علم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ ارشاد ہے:

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ(۱)

''سو پوچھ لو اہل علم سے، اگر تم نہیں جانتے''

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ

---

۱) القرآن الکریم الانبیاء (۲۱: ۷) النحل، ایضا

الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ (۲)

اور اگر ان کے پاس امن یا جنگ کا کوئی معاملہ آتا ہے، تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں، اور اگر وہ اس بات کو ''اہل معاملہ...... '' کی طرف لوٹا دیتے تو وہ اس سے مستنبط ہونے والی بات کو جان لیتے۔

سورۃ البقرۃ میں علم کو ملائکہ پر انسان کی فضیلت کا ایک سبب قرار دیا ہے۔

عَلَّمَ اٰدَمَ لَا سْمَآءَ کُلَّھَا۔

میں انسان کے فضائل میں علم کو شامل کر کے اللہ تعالیٰ نے دریا کوزے میں بند کر دیا ہے اور اب انسان سے کہہ دیا ہے کہ وہ شرف انسانی کے کمالات علم کی بنیاد پر حاصل کرے۔ اس آیت مبارکہ کو اگر ہم اوپر بیان شدہ سورۃ النحل کی آیت نمبر 43 کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے مختلف مسائل و معاملات کے حل کے لیے ایسے ارباب علم و فضل کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی ہے، جو علم و فضل کے ایک خاص معیار اور خاص درجے پر ہوں، چنانچہ قرن اولی اور ہر دور میں مسلمانوں میں ایسا طبقہ موجود رہا ہے جو اہل علم لوگوں پر مشتمل تھا، اور عام مسلمانوں نے اگر کوئی مسئلہ پوچھنا ہوتا تو وہ ان اہل علم ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، قرآن کریم کے مطابق...... یہ اہل علم...... علمی اور فکری طور پر ایسے مرتبے اور ایسے درجے پر فائز ہونے چاہئیں کہ وہ مختلف موقعوں پر سنی جانے اور پہنچائی جانے والی باتوں کا صحیح مفہوم اخذ کر سکیں اور مسائل و معاملات کو صحیح تناظر میں دیکھ اور رکھ سکیں اور ان سے جو ٹھیک ٹھیک اور صحیح صحیح مفہوم نکلتا ہو، نکال سکیں۔

اسی طرح اگر حکومت اور عوام میں کوئی جھگڑا اور تنازعہ ہو تو یہ اہل علم کا ہی فرض ہے کہ وہ اس معاملے کو قرآن و حدیث کے تناظر میں دیکھ کر یہ بتا سکیں کہ اس میں درست سمت کیا ہے اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

مزید براں قرآن کریم اس بات کی بھی صراحت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک علم والے اور بے علم لوگ برابر نہیں ہیں...... فرمایا:

قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ(۳)

(اے پیغمبر) کہہ دیجئے، کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں۔

جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اہل علم کا درجہ اور رتبہ بہت اونچا ہے۔ وہی مسلم معاشرے کی روح رواں ہیں۔ احکام اسلامی کا اخذ و استنباط بھی انہی کو زیب دیتا ہے، اور وہی معاشرے کی زمام اقتدار سنبھالنے کے زیادہ اہل ہیں۔

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو جو مختلف مناصب اور عہدے عطا فرمائے۔ خصوصاً...... جن بزرگوں کو منصب قضا پر فائز کیا اور انہیں مسائل و فروع حل کرنے کے لیے اجتہاد کے طریقے اور اسلوب اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی، ایسے تمام بزرگ بھی اعلیٰ ترین علمی اور فکری مرتبے پر فائز تھے اور یہ تمام لوگ اپنی علمی اور فکری لیاقت کی بنا پر واقعی اس کے اہل تھے، کہ وہ مختلف قسم کے مسائل کو حل کر سکیں، پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ انہیں، اجتہاد کرنے کا سلیقہ بھی حاصل تھا۔

پھر قرآن و سنت کی نصوص میں اگرچہ علمی اور فکری رتبے کی صراحت نہیں ہے، لیکن یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ ان میں قرآن و سنۃ کی نصوص کو سمجھنے اور ان پر غور و فکر کرنے کی اہلیت ہونی چاہئے۔ فقہائے کرام نے انہی نصوص کو پیش نظر رکھتے ہوئے

---

۲) ایضاً النساء، ۴/۸۳

۳) الزمر (۳۹/۹)۔

......مجتہد کے لیے ایسی علمی اور فکری شرائط کی متعین کی ہیں، جس سے ایک علمی اور فکری سطح کا تعین ہوتا ہے۔ تفصیل آئندہ فصل کے تحت آ چکی ہے۔

اجتہاد کب کیا جائے گا۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں ایسے مفکرین بھی رہے ہیں جنھوں نے مسائل کے حل کے لئے براہِ راست کتاب و سنت کی طرف رجوع کیا اور شخصی تقلید کی سخت مخالفت کی۔ ابن حزمؒ فقہ، ظاہری کے اہم ستون ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی بھی شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی گزرے ہوئے یا موجودہ شخص کی تقلید کرے، ہر آدمی کو اپنی طاقت کی حد تک اجتہاد کرنا چاہیے۔ اگر وہ بالکل جاہل ہے تو اسے ایسے مقام پر کسی ایسے شخص سے جو دین کا سب سے زیادہ علم رکھتا ہو، مسئلہ معلوم کرنا چاہیے۔ جب وہ فتویٰ دے تو اس سے دریافت کرنا چاہیے کہ کیا اللہ اور رسول ﷺ کا یہی حکم ہے؟ اگر وہ اثبات میں جواب دے تو اسے اختیار کرے اور اس کے مطابق عمل کرے، لیکن اگر اس کا جواب یہ ہو کہ یہ میری رائے یا میرا قیاس ہے، یا یہ کہ وہ کسی صحابی، تابعی یا قدیم اور جدید کسی فقہ کا حوالہ دے یا خاموشی اختیار کر لے یا سرزنش کرنے لگے تو اس کے لیے اس کے قول کو اختیار کرنا جائز نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں اسے کسی دوسرے کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔(۴)

ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ جب کوئی نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو اور اس بات کا اندیشہ پیدا ہو جائے کہ اجتہاد کے ذریعے صحیح راہ نہ دکھائے جانے پر لوگ شریعت سے ہٹ جائیں گے، تو مجتہدین پر اجتہاد واجب ہے۔ اگر وہ اس مسئلے کو حل نہ بھی کر سکیں تو کوشش اور جدوجہد کرنا ان کے لیے ضروری ہے۔(۵)

حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ گورنر عراق کو مختلف مواقع پر خطوط لکھے تھے۔ ان میں ایک بڑا اہم خط قضا اور فیصلے سے متعلق ہے۔ اسے ابو عبید نے کتاب الاموال میں نقل کیا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں: **الفهم الفهم نى ما ادلى اليك نما ورد عليك مما ليس فى قرآن ولا سنة ، ثم قاليس الأ مور عند ذلك واعرف الامثا ل ، ثم اعمد فى ماترىٰ اجها الى الله و اشبها الى الحق،** یعنی جو چیز کتاب و سنت میں نہ ہو، اس پر خوب غور کرو۔ چیزوں کو ایک دوسرے پر قیاس کرو، مثالوں کو سمجھو، پھر اللہ اور رسول ﷺ کے نزدیک جو چیز پسندیدہ اور حق سے مشابہت رکھے اُسے اختیار کرو۔(۶)

آئمہ کرام میں سے ہر ایک نے صراحت کی ہے کہ جب کوئی مسئلہ کتاب و سنت میں مل جائے تو رائے اور قیاس کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ فقہ حنفی، قیاس اور اجتہاد میں ممتاز ہے، اس نے اس میدان میں بے نظیر خدمت انجام دی ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ نے صراحت کے ساتھ اور بار بار کہا ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ میں جب کوئی حکم مل جاتا ہے تو ہم فتویٰ اسی کے مطابق دیتے ہیں، اجتہاد تو اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان میں صراحت نہ ہو۔(۷)

اسی طرح وہ لوگ قرآن و سنت پر بھی گہری نظر رکھتے ہوں۔ نیز وہ اس طریقے اور اسلوب سے بھی واقف ہوں، جس طریقے اور اسلوب سے، قرآن و حدیث کی مدد سے، جدید احکام کا استنباط کیا جاتا ہے۔

---

۴) کتاب ''تحقیقات اسلامی'' باب ''باب شریعت میں اجتہاد کا عمل'' (صفحہ نمبر ۲۰)
۵) کتاب ''تحقیقات اسلامی'' باب ''شریعت میں اجتہاد کا عمل'' (صفحہ نمبر ۲۲)
۶) ایضاً، (صفحہ نمبر ۲۵)
۷) ایضاً

اس بنا پر التھانوی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ صرف ایسا اجتہاد ہی معتبر ہوگا جو اجتہاد کے لائق اور اہل شخص یعنی کسی ماہر فقیہ (مجتہد) نے کیا ہو۔ ایک کم نظر یا کوتاہ نظر (مقصر) کے ایسے عمل کو کسی طرح بھی اجتہاد نہیں کہا جا سکتا۔

دنیا میں یہ قاعدہ اور دستور ہے کہ مقصد جتنا بڑا اور جتنا عظیم ہو، اس کے مطابق علم وفضل اور ہمت وکوشش اور سعی ومحنت کی ضرورت ہوتی ہے......اگر مقصد عام درجے کا ہو، تو اس کے لیے علمی لیاقت اور محنت بھی اسی درجے اور اسی سطح کی درکار ہوگی اور اگر مقصد بڑا ہو تو اس کے لیے......اسی کے مطابق علمی اور فکری مہارت اور محنت وکوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔

سابقہ سطور سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ چونکہ اجتہاد......ایک اہم ترین دینی اور شرعی فریضہ ہے جسے انجام دینا امت کی اجتماعی ضرورت ہے۔ اسی بنا پر......ابتدائی دنوں سے ہی......مجتہد کی شرائط واوصاف پر خصوصی طور پر زور دیا جا رہا ہے۔ امام ابو اسحاق الشاطبیؒ صاحب الموافقات لکھتے ہیں:

انما يتحصل درجة الاجتهاد لمن اتصف بوجهين احدهما فهم مقاصد الشريعة على كمالها والثانى التمكن من الاستنباط على فهمه فيها(٨)

یعنی اجتھاد کا مقام اور رتبہ صرف اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو درج ذیل دو اوصاف سے متصف ہو:

۱۔ یہ کہ وہ شریعت کے مقاصد سے پوری طرح آگاہ ہو۔

۲۔ مقاصد شریعت کو پوری طرح سمجھنے کے ساتھ ساتھ وہ استنباط احکام کا طریقہ کار بھی جانتا ہو......

اسی طرح امام ابو حامد الغزالیؒ لکھتے ہیں

''اجتہاد کی دو شرائط ہیں یہ کہ (1) متعلقہ شخص شریعت کے مدارک وذرائع (معلومات/ مآخذ ومصادر) کا علمی طور پر احاطہ رکھتا ہو اور وہ ایسے مقام اور ایسے درجے پر متمکن ہو کہ ان پر غور وفکر کے ذریعے گمان کے درجے میں رائے معلوم کر سکتا ہو، اور جسے مقدم کرنا چاہے اُسے مقدم اور جسے مؤخر کرنا چاہئے اسے مؤخر کر سکتا ہو۔ (2) یہ کہ وہ عادل ہو، یعنی ایسے گناہوں سے اجتناب برتنے والا ہو، جو اس کی ذاتی عدالت کو متاثر کر سکتے ہیں، یہ بات اس کے فتویٰ پر اعتماد کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے کہ جو شخص عادل نہیں ہوگا اس کا فتویٰ بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ البتہ فی نفسہٖ...... یہ شرط ضروری نہیں۔ لہٰذا عدالت کا ہونا قبول فتویٰ کے لیے ضروری ہے صحت اجتہاد کی شرط نہیں ہے۔ (۹)

آگے چل کر امام الغزالیؒ نے ''مدارک الاحکام'' (احکام معلوم کرنے کے ذرائع) کی تفصیل بیان کرتے ہوئے......اس کی تشریح چار مآخذ (کتاب وسنۃ، اجماع اور عقل) سے کی ہے......اور یہ لکھا ہے کہ ان سے فائدہ لینے یعنی استنباط احکام......چار علوم کے ساتھ مکمل ہوتا ہے......جن میں سے دو تمہیدی اور دو اُسے مکمل کرنے والے ہیں اور چار علوم درمیان میں ہیں، یعنی وہ اس کے بنیادی ارکان ہیں......یہ کل آٹھ علوم ہیں، امام لکھتے ہیں۔

قرآن وحدیث سے عقل سے جو حکم کی علت معلوم ہو یا اجتہاد سے معلوم کر سکے تو اس کے عموم سے حکم کا عموم ووسعت معلوم کرنا یہ سب اجتہاد ہے جیسے وللمطلقات يتربصن بانفسهن ثلثة قروء (اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے کو روکے رکھیں تین قروء تک) میں قروء قرء کی جمع ہے۔ قرء حیض کو بھی کہتے ہیں اور طہر کو بھی۔ یہاں کیا مراد ہے اس لیے یہ دیکھنا کہ

---

٨) الشاطبی الموافقات ۱۰۵/۳_۱۰۶

٩) الغزالی محمد بن حامد المستصفی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۷۰/۲

جب ثلثۃ (تین) فرمایا تو چونکہ طلاق حیض میں دینا منع ہے تو اب اگر اس سے طہر مراد لی جائے تو چونکہ جیسے حدیث میں ہے طہر میں ہی جائز ہوتی ہے تو اگر اس طہر کو شمار کریں تو تین سے کم بنتی ہیں اس کو شمار نہ کریں تو تین سے زائد بنتی ہیں اور قرآن کے لفظ ثلثہ پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تین حیض مراد قرار دی جائے گی۔ یہ اور ایسی کوشش سب اجتہادی تو ہیں۔

حدیث کا قرآن شریف سے وہی تعلق ہے جو شرح کو متن سے ہوتا ہے۔ آیت ان علینا بیانہ، (پھر۔۔۔ بیشک۔۔۔۔ ہمارے ذمہ ہے اس قرآن کا بیان) اور لتبینہ للناس (تاکہ آپ قرآنی احکام کو لوگوں سے بیان کردیں) یہ آپ کے فرائض منصبی میں ہے اور جگہ جگہ آیا ہے و یعلمھم الکتاب (اور وہ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیتے ہیں) اس سے ثابت ہے کہ احادیث قرآں کا ہی بیان بلکہ اجمال کی تفصیلات اور کلیات کی جزئیات، عام کا خاص، مطلق کا مقید ہے۔ یہ سب قرآن کا بیان ہے۔ امام شعرانی نے میزان کے مقدمے میں امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ کوئی حدیث ایسی نہیں کہ میری نظر میں اس کا مآخذ قرآن مجید میں نہ ہو۔

جہاں تک کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کا تعلق ہے، تو وہ تو (اجتھاد کی) اصل یعنی بنیاد اور اساس ہے، لہٰذا اس کی معرفت بے حد ضروری ہے اور ہم اسے آسانی کے لیے دو باتوں کے تحت بیان کر سکتے ہیں۔

اول یہ کہ پورے قرآن مجید کا علم ضروری نہیں ہے، بلکہ محض ان آیات کا علم ضروری ہے، جو احکام سے متعلق ہیں اور ان کی کل تعداد پانچ سو آیات ہے۔

دوم ان تمام آیات کو حفظ کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ یہ بات ضروری ہے کہ وہ ان کے مقامات سے اس طرح واقف ہو کہ بوقت ضرورت مطلوبہ آیت کو تلاش کر سکے، جہاں تک دوسرے مآخذ یعنی سنت نبوی (السنۃ) کا تعلق ہے.....تو یہاں بھی (صرف) ایسی احادیث کا جاننا ضروری ہے جو احکام سے متعلق ہیں،..... یہ ایسی احادیث اگرچہ ہزاروں میں ہیں، مگر بہر حال محدود تعداد میں ہیں.....اور ان احادیث کے متعلق بھی مذکورہ بالا دونوں رعایتیں (تخفیفات) ہیں، اس لیے کہ اس کے لیے مواعظ اور آخرت کے احکام سے متعلق احادیث کا علم ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح..... دوسری رعایت یعنی ان تمام احادیث کو زبانی حفظ کرنا لازمی نہیں ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسی (اصل) کتاب یا مجموعہ احادیث موجود ہو، جو احکام سے متعلق احادیث پر مشتمل ہو، جیسے سنن ابی داؤد، معرفۃ السنن لابی بکر البیہقی وغیرہ۔

جہاں تک تیسرے مآخذ اجماع کا تعلق ہے تو اس بارے میں یہ بات ضروری ہے کہ اسے "مواقع اجماع" کا علم ہو، تاکہ اس کی طرف سے اجماع امت کے خلاف فتوئی دینا لازم نہ آئے۔ جس طرح اس کے لیے تمام شرعی نصوص کا علم ضروری ہے۔ تاکہ شرعی نصوص کے خلاف.....اس کی طرف سے فتوی دینا لازم نہ آئے۔ اس بارے میں تخفیف و رعایت یہ ہے کہ اس کے لیے تمام مسائل میں اجماع اور اختلاف کے مواقع کا علم ضروری نہیں ہے، بلکہ صرف ان مسائل میں یہ علم ضروری ہے، جن مسائل میں وہ فتوی دینا چاہتا ہو، یہ کہ اس کا فتوئی مواقع اجماع کے خلاف نہیں ہے۔

جہاں تک تیسرے مآخذ (یا ذریعہ علم) عقل (سمجھ) کا تعلق ہے، تو ہماری اس سے مراد احکام کے لیے "اصل نفی" کی کوئی مستند دلیل موجود ہو، اس لیے کہ بعض اوقات اقوال و افعال میں، نفی حرج پر دلالت کرتی ہے، اور اکثر صورتوں میں اس سے احکام کی نفی پر دلالت ہوتی ہے، اور وہ صورتیں جنھیں شریعت نے مستثنیٰ کیا ہے۔ وہ چند ایک (محدود) ہیں، اگرچہ وہ کافی ہیں، لہٰذا یہ بات

ضروری ہے کہ وہ ہر واقعے یا مسئلے میں نفی اصلی اور برأت اصلی کی طرف رجوع کرے (۱۰)

کم سے کم یہ تیس ۳۰ شرطیں ضروری ہیں: (۱) مسلمان (۲) عاقل جو دیونہ نہ ہو (۳) بالغ ہو (۴) علم دین کا ماہر (۵) فقیہہ (شرح مسلّم الثبوت میں ہے جو فقہ کے ابتدائی مسئلوں کا ماہر کہ دلائل سے اُن کو اخذ کر سکتا ہو۔ (۶) ایک لفظ فقیہ کے اندر پانچ شرطیں جمع ہیں کہ فقیہ مسلمان عاقل بالغ عالم دین اور متقی ہو اور ایک حدیث سے فقیہہ ہونا معلوم ہو کر آٹھ شرطیں اس سے ثابت ہیں۔

عن ابن مسعودؓ قال رسول اللهﷺ نضر الله عبد اسمع مقالتي فحفظها و وعاها ادا ها فرب حامل غير فقه ورب حامل فقه الى من هوافقه منه الحديث رواه الشافعي والبيهقي في المدخر ورواه احمد والترمذی و ابوداؤ دوابن ماجة والدارمي عن زيد ابن ثابت۔(مشكوة)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا تروتازہ فرمائیں اللہ تعالیٰ اس بندہ کو جو میری حدیث سنے اور اس کو یاد کرے اور دوسروں کو پہنچادے کیونکہ بعض علم پہنچانے والے خود سمجھدار نہیں ہوئے اور بعض ایسوں کو پہنچاتے ہیں جوان سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں یعنی فقیہہ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض حدیثیں لانے فقیہہ نہیں اِسلئے صرف یاد کر لینا جمع کر لینا اور لکھ دینا مجتہد ہونا نہیں ہوتا۔ اور بعض اپنے سے زائد سمجھ والے کو پہنچاتے ہیں، وہ دین کی سمجھ والا ہی تو فقیہہ ہے اس لئے یہ حدیث پانچ شرطوں کی جامع ہے اور یقنی ثبوت والے کام کا ظنی ثبوت والے سے ثابت نہ ہونا سب جانتے ہیں۔

(۹) توضیح تلویح میں یہ بھی شرط ہے کہ قرآن مجید کی ہر ہر آیت کو اس کے لغوی معنی سے اس طرح جانتا پہچانتا ہو کہ مفردات کے یہ معنے ہیں مرکبات کے یہ اور ان کے حکم کا فائدہ دینا ان کا تفاوت معلوم ہو (۱۰) علم صرف خوب جانتا ہو (جس سے لفظوں کے ردوبدل ہونے سے معنے کے۔۔۔۔۔ بدل جانے کا علم ہو) (۱۱) لغت کے ردوبدل اور اس سے معنے کے ردوبدل سے خوب واقف ہو۔ (۱۲) علم نحو سے واقف ہو (جس سے ہر لفظ کا دوسرے سے جوڑ معلوم ہو کر معانی کا فرق معلوم ہو سکے (۱۳) علم معانی و بیان خوب جانتا ہو جس سے مقدم موٴخر حذف اور ذکر وغیرہ تمام حالات کی عمدگی اور فوائد معلوم ہو سکیں (۱۴) قرآن وحدیث کے ہر ہر نقط کے شرعی معنے معلوم ہوں۔ مثلاً یہ کہ یہاں صلوٰۃ کے لغوی معنے دعا کے بلکہ یہ فرائض واجبات سنن مستحبات کے مجموعہ کا نام ہے ایسے ہی تمام لفظوں کے معنے معلوم ہوں ورنہ مراد الٰہی سے دُور نکل جانا ہوگا (۱۵) ان معنوں کو بھی پہچانتا ہو جن کا احکام کی تعیین وضاحت پر اثر پڑتا ہو جیسے مِنَ الْغَائِطِ (پست زمین سے) میں کس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے میں حدث یعنی بے وضو ہونے کے معنے ہیں کہ آئندہ حکم اسکے ہیں (۱۶) آیات واحادیث کے الفاظ ومعنیٰ مرکبات کے اقسام عبارۃ النص اشارۃ دلالۃ النص اقتضاء النص مفردات کے اقسام خاص عام مشترک مجمل مفسر وغیرہ جو جو امور اصول فقہ میں مذکور ہیں ذہن میں حاضر ہوں (۱۷) ناسخ منسوخ کا علم ہو کہ کون کون منسوخ ہیں کون نہیں جن پر آیت ماننسخ من آیۃ دلالت کرتی ہے۔

اصول حدیث کا فن ذہن میں ہو خصوصاً اقسام متواترہ مشہور عزیز خبر احادان کی سندیں اور احاد کی سند کے تمام راویوں کے حالات فن اسماء الرجال اُن پر اعتراضات وجوابات، ان کی تقویت وضعف سے واقف ہو۔ لیکن یہ کام طویل ہے اس لئے فقہاء نے احادیث کے معتبر اماموں امام بخاری۔ مسلم۔ بغوی، صنعائی وغیرہ کی تصدیق کو کافی قرار دیا ہے۔ تمام احادیث کے متن خوب پہچانتا ہو۔ مقدم موٴخر ناسخ ومنسوخ سے خوب واقف ہو۔ تمام الفاظ حدیث کے لغوی معنے اور ان کے اثرات۔ شرعی معنے اور اُن کے احکام

(۱۰ المستصفی ۲/۱۷۰۔۱۷۱

الفاظ کے تمام اقسام اور وہ احکام جو اصول فقہ میں درج ہیں اور طریق استدلال کے قواعد، مقبول و مردود اقسام بھی۔ قیاس شرعی نہ کہ عقلی یعنی علت حکم کے متعدی ہونے ہو حکم متعدی ہونے کا طریقہ مسائل شرائط احکام مقبول و مردود وغیرہ کا علم۔ اجماع کا علم کہ اس سے پہلے صحابہؓ علماء کا اجماع تو نہیں ہوا۔ اور جن جن مسائل میں اجماع ہوا ہو۔ ان کے خلاف نہ ہو جائے۔ ان مسائل سے تعلق رکھنے والی تمام آیات و احادیث اور ان کے درجات کا علم تا کہ ان کے خلاف نہ ہو۔ قوت اجتہاد یہ حاصل ہو جو کم وبیش بھی ہو سکتی ہے۔ حضرت ابوجحیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آپ کے پاس کچھ ایسے مضامین لکھے ہوئے ہیں جو اللہ کی کتاب میں نہیں۔ فرمایا: اس ذات کی قسم جس نے دانہ کو شگاف دیا اور جان کو پیدا کیا ہمارے پاس کوئی علم ایسا نہیں ہے۔ ہاں ایک خاص قسم کی سمجھ ضرور ہے جس کو اللہ تعالیٰ قرآن کے میں کسی کسی کو عطا فرما دیتے ہیں۔ (۱۱)

معلوم ہو قوت اجتہاد یہ ایک دائمی علمی عطائی نورانی قوت ہے جس کی وجہ سے اس قوت والی آیات و احادیث کی باریکیاں چھپے ہوئے معانی، باطنی راز اور احکام کی علتوں پر خوب مطلع ہو جاتا ہے کہ دوسروں کی وہاں رسائی نہیں ہوئی۔ حضور ﷺ کے زمانہ سے قریب ہونا جو اس حدیث سے ثابت ہے کہ "سب سے بہتر میرا قرن ہے پھر جو اس سے متصل ہوں اور پھر جو اُن سے متصل ہوں۔ اور پھر جو اس سے متصل ہوں اور پھر جو اُن سے متصل ہوں۔ اور پھر جھوٹ پھیل جائے گا"۔ جنکو یہ نعمت میسر نہ ہو تو اس کے قریب کی کیفیت تو ضروری ہے جو انتہائی تقوئی طہارت سنت کا اتباع عبادات میں انہماک تمام کبیرہ گناہوں سے حفاظت اور ذکر و شغل و مراقبات دل سے عبارت ہے۔ خواہشات نفسانی سے خواہ وہ از خود وارد ہوں یا کسی کافر کے اثر سے ہوں پاک ہو دین کو ان پر حاوی و غالب رکھتا ہو ارشاد باری ہے **ومن اضل ممن اتبع هواه** (اور کون اس سے زیادہ گمراہ ہے وہ اپنی خواہش کا اتباع کرے) اور آجکل کے حالات خصوصاً یورپ کی وبا سے عام آدمی بچا ہوا نہیں کہ اس کے دل پر یہ کھوٹ نہ ہو۔

امام غزالیؒ نے جن چار بنیادی علوم میں مہارت کا ہونا ضروری قرار دیا ہے، ان کی تفصیل درج ذیل ہیں:

شرعی دلائل اور اس کی شرائط کا اس طرح سے تعین اور تقرر کرنا کہ دلائل اور براہین سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکے......اس کی ضرورت تمام مآخذ اربعہ میں پیش آتی ہے۔

دوم: علوم لغت، علم نحو و صرف کا اس طرح علم ہونا کہ اسے عربی خطاب کو سمجھنے میں آسانی ہو، اور یہ بات کتاب و سنت تک مخصوص ہے اور ان دونوں علوم و فنون میں تفصیل ہے اور ان میں تخفیف (رعایت) بھی ہے......اور تثقیل (شدت) بھی ہے (۱۲)

آگے چل کر امام غزالیؒ نے علوم لغت اور صرف و نحو کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ان (علوم) میں اتنی مقدار میں علمی مہارت ضروری ہے کہ وہ عربی خطاب (الفاظ و کلمات) کو سمجھ سکے، اور وہ الفاظ کو استعمال کرنے کے طریقوں سے اس حد تک واقف و آگاہ ہو کہ وہ صریح، ظاہر، مجمل، حقیقت و مجاز، عام و خاص، محکم و متشابہ، مطلق و مقید، نص اور اس کے سیاق و سباق، لحن یعنی غلطی اور اس کے مفہوم وغیرہ کو سمجھ سکے اس میں رعایت یہ ہے کہ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ خلیل اور المعبد کے درجہ کو پہنچ سکے اور نہ ہی اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تمام زبان کو سمجھتا ہو اور نہ ہی یہ کہ وہ علم النحو کی معلومات میں گہرائی رکھتا ہو، بلکہ یہ بات ضروری ہے کہ وہ اتنی مقدار میں ان علوم سے واقفیت رکھتا ہو جو قرآن و سنت سے متعلق ہیں۔ (۱۳)

---

(۱۱) بخاری، ترمذی، نسائی

(۱۲) المستصفی، ۲/۱۷۱

(۱۳) ایضا ۲/۱۷۲

جہاں تک اس کومکمل کرنے والے علوم کا تعلق ہے۔تو وہ دو ہیں:

اول یہ کہ اُسے قرآن وسنت میں ناسخ ومنسوخ کا علم ہو،اور یہ محض آیات اور احادیث سے متعلق ہیں ......

دوم یہ کہ اسے روایات میں صحیح اور فاسد،مقبول اور مردود وغیرہ قسم کی احادیث کا علم ہو،اس لیے کہ ایسی احادیث جنہیں عادل لوگ روایت نہ کرتے ہوں، حجت نہیں ہیں۔اس بارے میں تخفیف (نرمی) یہ ہے کہ ہراس حدیث کے مطابق فتوٰی دیا جاسکتا ہے جسے امت نے قبول کیا ہو،لہٰذا اس کے لیے اس کی سند پر گہری نظر ڈالنا ضروری نہیں ہے،اگر چہ کچھ علماء نے اس کی مخالفت کی ہو،...... اس لیے مناسب یہ ہے کہ وہ روایت کے راویوں اوران کی عدالت کو جانتا ہو،اگر وہ اس کے نزدیک مشہور ہوں،تو وہ ان پر اعتماد کر سکتا ہے۔(۱۴)

علامہ شوکانیؒ نے ......مجتہد کی شرائط واوصاف کی تفصیل ......شرح وبسط کے ساتھ دی ہے،وہ لکھتے ہیں:

فالمجتهد هو الفقيه المستفرغ لوسعهٖ لتحصيل ظن بحكم شرعي ولا بد ان يكون بالغاً عاقلاً قد ثبت له ملكة يقتدر بها علىٰ استخراج الاحكام من مآخذ ها (۱۵)

مجتہد سے مراد ایسا فقیہ ہے جو کسی شرعی حکم کو گمان کے درجے میں پانے کے لیے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر دے،اور یہ بات ضروری ہے کہ وہ ایسا عاقل وبالغ شخص ہو،جس کی طرف سے مآخذ سے،احکام کے استنباط کا ملکہ ظاہر ہو چکا ہو۔

بعد ازاں امام شوکانیؒ نے ......امام الغزالیؒ ہی کی طرح ......مجتہد کے لیے بہت سی شرائط اور اوصاف کا ذکر کیا ہے۔جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ

1۔ وہ کتاب وسنت کا عالم ہو،اور اگر اس کا علم ان میں سے کسی ایک میں کم ہو،تو وہ نہ تو مجتہد ہوگا اور نہ ہی اس کے لیے اجتہاد درست اور جائز ہوسکتا ہے۔

2۔ یہ کہ اسے مواقع اجماع کا علم ہو۔تا کہ وہ کسی ایسے مسئلے کے خلاف فتوٰی نہ دے۔جس پر اجماع ہو چکا ہو۔

3۔ یہ کہ وہ عربی زبان وادب سے اس حد تک واقف ہو،کہ اس کے لیے قرآن وسنت میں وارد ہونے والے نادر اور مشکل الفاظ کو سمجھنا ممکن ہو۔

4۔ یہ کہ وہ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں ......ناسخ ومنسوخ سے بخوبی واقف ہو۔(۱۶)

ان شرائط پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تمام باتیں وہی ہیں جن کا ذکر امام الغزالیؒ نے کیا ہے۔البتہ امام شوکانیؒ کی اہم ترین شرط،یعنی عدالت والی شرط کا ذکر نہیں کیا،جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ بات تمام لوگوں کو معلوم ومتعارف ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) نے،جو اپنے دور کے ہی نہیں،بلکہ آنے والے ادوار کے بھی امام تھے،...... اور فقہ اسلامی میں مجتہد کا درجہ اور مقام رکھتے تھے،مجتہد کی درج ذیل سات شرائط بیان کی ہیں:

''اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن وسنت کے ایسے مسائل سے (اور ایسی آیات واحادیث) سے واقف ہو،جن کا

(۱۴ ایضاً،۲/۴۱۷

(۱۵ الشوکانی،ارشاد الفحول ـــــ ص ۲۲۰

(۱۶ ایضاً ـــ ص ۲۲۰

تعلق احکام سے ہے، نیز اسے مواقع اجماع، شرائط قیاس، کیفیت نظر (یعنی جس طرح غور وفکر کیا جاتا ہے)، عربی زبان وادب، ناسخ ومنسوخ اور راویوں کے حالات کا علم ہو" (۱۷)

ان شرائط کا مقصد یہ ہے کہ اجتہاد کے ذریعے...... مسائل کا جو سرمایہ وجود میں آئے، وہ علمی اور فکری اہمیت رکھتا ہو۔ اور یہ محض کسی کی خام خیالی کا مظہر نہ ہو۔

شاہ ولی اللہ ہی کے ایک ہم عصر الشیخ مولانا محمد اعلیٰ بن علی التھانویؒ (م بعد از ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء) نے بھی اس کے قریب قریب موقف اختیار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

مجتہد کے لیے دو شرائط ضروری ہیں: اول یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا علم اور ان کی معرفت رکھتا ہو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آپ کے تمام معجزات سمیت تصدیق کرتا ہو، اور ان تمام باتوں کو مانتا ہو جن پر ایمان کا علم موقوف ہے...... اسے یہ سب کچھ اجمالی دلائل کے ساتھ معلوم ہوتا ہم اگر وہ ان باتوں کی تفصیل اور ان امور کی تحقیق سے قاصر ہو، جو علم الکلام کے ماہرین کا خاصا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ "وہ احکام کے مدارک (معلوم کرنے کے ذرائع) اور ان کی اقسام سے واقف ہو، وہ ان احکام کے اثبات کے طریقوں اور اس کی دلالتوں کی وجوہ اس کی شرائط کی تفصیلات اور ان کے مراتب و درجات سے واقف ہو"

"نیز دلائل کے تعارض کے وقت ترجیح کی صورتوں کا ادراک رکھتا ہو، اور اجتہادات سے حاصل ہونے والے احکام پر ہونے والے اعتراضات پر غور وفکر کرنے کی اہلیت رکھتا ہو، جس کی بنا پر اسے راویوں کے حالات، جرح وتعدیل کے اصولوں اور طریقوں سے آگاہی ہو"

نیز وہ نصوص کی ان اقسام سے بھی آگاہ ہو، جن کا احکام سے تعلق ہے۔

اور وہ ادبی علوم کی مختلف اقسام، مثلاً علم لغت اور علم صرف ونحو وغیرہ سے واقف ہو...... یہ باتیں مجتہد مطلق کے لیے ضروری ہیں جہاں تک کسی خاص مسئلے میں اجتہاد کا تعلق ہے تو اس کے لیے اس خاص مسئلے سے متعلق باتوں کا علم ہونا چاہئے۔ اور اس کے لیے ان باتوں میں جہالت کا ہونا، جو اس مسئلے سے متعلق نہیں ہیں نقصان دہ نہیں۔ (۱۸)

گویا اجتہاد بڑا نازک کام ہے۔ اس کے لیے ایک طرف ان مسائل کو پوری طرح سمجھنا ہوگا جن کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہے۔ دوسری طرف کتاب وسنت کے وسیع علم اور قیاس اور اجتہاد کے اصول وآداب سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ عربی زبان وادب میں مہارت رکھے اور نہ یہ بات کافی ہے کہ وہ دین کی عام معلومات رکھتا ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان نصوص اور ان کے الفاظ ومعانی پر گہری نظر رکھتا ہو، جن پر اس کے قیاس اور اجتہاد کی بنیاد ہے ساتھ ہی دین کی روح اور اس کے مزاج کو بھی اچھی طرح سمجھے۔

کتاب وسنت کے بعد اس سلسلے میں اس زبردست فقہی ذخیرے سے بھی فائدہ اٹھانا ہوگا جو ہمارے پاس موجود ہے اور جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انسانی فکر کا نتیجہ ہے، اس لیے اس میں خامیاں بھی ہو سکتی ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ ذخیرہ بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے وجود میں آیا ہے اور تحقیق وتنقید کے مختلف مراحل سے گزر کر

---

۱۷) دہلوی، شاہ ولی اللہ محدث، عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، ص ۱۹۹، نیز حجۃ اللہ البالغۃ قاہرہ، ۱/۲، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰/۷۔۔۔

۱۸) التھانوی، محمد بن اعلیٰ، کشاف اصطلاحات الفنون، طبع خیاط، بیروت ۹۹/۱

اس نے ایک خاص شکل اختیار کی ہے۔اس پر جن لوگوں نے اپنی قوتیں اور صلاحتیں صرف کی ہیں، ان کے علم وفہم ،فقہ وبصیرت، تقویٰ اور اخلاص پر امت کو اعتماد رہا ہے۔اسی وجہ سے اس امت کے بہت بڑے حصے نے اسے قبول کیا، افراد نے بھی اس پر عمل کیا اور حکومتوں اور معاشروں نے بھی اسے اپنا دستور بنایا۔اس پورے ذخیرے سے بغیر کسی تعصب کے فائدہ اٹھانا چاہیے اور کسی ایک مسالکِ فکر سے استفادہ میں مانع نہیں ہونی چاہیے۔

اس فقہی ذخیرہ کو نظر انداز کر کے اجتہاد کا کام نہیں ہوسکتا۔اسی سے اجتہاد کے اصول، طریقے اور نمونے سامنے آئیں گے۔جن مسائل میں اجتہاد کی صلاحیت اُبھرے گی ان میں نظیریں ملیں گی اور اس کے مسلسل مطالعہ اور تحقیق سے اجتہاد کی صلاحیت اُبھرے گی۔خود صحابہ کرامؓ اور تابعین اپنے پیش رو آئمہ کے فیصلوں سے استفادہ کرتے تھے۔حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ کے فیصلے تلاش کرتے تھے۔حضرت عمرؓ کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فیصلے نمونے کا کام دیتے رہے۔اسی طرح اکابر صحابہؓ کے فتووں کو تابعینؒ نے اپنے لیے نمونہ بنایا۔اس طرح اجتہاد کا سلسلہ آگے بڑھا۔

آئمہ امت اور سلف صالحین نے بڑی صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ فتویٰ دینے کے لئے اہل علم کی رایوں اور مسائل میں ان کے اختلاف سے واقف ہونا ضروری ہے۔علامہ شاطبیؒ نے اس طرح کے متعدد اقوال نقل کیے ہیں:

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: سلف کے اختلافات سے جو شخص واقف نہیں ہے اسے فقہ کی خوشبو تک نصیب نہیں ہوئی۔ ہشام عبید اللہ الرازی کا قول ہے کہ جس شخص کو اختلافات قرأت کا علم نہ ہو وہ قاری نہیں اور جو فقہا کے اختلافات کو (دلائل کے ساتھ) نہ جانے وہ فقیہہ نہیں ہے۔

حضرت عطاء بن رباح کہتے ہیں: کسی ایسے شخص کے لیے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے جو اہل علم کے اختلافات سے واقف نہ ہو، ورنہ اس کا امکان ہے کہ زیادہ قوی رائے کو چھوڑ کر وہ اپنی رائے پر قائم رہے۔

ایوب سختیانی اور ابن عیینہ کہتے ہیں: جو شخص اہل علم کے اختلافات کو بہت کم جانتا ہے وہی فتویٰ دینے میں بے باکی کا مظاہرہ کرتا ہے۔وہ مزید کہتے ہیں کہ فقہاء کے اختلافات سے واقف شخص فتویٰ دینے میں زیادہ محتاط ہوتا ہے۔

امام مالک فرماتے ہیں: فتویٰ دینے کا جواز اسی کو حاصل ہے، جس کے علم میں صحابہ کرامؓ کے اختلافات اور ناسخ ومنسوخ کی تفصیل ہو۔ یحیی ابن سلام کہتے ہیں: جس شخص کو سلف کے اختلافات سے واقفیت حاصل نہیں ہے اسے فتویٰ نہیں دینا چاہیے۔ جسے ان کے مختلف اقوال کا علم نہیں ہے اس کے لیے یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ یہ امر میرے نزدیک پسندیدہ ہے۔

سعید بن ابوعروبہ کہتے ہیں: جو اختلافات رائے کو نہ سن سکے اسے عالم نہ سمجھو۔قبیصہ کا قول ہے: جو اہل علم کے اختلافات کو نہ جانے وہ (فقہ کے میدان میں) کامیاب نہیں ہوسکتا۔علامہ شاطبی کہتے ہیں: اس سلسلہ کے اور بھی اقوال ہیں۔ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مختلف فقہی آراء کو حفظ کر لیا جائے، بلکہ ان کے مواقع اختلاف (موقع ومحل) سے واقفیت ہو اور یہ اسی وقت ہوگا جب غور فکر سے کام لیا جائے (اور صحیح رائے جاننے کی کوشش کی جائے)۔

علامہ شاطبی نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ کسی میں بہت سی رائیں ہوسکتی ہیں۔صحابہ کرام کے درمیان بھی رایوں کا اختلاف رہا ہے۔یہ سب رائیں بہ یک وقت صحیح نہیں قرار دی جاسکتیں۔مفتی اور مجتہد کا کام یہ ہے کہ ان میں سے جو رائے دلیل کے لحاظ سے قوی ہو اسے ترجیح دیں اور اس پر عمل کرے۔

۲۔اخلاقی کردار (عدالت)

فقیہ اور مجتہد کے لیے......دوسرا اہم ترین وصف جس کی موجودگی ضروری ہے، عدالت کا وصف ہے......امام الغزالیؒ نے ......اس وصف کا صاف وصریح لفظوں میں......اور دوسرے فقہاء نے......ضمنی طور پر ذکر کیا ہے......امام الغزالیؒ لکھتے ہیں:

ان یکون عدلاً مُجتنبًا للمعاصی القادحة فی العدالة وهذا یشترط لجواز الاعتماد علی فتواه فمن لیس فیه عدلاً فلا تقبل فتواه اما هو فی نفسهٖ فلا فکانّ العدولة شرط القبول للفتوی لا شرط الاجتهاد. (۱۹)

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ عادل ہو، اور ایسے گناہوں سے اجتناب کرنے والا ہو، جو اس کی عدالت والی صفت کو متاثر کر سکتے ہیں۔ یہ بات اس کے فتوے پر اعتماد کے لیے ضروری ہے، اس لیے کہ جو شخص عادل نہیں ہوگا، اس کا فتویٰ قبول نہیں کیا جائے گا، جہاں تک فی نفسہٖ اجتہاد کا تعلق ہے، تو یہ وصف اس کے لیے ضروری نہیں ہے، گویا عدالت اس کے فتویٰ کی قبولیت کے لیے شرط ہے، نفس اجتہاد کے لیے نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں جگہ جگہ علم کے ساتھ عمل پر زور دیا گیا ہے اور عمل کے بغیر علم کو...... پسند نہیں کیا گیا ہے......ایک جگہ ارشاد مبارک ہے:

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. (۲۰)

کیا تم لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھلا دیتے ہو، حالانکہ تم کتاب کو پڑھتے ہو۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَo كَبُرَ مَقْتاً عِنْدَاللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْامَا لَا تَفْعَلُوْنَ. (۲۱)

''اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو، جو نہیں کرتے ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ بات بہت زیادہ ناراضگی والی ہے، کہ تم وہ بات کہو، جو تم خود نہ کرو''۔

اور مجتہد کا مقام ورتبہ ایسا ہے کہ اسے دوسروں کو نیک اعمال اور نیک احکام کی ترغیب دینا ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو اچھی باتیں اور اچھے امور سکھاتا ہے، لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے، کہ وہ ذاتی طور پر نیک اور صالح ہو۔

چونکہ اس مقالے کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ کیا پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق حاصل ہے یا نہیں، اس لیے اسلامی تاریخ سے شواہد پیش کر کے واضح کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے اگر اجتماعی طور پر اجتہاد کا کام کیا ہے تو اس کام کا طریق ومنہج اور قواعد وضوابط کیا تھے؟ اسی منہج کی پیروی کرتے ہوئے ہم آج بھی اجتہاد کر سکتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہوگا کہ ہمارا آج کا طریق کار اپنے معیارات کے اعتبار سے ماضی کے معیارات سے کہاں تک مماثلت رکھتا ہے۔

اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ کسی بھی شخص کا اجتہاد کتاب وسنت کے قائم مقام نہیں ہے، اس لیے وہ حرف آخر بھی نہیں ہے۔ کسی اجتہاد کو آخری حیثیت دے دی جائے تو اجتہاد کا عمل آگے نہیں بڑھ سکتا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا رویہ ہمارے لیے بہترین مثال ہے۔ وہ کہتے ہیں: جب کوئی حکم اللہ کی کتاب میں مل جائے، یا ثقہ راویوں نے رسول اللہ ﷺ سے

---

(۱۹) الغزالی، المستصفی۔ ۲/۵۱۷

(۲۰) القرآن الکریم، البقرہ ۲/۴۴

(۲۱) الصف (۶۱/۲/ص۳)

روایت کیا ہو تو پھر میں کسی طرف نہیں دیکھتا۔ اگر کسی مسئلے میں صحابہؓ کے اقوال مختلف ہوں تو اُن میں ترجیح دیتا ہوں، اُن سے باہر نہیں جاتا، لیکن جب معاملہ ابراہیم نخعیؒ، شعبیؒ، حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ اور سعید بن مسیّب وغیرہ تک پہنچ جاتا ہے تو سمجھتا ہوں کہ جس طرح انھوں نے اجتہاد کیا، اسی طرح مجھے بھی اجتہاد کا حق ہے۔"

انفرادی فتویٰ اور اجتہاد کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے۔ اس ضرورت کو دور اول کے آئمہ فقہاء بذریعہ اتم پوری کرتے رہے ہیں۔ بعد کے ادوار میں ان ہی کی روشنی میں علماء نے احکام دین کی وضاحت کی اور فتوے جاری کیے۔ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ان میں کہیں کہیں اجتہادی رنگ نظر آتا ہے۔ لیکن بعض مسائل اجتماعی غور وفکر اور فیصلہ کا تقاضا کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں معیشت، معاشرت، تمدنی تقاضے، سیاست، قانون، طب وصحت کے مسائل اور ماحولیات جیسے مختلف میدانوں میں بہت سے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں کہ ان میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کرنا کسی ایک فرد کے لیے آسان نہیں ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اسلامی علوم کے ماہرین اور جدید مسائل پر نظر رکھنے والے افراد جمع ہوں اور غور فکر کے ذریعہ کسی نتیجہ تک پہنچیں۔ یہ ایک طرح سے خلفاء راشدین کا اسوہ ہے۔ جن مسائل میں حکم شریعت واضح نہیں ہوتا تھا ان میں وہ اُن اصحاب سے مشورہ کرتے جو علم وآگہی اور تفقہ میں معروف تھے اور ایک دوسرے کی معلومات سے فائدہ اٹھاتے۔ اس پہلو سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا عمل بہت نمایاں ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے بھی بڑی حد تک یہی طریقہ اختیار کیا۔ وہ حسب ضرورت اپنے تلامذہ سے مشورہ کرتے اور باہم تبادلہ خیال کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچتے۔ موجودہ دور میں اس مقصد کے لیے سمینار اور مجالسِ مذاکرہ منعقد کیے جاتے ہیں۔ فقہی مسائل پر غور فکر کے لیے اسلامی ممالک میں متعدد اکیڈیمیاں قائم ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی کئی سال سے اسلامی فقہ اکیڈمی سرگرم ہے۔ بحث وتمحیص کے ذریعہ اس کے جو فیصلہ سامنے آتے ہیں ان کا وزن محسوس کیا جاتا ہے۔ (۲۲)

امام حنیفہؒ نے فقہ کی تدوین کے لیے باقاعدہ مجلس تشکیل دی جس کے لیے آپ نے اپنے تلامذہ میں سے چالیس ایسے افراد کا انتخاب فرمایا جو خاص خاص فنون میں، جوزائدہ، حفص بن غیاث، قاضی ابویوسف وغیرہ حدیث وآثار میں نہایت کمال رکھتے تھے امام زفر قوت استنباط میں مشہور تھے، قاسم بن معن اور امام کو ادب اور عربیت میں کمال حاصل تھا۔

علامہ زاہد الکوثری فرماتے ہیں:

وكان أجلى مميزات مذهب أبى حنيفه، أنه مذهب شورى، تلقته جماعة عن جماعة إلى الصحابة رضوان الله عليهم اجمعين بخلاف سائر المذاهب، فانها مجموعة آراء لأئمتها.

ترجمہ : مسلک امام ابوحنیفہ کے اہم امتیازات میں سے یہ ہے کہ یہ مسلک شورائی ہے، اسے ایک جماعت نے دوسری جماعت سے حاصل کیا اور اور یہ سلسلہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تک ہے، اس کے برعکس دیگر مسالک ان کے ائمہ کی آراء کا مجموعہ ہیں۔

علامہ کوثری آگے فرماتے ہیں:

مغیرہ بن حمزہ کا بیان ہے کہ ابوحنیفہ کے اصحاب جنہوں نے ان کے ساتھ کتب کی تدوین کی، چالیس افراد تھے جو کہ (علم و مرتبہ میں) بڑوں کے (بھی) بڑے تھے۔ اسد بن الفرات نے فرمایا: "امام ابوحنیفہ کے اصحاب جن کے ساتھ یہ حضرات شامل تھے۔ زفر بن ہذیلؒ، داؤد طائیؒ، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد اسلمی (امام شافعیؒ کے مشائخ میں سے ایک) یحییٰ بن زکریا ابن ابی زائدہ

---

۲۲) کتاب "تحقیقات اسلامی"، باب "باب شریعت میں اجتہاد کا عمل" (صفہ نمبر ۳۶ س ۲۹)

(جوان کے لیے تیس سال تک کتابت کرتے رہے)۔ مجھے اس بن عمرو نے بتایا کہ وہ حضرات کسی سوال کے جواب میں ابوحنیفہؒ کی موجودگی میں مختلف آراء دیا کرتے تھے۔ایک کا جواب کچھ ہوتا تو دوسرے کا جواب کچھ اور۔ پھر وہ مسئلہ کو امام ابوحنیفہ کے سامنے پیش کرتے اور ان سے پوچھتے۔ پس وہ ایسا جواب دیتے جو کہ جامع ہوتا یعنی اقرب (الی الصواب)۔اور کسی مسئلہ کے حل کے لیے تین دن تک بحث و گفتگو ہوتی رہتی، پھر وہ اسے دیوان میں لکھ دیتے۔

فقہ حنفی کے طریقہ تدوین سے متعلق علامہ شبلی فرماتے ہیں:

"تدوین کا طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص باب کا کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تھا، اگر اس کے جواب میں سب لوگ متفق الرائے ہوتے تو اسی وقت قلم بند کرلیا جاتا اور نہایت آزادی سے بحثیں شروع ہوتیں، کبھی کبھی بہت دیر تک بحث قائم رہتی، امام صاحب بہت غور اور تحمل کے ساتھ سب کی تقریریں سنتے اور بالآخر ایسا جچا تلا فیصلہ کرتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ امام صاحب کے فیصلے کے بعد بھی لوگ اپنی اپنی آراء پر قائم رہتے،

اس وقت وہ سب مختلف اقوال قلم بند کرلیے جاتے، اس کا التزام تھا کہ جب تک تمام شرکائے جلسہ جمع نہ ہولیں کسی مسئلہ کو طے نہ کیا جائے"۔(۲۳)

یقول زفر : کنا نختلف إلی أبی حنیفة و معنا أبو یوسف و محمد بن الحسن ، فکنا نکتب عنه ، قال زفر ، فقال یوما ابو حنیفة لأ بی یوسف : و یحک یا یعقوب، لا تکتب کال ماتسمع منی ، فإنی قدأری الرای الیوم و أتر که غدا، و أری الرأی غدا، وأتر که غدا، و أر الرأی غدا، وأتر که فی غده ، انظر کیف کان ینهی أصحابه عن تدوین المسائل ، إذاتعجل احدهم بکتابتها قبل تمحیصها کما یجب.

ترجمہ: زفرؒ فرماتے ہیں:"ہم ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ہمارے ساتھ ابویوسف اور محمد بن حسن ہوتے۔ ہم ان کے اقوال لکھتے تھے۔ایک دن امام ابوحنیفہ نے امام ابویوسف سے فرمایا"اے یعقوب تمھارا بھلا ہو۔ جو کچھ مجھ سے سنتے ہو اسے نہ لکھ لیا کرو۔ میں آج ایک رائے قائم کرتا ہوں، کل پرسوں اسے چھوڑ دوں گا۔ دیکھئے کہ امام ابوحنیفہ اپنے ساتھیوں کو، جب وہ بحث و تمحیص کے بغیر مسائل لکھنے میں جلدی کرتے تو انھیں تدوین مسائل سے کیسے منع کرتے تھے۔

علامہ کوثری الموفق المکی کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"اوضع أبو حنیفة مذهبه شوری بینهم لم یستبد فیه بنفسه دونهم اجتهادا منه الدینو مبالغه فی النصیحة لله ور سوله والمؤمنین، فکان یلقی المسائل مسألة مسالة و یسمع ماعندهم ویقول ماعند ہ و ہ یناظر هم شهرااْواکثر حتی یستقر أحد الأقوال فیها ، ثما یثبتها أبو یوسف فی الأصول حتی اثبت الأصول کلها ، و هذا یکون أولی وأصوب ، وإلی الحق أقرب، والفلوب الیه أسکن وبه أطیب ، من مذهب من انفر د فو ضع مذهبه بنفسه، و یر جمع فیه إلی رأیه.

ترجمہ:امام ابوحنیفہؒ نے اپنا مسلک باہمی مشاورت کی بنیاد پر وضع کیا۔انہوں نے خود کو برتر نہیں سمجھا اور اپنی رائے کو دوسروں پر مسلّط نہیں کیا۔دین کے معاملے میں ان کی طرف سے اس کی پوری کوشش ہوئی۔ ایسا انھوں نے اللہ، اس کے رسول اور مومنین سے خیر خواہی کے جذبے سے کیا۔وہ ایک ایک مسئلہ پیش کرتے تھے۔اور (اپنے اصحاب سے) جو ان کے پاس ہوتے ان

۲۳) کتاب "تحقیقات اسلامی"، باب "امام ابوحنیفہ اور اصول فقہ" (صفحہ نمبر ۳۳۔۳۴)

کے خیالات سنتے اوراپنی بات سناتے ۔اس طرح باہم ایک ایک مہینہ یااس سے بھی زیادہ مباحثہ چلتا رہتا۔ یہاں تک کہ کسی ایک قول پر استقرار ہو جاتا، پھر امام ابو یوسف اسے کتاب الأ صول میں تحریر کرتے ۔ یہاں تک تمام اصول کا انضباط عمل میں آ گیا۔اس لیے مسلک امام ابوحنیفہ اولی ،قرین صواب ،حق کے زیادہ قریب ،قلوب کے لیے باعث اطمینان اور پاکیزہ ترین ہے۔اس مسلک کے مقابلہ میں جس کو(اس کے بانی نے انفرادی طور پر واضح کیا اور اس (مسلک) کا مرجع اس کے (بانی) کی رائے ہے۔''

اس مجلس تدوین فقہ نے ،جس میں محدثین ،فقہاء ،لغت ،وعربیت کے ائمہ اور استنباط واجتہاد کے ماہرین شریک تھے جو مسئلہ تحریر کرنے سے پہلے خوب غور فکر، بحث ونظر اور نقد وجرح کرتے تھے ،عرصہ تیس سال میں اپنا کام مکمل کیا۔اس مجلس کی مذکورہ ہیئت اور طریقہ کار اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ اس میں نہ صرف فروع اور جزئیات فقہ کو زیر بحث لایا جاتا ہوگا ، بلکہ استنباط کے اصول و قواعد کی روشنی میں ان پر بحث ہوتی ہوگی اور خود استنباط کے اصول وقواعد کی بھی تنقیح وترتیب کا کام ہوتا ہوگا۔(۲۴)

علامہ کوثری نے مذہب حنفی کے پھیلاؤ کی اصلی وجہ اس اجماعی طریقہ تدوین کو قرار دیا ہے۔فرمایا ہیں:

''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوحنیفہؒ اپنے اصحاب سے اپنی رائے کے قبول پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انھیں آمادہ کرتے تھے کہ اپنی آراء پیش کریں۔ یہاں تک کہ ان کے سامنے مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا،پس وہ بات قبول کر لیتے جو دلیل سے واضح ہو جاتی تھی اور اسے چھوڑ دیتے جو دلیل سے رد ہو جاتی ۔ وہ فرماتے تھے:''کسی شخص کے لیے درست نہیں کہ ہماری رائے کے مطابق رائے اختیار کرے جب تک یہ نہ جان لے کہ ہم نے یہ قول کیسے اختیار کیا۔''(۲۵)

ان تفصیلات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر ہم پارلیمنٹ کی شکل میں اجتماعی اجتہاد کا کام کریں گے تو وہ بھی قواعد کے تابع ہونا چاہیے ۔پیش کردہ تفصیلات اس سلسلے میں ہمارے لئے راہنما اصولوں اور طریق کار یا روڈ میپ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اجماع بغیر کسی داعی کے نہیں اور داعی قرآن وحدیث کے کسی لفظ کے متعدد مفہومات میں سے ایک کی تعیین پر سارے علماء کا جمع ہونا ہوتا ہے وہ علماء کی رائے نہیں بلکہ آیت یا حدیث کا ایک پہلو ہوتا ہے۔جس کو قرآن وحدیث کے ظاہری و باطنی قرائن سے سب ملکر ترجیح دیتے ہیں اس کو آیت یا حدیث سے باہر قرار دینا ایک دھوکہ کی صورت ہے ایسے ہی قیاس کسی کی اپنی ذاتی رائے نہیں ہوتی بلکہ وہ بھی قرآن وحدیث کے معانی کی وسعت کا بیان ہوتا ہے یعنی اس حکم کی علت و مدار حکم یہ ہے جہاں جہاں یہ علت موجود ہوگی وہ بھی اسی آیت وحدیث کے تحت ہوں گے اور اسی آیت وحدیث کا حکم اُن کو حاوی ہوگا۔اگر علت اللہ اور رسول ﷺ کی بتائی ہوئی ہر شخص کی سمجھ اور یقین کی ہوگی تو جہاں جہاں وہ پائی جائے گی۔وہاں آیت وحدیث کا اس کو حاوی ہونا یقینی ہوگا۔(۲۶)

مجتہد کیلئے ضروری ہے کہ وہ اہل زبان کی طرح یا قریب قریب کا ہو جائے ، پھر وہ ہر ہر نقط کے مادّہ کے معنی اور اس کے تغیرات سے پھر اس کی تبدیلی کی صورتوں اور اُن کے تبدیل معانی سے پھر باہمی جوڑ توڑ اور اس سے معانی کا تبدّل وتغیر غرض سب شرطوں کا جامع ہو سوال نمبر ۸ کے جواب میں آئیں گی اور ان کے ذریعہ ہر ہر جملہ سے مراد الٰہی تحقیق شدید سے معلوم کر سکے جن میں ایک شرط حضور انور کے زمانہ سے قرب ہونا یا اُس کے قائمقام ہونا ہے اور اوّل سے آج تک طول وعرض اور قوی ذہن عقل وحافظہ میں بحیدا لخطاط ہو چکا ہے اس انحطاط کی وجہ سے اجتہاد کی قوت بھی ختم ہو چکی ہے۔

---

۲۴) کتاب ''تحقیقات اسلامی''، باب ''امام ابوحنیفہ اور اصول فقہ (صفحہ نمبر ۳۵۔۳۷)

۲۵) ایضاً، (صفحہ نمبر ۳۸)

۲۶) کتاب ''منھاج''، باب ''اسلام میں اجتہاد'' (صفحہ نمبر ۲۳۸۔۲۳۹)

حضور ﷺ نے فرمایا: **خیر القرون قرنی ثمه الذین یلو نهم ثمّ الذین یلو نهم ثمه یفشو الکذ ب.**

''بہترین صدی میری صدی ہے پھر وہ جو ان کے متصل ہیں (صحابہؓ) پھر وہ جو ان کے متصل ہیں (تابعین) پھر جھوٹ پھیل جائے گا۔(۲۷)

۳۔ دینی بصیرت وغیرہ امور

ان سب امور کے ساتھ ساتھ مجتہد کی ذات میں دینی بصیرت کا ہونا بھی ضروری ہے......

بصیرت سے مراد......فطری استعداد اور اہلیت ہے......وجہ یہ ہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جو شخص سائنس پڑھ لے وہ آئن سٹائن......بن جائے گا یا جو شخص فقہ پڑھ لے وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ بن جائے، اس لیے کہ......کسی بھی علم اور فن میں کوئی درجہ اور مقام حاصل کرنے کے لیے علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ اضافی طور پر اس علم میں اجتہادی بصیرت کا ہونا بھی ضروری ہے جو کہ ایک خداداد اور وھبی شے ہے......عصر حاضر کے ایک محقق نے اس کی مزید اوصاف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان شرائط کے علاوہ دو دوسری اوصاف کا ہونا بھی ضروری ہے۔

''**الاستعداد النظری للاجتهاد...... و (۲)معرفة مقاصد الشریعة......**

یعنی اجتہاد کے لیے فطری استعداد کا ہونا اور شریعت کے مقاصد کا علم رکھنا بھی ضروری ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی عالم اجتھاد کے لیے درکار تمام ضروری صفات سے متصف ہو، مگر اس میں عملی اجتہاد سے متعلق فطری مناسبت موجود نہ ہو، تو وہ مجتھد نہ ہوگا، اس طرح مجتھد کے لیے مقاصد شریعت سے مکمل آگاہی بھی بنیادی اہلیت کا درجہ رکھتی ہے(۲۸)''

فقہاء کا بیان کردہ یہ اصول اپنی جگہ بڑی اہمیت اور عظمت رکھتا ہے، اس لیے کہ جب تک متعلقہ فقیہ میں فطری استعداد اور وھبی ملکہ موجود نہ ہو، وہ ''مجتھد'' نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس کا کیا ہوا اجتھاد قبول عام حاصل کر سکتا ہے۔ا

ن تمام تفصیلات سے یہ واضح ہو گیا کہ اجتہاد (اپنے اصطلاحی معنوں میں) کا حق صرف انہی لوگوں کو حاصل ہے جو علم (جس کی تفصیلات گزشتہ صفحات میں دے دی گئی ہیں) تقوٰی، عدل، فہم و ذکا (جس کی پوری تفصیل دی جا چکی ہے) میں خصوصی مقام رکھتے ہیں۔

---

۲۷) ایضاً، (صفحہ نمبر ۲۲۸۔۲۳۰)

(۲۸) عبدالکریم زیدان ڈاکٹر، الوجیز فی اصول الفقہ، ص ۴۰۵

فصل سوم:

شوریٰ اور مشورے کا اسلامی تصور

(الف) اسلام سے پہلے کی حالت:

اگرچہ پارلیمنٹ پرمبنی موجودہ جمہوری اور شورائی نظام مغرب میں پروان چڑھا اور قدیم زمانے خصوصاً عہد نبوی خلفائے راشدین سے چلے آنے والے شورائی نظام کو قانونی حیثیت دینے کا سہرا واقعی اہل مغرب کے سر ہے، مگر یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ موجودہ پارلیمنٹ پرمبنی جمہوری اور شورائی نظام کو قانونی حیثیت دینے کا سہرا واقعی اہل مغرب کے سر ہے، مگر یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ موجودہ پارلیمنٹ پرمبنی جمہوری اور شورائی نظام کی بہت سی عملی صورتیں اسلامی ممالک میں بھی رائج رہی ہیں۔ اور مغربی ممالک میں رائج العمل یہ نظام حکومت اسلامی نظام حکومت سے یقیناً اثر پذیر ہوا ہے۔

جب اسلام کوہ فاران کی چوٹیوں سے ظہور پذیر ہوا تو اس وقت بھی مکہ مکرمہ میں ایک جمہوری ریاست کام کر رہی تھی، جہاں ہر کام باہمی مشورے سے ہوتا تھا۔ اس جمہوری حکومت کا ذکر کرتے ہوئے معروف محقق حمید اللہ نے لکھا ہے:

نبی اکرم ﷺ کی ولادت کے وقت مکہ مکرمہ میں، مشاورت پرمبنی نظام حکومت صدیوں سے موجود تھا۔ جہاں تک سیاسی نظم ونسق کا تعلق ہے، شہر مکہ ایک شہری مملکت تھی جس کا رقبہ (حدود حرم کی اساس پر) تقریباً ایک سو تیس مربع میل تھا، وہاں بادشاہت کی جگہ ایک طرح کی سیلف گورنمنٹ تھی، یعنی ایک مجلس وزراء اس کے انتظام کی ذمہ داری تھی۔ اس کی تفصیلیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ نہایت ہی مختصراً ذکر کروں گا کہ اس میں دیوانی مقدمات اور فوجداری مقدمات کے لیے الگ الگ وزیر تھے، کعبہ کے انتظام کے لیے، یعنی دروازہ کھولنے اور بند کرنے کے لیے ایک وزیر تھا(۱)۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان لوگوں کو وزیر کہنا ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا ذاتی اجتہاد ہے، ورنہ تاریخ میں انہیں وزیر کے بجائے عہدے دار ظاہر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید لکھا ہے:

''اسی طرح وہاں غیب دانی کے لیے، یعنی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کوئی کام ہمیں کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے، ان کے پاس تیر ہوا کرتے تھے جن سے وہ فال نکالا کرتے تھے۔ ان تیروں کی نگرانی کرنے والا ایک وزیر ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح کعبے میں باہر سے آنیوالے زائرین چڑھاوے چڑھایا کرتے تھے، ان چڑھاووں کی حفاظت کے لیے ایک اور وزیر مقرر تھا۔ اسی طرح ٹیکسیشن کے لیے بھی ایک وزیر تھا، یعنی شہر مکہ کے باشندے ہر سال اپنے افسر متعلقہ کو کچھ رقم بطور ٹیکس دیتے تھے، جس کا اولاً مقصد بیان کیا گیا تھا کہ اگر کوئی حاجی کسی نہ کسی وجہ سے مکہ میں اپنے آپ کو بے بس پائے یا اس کے پاس پیسے بالکل نہ رہیں، یا اس کی سواری کا اونٹ مر جائے تو ایسے مجبور لوگوں کی مدد کے لیے اور حج کے زمانے میں باہر سے آنیوالوں کی ضیافت اور مہمان داری پر خرچ کرنے کی غرض سے ایک ٹیکس لیا جاتا تھا جس کا انتظام، ظاہر ہے کہ ایک خصوصی وزیر کے سپرد ہوتا تھا''(۲)۔

---

۱) حمید اللہ، ڈاکٹر، خطبات بہاولپور، ص ۳۷۰، ۳۷۱، خطبہ بعنوان مملکت اور نظم ونسق

۲) ایضا

ایک اور ادارہ تھا جس کو دارالندوہ کہنا چاہیے، جب کبھی مشکل مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔ مثلاً کسی دشمن کے حملے کا خطرہ یا کوئی اور معاملہ درپیش ہوتا تو سارے باشندوں کی جگہ ان کے نمائندوں سے گفتگو ہوتی تھی کہ ہر وہ شخص جس کی عمر چالیس سال ہو جاتی، وہ خود بخود اس مجلس مشاورت یا اس پارلیمنٹ کا رکن بن جاتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دو آدمیوں کو اس مستثنیٰ کر دیا گیا تھا، یعنی ان کو چالیس کی عمر کی حد تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا رکن بنالیا گیا تھا، ان میں ایک ابوجہل تھا۔ اس کی فراست اور عقلمندی کا بڑا چرچا تھا، جنانچہ اس کو نوجوانی میں ہی اس کا رکن بنا دیا گیا تھا۔ ہمیں اس طرح کی کئی مثالیں ملتی ہیں، مثال کے طور پر حضرت عمر فاروقؓ جن کے پاس سفارت کا عہدہ تھا، ان کی عمر بھی چالیس برس سے کم تھی، جب کہ انہیں اس مجلس کا رکن ہی نہیں، بلکہ عہدے دار بنا دیا گیا تھا۔ اسی طرح اور بھی کئی لوگوں کے ناموں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ایک اور شخص کا بھی ذکر آتا ہے۔ سب سے عجیب و غریب جو بات ہمیں نظر آتی ہے، وہ وزارت خارجہ کا عہدہ ہے۔ وزارت خارجہ کا دائرہ کار یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب کبھی کسی بیرونی قبیلے سے گفتگو کی ضرورت پیش آتی، کسی جھگڑے کا تصفیہ اور مصالحت کرانی ہوتی یا دشمن کے مطالبات کے انتظام وانصرام کے لیے بھی ایک عہدہ دار پایا جاتا تھا، یہ تمام وزراء عہد نبوی ﷺ تک پائے جاتے تھے، ان میں سے اکثر نام بہت مشہور ہیں، مثلاً دیوان مقدمات حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سپرد تھے، وزارت خارجہ کا منصب حضرت عمرؓ کے سپرد تھا۔ اس طرح فوج کا جھنڈا ابو سفیان کے سپرد تھا۔ یہ تمام نام تاریخ اسلام میں آتے ہیں۔ یہ اسلام سے پہلے کی مشہور شخصیتیں تھیں اور مکے کی حکومت میں ان کو خاصا مقام حاصل تھا۔ دوسرے لفظوں میں شہر مکہ میں ایک مملکت پائی جاتی تھی اور یہ مملکت ایک شہری مملکت تھی۔ اس کا انتظام بجائے ایک فرد کے ہاتھ میں ہونے کے ایک نمائندہ جماعت کے سپرد کیا گیا تھا۔ یہ ہے مختصر خلاصہ اس سیاسی نظام کا جو پیغمبر ﷺ کی ولادت کے وقت شہر مکہ میں پایا جاتا تھا (۳)۔ اس سلسلے میں بہت مسلمان وغیرہ مسلم مفکرین نے اپنے انداز سے اظہار خیال کیا ہے (۴)۔

(۴) اسلام کا تصور مشاورت:

یہ تو اس جمہوری یا شورائی نظام کی ایک جھلک تھی، جو اسلام سے قبل موجود تھا، اس ماحول میں جب اسلام نے پنا نور پھیلایا، تو اس میں شورائیت کے اس تصور کو مزید راسخ کیا گیا۔ اسی لیے اسلام نے شورائیت اور اقتدار میں عوام کی شرکت کو اس سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے دنیا کو شورائیت یا مشاورت کا تصور عطا کیا ہے اور جس نے اپنے ماننے والوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے انجام دیں۔ چند تصریحات درج ذیل ہیں:

(الف) قرآن حکیم میں مشاورت کے احکام

ا۔ صحابہ سے مشاورت جاری رکھیں:

آنحضور ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ ﷺ جب بھی کوئی معاملہ انجام دیتے، تو اپنے، تو اپنے صحابہ کرامؓ کو بلا کر ان سے

---

۳) ایضاً، ص ۱۷۴۔۱۷۵

۴) دیکھیے محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، خطبات بہاولپور۔۔۔ ابن تیمیہ، امام، السیاسۃ الشرعیہ، الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ابن خلدان مقدمہ، ابن خلدون، ابن الاثیر، الکامل اور دوسری کتب۔

اس کے بعد امت کا ہر فرد مشورہ طلب کرے گا اور یوں وہ اعلیٰ درجہ کی رہنمائی سے محروم نہ ہوگا اور جو مشورہ ترک کرے گا وہ غلط راہ سے نہ نکلے گا''(۹)۔

(ب) احادیث نبویہ میں مشاورت کا حکم:

حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ نزول وحی کے باوجود آنحضورﷺ کو اپنے صحابہ سے مشورے کے حکم کا ملنا اس لیے تھا کہ لوگوں کا ضمیر اور ان کی رائے مطمئن ہو جائے اور شوریٰ امت کے لیے قانون بن جائے۔

عبداللہ بن عبدالرحمان بن ابی حسین سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرمﷺ سے سوال کیا یا رسولﷺ حزم (عقل مندی) اور سوجھ بوجھ کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ تو کسی عقل مند سے مشورہ کرے اور پھر اس کے مشورے کو مانے''(۱۰)۔

(ج) نبی کریمﷺ کی حیات مبارکہ میں مشاورت کا عمل:

علاوہ نبی اکرمﷺ کے عہد مبارکہ میں مشاورت کا بہت زیادہ عمل دخل تھا، ام المؤمنین حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

مَارَ اَیْتُ رَجُلًا اَکْثَرَ اسْتَشَارَ اَلِرِّ جَالِ مِنْ رَّسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (۱۱)۔

میں نے رسول اللہﷺ سے زیادہ کسی کو بھی دوسرے لوگوں سے مشورہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کا مقصد یہ تھا کہ نبی اکرمﷺ اپنے صحابہ کرامؓ سے بہت زیادہ مشاورت کرتے تھے۔ ان کے سامنے مسئلہ رکھتے اور پھر ان سے مشورہ لیتے اور عام طور پر جو مشورہ ہوتا اور جو اکثریت کی رائے ہوتی، اسی پر عمل کیا جاتا۔ اسی لیے آنحضورﷺ غزوۂ بدر، غزوۂ احد اور غزوۂ خندق سے پہلے صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا تھا اور صحابہؓ کی طرف سے جو مشورہ ملا آپﷺ نے اسی پر عمل کیا۔

نامور محدث اور فقیہہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے:

''نبی اکرمﷺ نے صحابہ کرامؓ سے غزوہ بدر کے موقع پر دوبارہ مشورہ کیا، پہلی بار اس جب آپﷺ مدینہ منورہ میں تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آپﷺ کو ابوسفیان کے قافلہ تجارت کی اطلاع ملی تھی، یہ بات صحیح مسلم کی روایت میں مذکور ہے، دوسری مرتبہ اس وقت جب آپﷺ مدینہ منورہ سے باہر نکل آئے تھے''۔(۱۲)

اسی طرح کی حدیث حضرت ابو ہریرہؓ نے بھی روایت کی ہے۔(۱۳)، جس کے الفاظ ہو بہو وہی ہیں جو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ہیں۔

امام بخاریؒ نے نبی اکرمﷺ کے صحابہ کرامؓ سے مشورہ لینے پر ایک مستقل باب میں گفتگو کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

باب اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد مبارک (کے بیان میں) کہ ''فرمایا (ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں)

---

۹) الآلوسی، روح المعانی ۴۲/۲۷، مطبوعہ ملتان

۱۰) ابن حجر العسقلانی، فتح الباری ۳۴۲/۱۳

۱۱) ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، مطبوعہ بیروت ۱۹/۱۳

۱۲) (ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت (لبنان) ۲۸۹/۷_تحت الحدیث ۳۹۵۲_۲۱۴/۴

۱۳) (الترمذی، کتاب الجہاد، باب ۳۴، حدیث ۱۷۱۴، مطبوعہ شرکت مصطفیٰ البابی حلبی ۲۱۴/۴

اور فرمایا (آپ ﷺ لیجیے)"۔

اور مشورہ کسی کام کا پختہ ارادہ کرنے اور اس کو بیان کرنے سے قبل ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا (پھر جب تو پختہ ارادہ کرلے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر) اور جب نبی اکرم ﷺ کسی کام کا ارادہ فرمالیں تو کسی شخص کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے تقدم کا حق نہیں ہے اور نبی اکرم ﷺ نے غزوۂ احد کے دن مدینہ کے اندر رہ کر (مقابلہ کریں) یا باہر نکلنے کے متعلق مشورہ کیا صحابہ کرام نے باہر نکلنے کا مشورہ دیا جب آنحضرت نے اپنے ہتھیار لیے تو صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ آپ بے شک مدینہ کے اندر رہ کر مقابلہ کریں، مگر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کسی نبی کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ جب وہ ہتھیار پہن لے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ آنے سے پہلے ہتھیار اتار دے اور نبی اکرم ﷺ نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ پر لگنے والے الزام کے متعلق حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ سے مشورہ کیا اور ان کے مشورے کو سنا، تا آنکہ قرآن مجید میں اس بارے میں احکام آگئے۔ (۱۴)

نامور محدث ابن ابی حاتم نے حضرت حسن (بصری) تک قوی سند کے ذریعے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

"کسی بھی قوم نے آپس میں کبھی مشورہ نہیں کیا، مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں سب سے بہتر رائے کی طرف رہنمائی کی۔ (۱۵)

ان روایات سے واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ مختلف معاملات و مسائل میں صحابہؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

پھر جہاں تک ایسے مواقع کا تعلق ہے تو یہ بات بہت سی روایات سے ثابت ہے کہ آنحضور ﷺ نے درج ذیل موقعوں پر صحابہ کرامؓ سے مشاورت فرمائی۔ چند موقعوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۳) حیاتِ طیبہ میں مشاورت کے مواقع

۱۔ عقبہ ثانیہ (ذوالحجہ ۱۳۔ نبوی):

اس موقع پر صحابہ کرام کی اور خود نبی اکرم ﷺ کی ہجرت کے مسئلے پر مشاورت ہوئی۔ انصار مدینہ کی طرف سے تقریباً ۱۷۳ افراد نے شرکت کی، جبکہ دوسری طرف سے نبی اکرم ﷺ اور حضرت عباسؓ نے شرکت کی...... اس میں انصار مدینہ نے اعلان کیا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی اپنی آل واولاد کی طرح حفاظت کریں گے۔ جس پر نبی اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کا فیصلہ کیا۔ (۱۶)

۲۔ غزوہ بدر:

جب آنحضور ﷺ کو قریش مکہ کی طرف سے مکہ مکرمہ سے نکلنے اور مدینہ منورہ کی طرف پیش قدمی کرنے اطلاع ملی تو آنحضور ﷺ نے ...... صحابہ کرام، یعنی مہاجرین اور انصار کو جمع کیا اور کفار سے مقابلہ کرنے کے متعلق مشورہ کیا...... اس موقع پر ...... تمام مہاجرین نے جنگ کرنے کا مشورہ دیا، لیکن آنحضور ﷺ انصار مدینہ کی طرف دیکھ رہے تھے، جس پر حضرت مقداد بن اسود نے کہا: رسول اللہ ہم آپ کو وہ نہیں کہیں گے، جو موسیٰ کو ان کی قوم نے کہا تھا (آپ اور آپ کا رب دونوں جائیں اور دونوں لڑیں، ہم یہاں بیٹھے ہیں)، لیکن ہم تو آپ کے دائیں بائیں، سامنے اور پیچھے لڑیں گے۔ اس پر نبی اکرم ﷺ کا چہرۂ مبارک خوشی سے کھل اٹھا۔ اور آپ نے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ (۱۷)

---

۱۴) (البخاری، ۱۳/۳۳۹، کتاب الاعتصام، باب ۲۸۔ (ترجمۃ الباب)

۱۵) (ابن حجر العسقلانی، ۱۳/۳۴۰، کتاب الاعتصام بالسنۃ، باب ۲۸، مطبوعہ بیروت۔ بحوالہ البخاری، ادب المفرد)

۱۶) ابن ھشام، السیرۃ النبویہ، مکتبۃ العلمیہ، بیروت، ۱/۴۴۱۔۴۵۲

۱۷) البخاری، ۷/۲۸۷، کتاب المغازی، باب ۳، حدیث ۳۹۵۲

۳۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ غزوہ بدر میں دو مرتبہ مشاورت ہوئی، تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔ (۱۸)

۴۔ غزوہ احد:

اسی طرح جب آنحضورﷺ کو ۳ھ میں یہ اطلاع ملی کہ دشمنوں کا ایک لشکر خوفناک ارادے سے مدینہ منورہ کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس وقت آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کیا اور ان سے مشورہ کیا، یہ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ صحابہ کرام کی اکثریت نے مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کا مشورہ دیا، جبکہ آپ کی اپنی رائے مدینہ منورہ کے اندر رہ کر دفاع کرنے کی تھی۔ لہٰذا آپ نے اکثریت کی رائے کا احترام کرتے ہوئے جنگی تیاری شروع کردی اور جنگی لباس پہن لیا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ آنحضورﷺ نے جنگی لباس پہن لیا ہے تو انہوں نے عرض کیا کہ اگر آپ چاہیں تو اندر رہ کر جنگ کیجیے، لیکن آپؐ نے فرمایا کہ جب کوئی نبی، جنگی لباس پہن لے تو وہ اس وقت تک اسے نہیں اتار سکتا جب تک اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ صادر نہ فرمادے۔'' (۱۹)

۵۔ غزوہ خندق:

اسی طرح جب ۵ھ میں غزوہ خندق لڑا گیا تو اس موقع پر بھی صحابہ کرامؓ سے مشاورت کی گئی۔ حضرت سلیمان فارسیؓ نے مشورہ دیا۔

انا كنا بفارسِ انا حوصرنا خندقنا علينا.

ہم لوگ فارس میں جب ہمارا محاصرہ کرلیا جاتا تو ہم خندق کھودتے تھے۔

جس پر نبی اکرمﷺ نے خندق کھودنے کا حکم دیا۔ (۲۰)

۶۔ صلح حدیبیہ:

۶ھ میں غزوہ صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی نبی اکرمﷺ نے .....صحابہ کرام سے مشاورت کی کہ ہمیں پر کیا کرنا چاہیے۔ حافظ ابن حجرے کے مطابق اس موقع پر حضرت سعدؓ بن عبادہ نے کہا:

یارسول اللہ اگر آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم یمن کے شہر برک الغماد تک بڑھتے چلے جائیں گے۔ (۲۱)

۷۔ واقعہ افک کے موقع پر:

اسی طرح آنحضورﷺ کی زوجہ مُطہرہ حضرت عائشہ صدیقہؓ پر جب منافقوں نے الزام لگایا تو اس موقع پر بھی آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہتی ہیں کہ......رسول اکرمﷺ نے حضرت علیؓ اور اسامہ بن زیدؓ کو بلایا۔ آپ وحی مؤخر ہونے کی وجہ سے اپنے گھر والوں (حضرت عائشہؓ) کو الگ کرنے کے متعلق مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ حضرت

(۱۸ ابن حجر، فتح الباری، ۷/۲۸۷، کتاب المغازی، باب ۴، حدیث ۳۹۵۲

(۱۸ ابن حجر، فتح الباری، ۷/۲۸۸۔ (کتاب المغازی باب ۴)

(۱۹ البخاری، کتاب المغازی، باب ۱۷، (ترجمۃ الباب)، ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، ۷/۳۴۶

(۲۰ ابن حجر، فتح الباری، ۷/۲۹۳۔۲۹۴، کتاب المغازی باب ۲۔۔۔ تشریح باب ۲۹، حدیث ۴۰۹۷

(۲۱ ایضاً، ۷/۲۸۸، باب ۴، (تشریح) حدیث ۳۹۵۲

اسامہؓ نے، جو کچھ انہیں حضرت عائشہؓ کی پاک دامنی کے متعلق علم تھا، اس کی طرف اشارہ کیا۔ مگر حضرت علیؓ نے کہا اللہ تعالیٰ نے آپ پر عورتوں کی تنگی نہیں رکھی اور ان کے علاوہ عورتیں بہت ہیں اور ان کی باندی سے پوچھ لیں۔ بعد ازاں آپ نے مسجد میں تمام لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا (۲۲) اسی طرح نبی اکرم ﷺ صلح اور جنگ کے ہر موقع پر صحابہ کرام سے مشورہ فرماتے تھے۔ جس کی تفصیل کتب حدیث اور سیرت میں موجود ہے۔

(۴) مشاورت عہد خلافت راشدہ میں

نبی اکرم ﷺ کی مشورہ کی اس سنت مبارکہ پر خلفائے راشدین کے عہد میں عمل جاری رہا۔ چنانچہ یہ بات معلوم و مسلم ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا قیام مشورے کے تحت عمل میں آیا۔ یہ مشورہ ثقیفہ بنوساعد میں ہوا اور اس میں انصار مدینہ اور مہاجرین کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ اس مشورے کی بدولت امت بہت بڑے فتنے اور انتشار سے بچ گئی، ورنہ مسلمانوں کا باہمی اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا۔

سنن بیہقی میں میمون بن مہران سے مروی ہے کہ وہ کہتے ہیں:

''جب حضرت ابوبکرؓ کو کوئی معاملہ پیش آتا تو وہ اللہ کی کتاب میں (اس کا حکم) دیکھتے، اگر اس میں انہیں اس کے متعلق کوئی حکم مل جاتا تو وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر اس کے متعلق حکم انہیں نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ میں ملتا وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتے، اگر انہیں کوئی سنت نہ ملتی تو وہ لوگوں کے سرداروں اور علماء کو بلاتے اور ان سے اسے کے متعلق مشورہ کرتے''۔ (۲۳۔ الف)

(۱) نبی اکرم ﷺ کی وراثت کا حکم

ا۔ وصال نبوی کے بعد نبی اکرم ﷺ کی وراثت کے مسئلے میں صحابہ کرامؓ کے مابین اختلاف ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

انا معشر الانبياء لا نورث ماتر كناه صدقة (٢٤).

ہم انبیاء کی جماعت ہیں، ہم جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ وہ صدقہ ہوتا ہے۔

(۲) مدفن نبوی

اسی طرح وصال نبوی کے موقع پر یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ نبی اکرم ﷺ کو کہاں دفن کیا جائے، کچھ صحابہ کرامؓ نے مکہ مکرمہ کی، کچھ نے مسجد نبوی کی، کچھ نے بقیع کی اور کچھ نے بیت المقدس کی رائے دی، مگر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ انبیاء جہاں فوت ہوں، انہیں دفن کیا جاتا ہے۔ (۲۵) جس پر...... حجرۂ عائشہ ہی میں آپ کو دفن کرنے کا فیصلہ ہوا۔ (۲۶)

---

(۲۲) البخاری، کتاب الاعتصام باب ۲۸، حدیث ۷۳۶۹

(۲۳) السیوطی، تاریخ الخلفاء، مطبوعہ مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۲۵، ص ۵۴

۲۳الف) فتح الباری، کتاب الاعتصام، باب ۲۸، ۳۴۲/۱۳

(۲۴) ایضاً، ص ۵۴

(۲۵) ایضاً، ص ۵۰، ۵۳

(۲۶) ایضاً، ص ۵۵

(۳) لشکر اسامہ کی روانگی:

لشکر اسامہ کی روانگی کے موقع پر اختلاف ہوا، کچھ لوگوں نے کہا کہ اسے روک دیا جائے۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا جس لشکر کو رسول اللہ ﷺ نے روانہ کیا ہوا اسے ابوبکرؓ واپس نہیں کر سکتا۔ (۲۷) لہٰذا فیصلہ ہوا کہ اُسے اپنی منزل کی طرف روانہ کر دیا جائے۔

(۴) مانعین زکوٰۃ سے جنگ:

اس بارے میں حضرت عمرؓ اور دوسرے لوگوں کی رائے تھی کہ مانعین زکوٰۃ سے جنگ نہ کی جائے اور صرف مرتدین سے لڑا جائے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا، میں اس سے ضرور لڑوں گا۔ اس پر تمام لوگوں نے اتفاق کیا۔ (۲۸)

(۵) جمع وتدوین قرآن:

حضرت عمرؓ نے جنگ یمامہ کے بعد قرآن کریم کے جمع کرنے کا مشورہ دیا، حضرت ابوبکرؓ شروع میں متردد تھے، لیکن بعد ازاں، انہوں نے اسی رائے سے اتفاق کر لیا۔ چنانچہ اس مشورے کے مطابق تدوین قرآن کی ذمہ داری حضرت زیدؓ بن ثابت کو سونپ دی گئی۔ (۲۹)

(۶) حضرت عمر فاروقؓ کی جانشینی:

حضرت عمرؓ کی خلافت اور جانشینی کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں سے انفرادی طور پر مشاورت کی اور تمام لوگوں نے حضرت عمرؓ کے متعلق رائے دی جس پر حضرت ابوبکرؓ نے ان کی خلافت کا فیصلہ کیا اور اپنی زندگی ہی میں ان کے متعلق لوگوں سے بیعت لی۔ (۳۰)

(۷) مرتدین کے خلاف جنگ کی قیادت کا مسئلہ:

مرتدین کے خلاف جنگ میں حضرت ابوبکرؓ بذات خود جنگ کی قیادت کرنا چاہتے تھے اور وہ ذوالقصہ تک جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور اونٹنی پر بیٹھ بھی گئے تھے، مگر حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ ان کا یہ اقدام امت مسلمہ کے لیے درست نہیں ہوگا، جس کی بنا پر انہوں نے اپنا یہ ارادہ واپس لے لیا اور مدینہ منورہ میں رہ کر قیادت کرنے کا فیصلہ کیا (۳۱)۔

الغرض حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں مشورے کا عمل بہت وسعت کے ساتھ جاری رہا۔

۲۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں مشورے کی روایت:

حضرت ابوبکرؓ ہی کی طرح حضرت عمر فاروقؓ بھی تربیت نبوی کے زیر اثر...... مشورے کو بے حد پسند فرماتے تھے، چنانچہ

---

۲۷) ایضاً ص ۵۵

۲۸) ایضاً ص ۵۵

۲۹) ایضاً، ۵۷

۳۰) ایضاً ص ۶۰

۳۱) ایضاً ص ۵۰، ۵۳

مروی ہے وعن ضحاك قال كان عمر بن الخطاب يشاور حتى المرء ة (۳۱- الف)

حضرت عمر فاروقؓ بہت زیادہ (لوگوں سے) مشورہ کرتے تھے حتیٰ کہ عورت سے بھی۔

ایک دوسرے مآخذ میں ہے:

و كان القراء اصحاب مشورة كهولا وشبانا و كان وقافاً عند كتاب الله عزوجل (۳۱۔ب)۔

قرائے کرام حضرت عمرؓ کے حلقہء مشورہ کے لوگ تھے، ادھیڑ عمر کے بھی اور نوجوان بھی اور قرآن پاک کے حکم پر سب کا اتفاق ہوتا تھا۔

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کی وفات (۲۲۔ جمادی الآخرۃ ۱۳ھ) کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے مسند خلافت کو سنبھالا، تو انہوں نے ۔۔۔۔ باقاعدہ ''مجلس شوریٰ'' قائم کی، جس کے انتخاب کی اساس علم اور تقویٰ پر تھی۔ اس میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت عثمانؓ جیسے بزرگ بھی شامل تھے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے نوجوان صاحب علم لوگ بھی شامل تھے۔

امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے زمانے میں دو مجالس قائم کر دی رکھی تھیں ایک خصوصی مجلس تھی اور دوسری عمومی تھی اور جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ اس مجلس کے سامنے اسے پیش کرتے اور جو مشورہ ہوتا اس پر عمل کرتے۔ اس زمانے میں جن امور کے متعلق مشورہ ہوا ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ خلیفۃ المسلمین کی تنخواہ:

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی تنخواہ اور روزینے کے متعلق مشورہ کیا، اور جو تنخواہ مقرر ہوئی اسی پر گزارہ کیا۔ (۳۲)

۲۔ مرد کے لیے بیوی سے الگ رہنے کی مدت:

۳۔ مرد کے لیے کتنی راتوں تک اپنی عورت سے الگ ہو کر عبادت کرنا جائز ہے، فیصلہ ہوا تین راتیں اور چوتھی رات بیوی کے پاس گزارنا ہوگی۔ (۳۳)

۳۔ فوج میں فوجیوں کو کتنے عرصے کے بعد گھر آنا چاہیے۔

حضرت حفصہؓ نے چار ماہ کا مشورہ دیا، فیصلہ کیا کہ ہر فوجی چار ماہ بعد گھر آیا کرے اور رخصت گزارے۔ (۳۴)

۴۔ بیت المال کا مصرف۔

۴۔ بیت المال کے مصرف کے معاملے میں مشورہ کیا، کہ جو رقم جمع ہوتی ہے اسے کس طرح خرچ کیا جائے؟ حضرت علیؓ

۳۱۔الف) ابن حجر، فتح الباری، ۱۳/۲۴۱۔۳۴۲

۳۱۔ب) ایضا

۳۲) السیوطی، جلال الدین، تاریخ الخلفاء ص، ۱۰۰

۳۳) ایضا، ۱۰۰

۳۴) ایضا، ۱۰۲

نے مشورہ دیا کہ ہر سال جتنا مال جمع ہو خرچ کر دیا جائے، ولید بن ھشام بن المغیرہ نے رائے دی کہ لوگوں میں حسب مراتب تقسیم کیا جائے۔ چنانچہ ان کی رائے پر تمام لوگوں کے نام رجسٹر میں درج کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ۲۰ھ کا واقعہ ہے۔

۴۔ سوادِ عراق کے متعلق مشورہ

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں ''سوادعراق'' کا علاقہ فتح ہوا۔ اس موقع پر زیادہ تر صحابہ کرامؓ کی رائے تھی کہ اسے حسب اصول مجاہدین میں تقسیم کر دینا چاہیے، مگر حضرت فاروقؓ اس کے خلاف تھے، بالآخر تین دن کی بحث وتمحیص کے بعد جب حضرت عمر فاروقؓ نے سورۃ الحشر کی وہ آیت تلاوت کی جس میں والذین جاءوامن بعدھم (اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے) کا بھی ذکر ہے۔ تو فیصلہ ہوا کہ اراضی سرکاری تحویل میں رہے گی۔ (۳۵) اور صرف اس کے منافع تقسیم ہوں گے۔

۵۔ خلیفہ اسلام کی محاذ جنگ پر روانگی

دارالخلافہ میں یہ اطلاع آئی کہ اہل ایران نے قدیم علم (درفش کاویانی) نکال لیا ہے۔ جو ہرات سے مرصع ہے، جسے اس وقت ایران میں فتح وکامیابی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ آتش پارسی بھی ہے، اس موقع پر مشورہ ہوا کہ دشمن کے مقابلے میں خود خلیفہ اسلام کو خود نکلنا چاہیے یا نہیں؟ حضرت علیؓ کی رائے تھی کہ مسلمانوں کے خلیفہ کی حیثیت سے آپ کو مرکز سے ہرگز نہیں جانا چاہیے چنانچہ اسی پر فیصلہ ہوا کہ خلیفہ اسلام مرکز خلافت میں موجود رہیں گے۔ (۳۶)

۶۔ جنگ یرموک

۱۳ھ میں جنگ یرموک کے موقع پر بھی، اسی طرح کی مشاورت ہوئی۔ اس سال میں مسلمانوں اور رومیوں کے مابین یرموک کے مقام پر خوفناک جنگ لڑی گئی، بعض لوگوں کی رائے تھی کہ حضرت عمرؓ کو بذات خود محاذ جنگ پر جانا چاہیے، مگر حضرت علیؓ کی رائے پر ہی فیصلہ ہوا کہ امیر المؤمنین کو محاذ جنگ پر نہیں جانا چاہیے۔ (۳۷)

۷۔ فتح بیت المقدس

اسی طرح جب رجب ۱۶ھ میں مسلمانوں نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا، تو عیسائی علماء نے حضرت عمرؓ کو دعوت دی کہ وہ خود بیت المقدس آ کر معاہدہ کریں۔ تو اس موقع پر بھی مشاورت ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ خلیفۃ المسلمین بذات خود بیت المقدس تشریف لے جائیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسی رائے پر عمل کیا اور بیت المقدس تشریف لے گئے۔ (۳۸)

(۳۵ پوری تفصیل کے لیے دیکھیے محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، الوثائق السیاسیہ، ۳۵۴۔۳۵۵، (البدایہ والنہایہ، ۶/۳۱۴، ۳۱۵

(۳۶ نہج البلاغۃ، طبع دار الکتاب اللبنانی، ص ۲۰۳، ۲۰۴

(۳۷ نہج البلاغۃ، طبع دار الکتاب اللبنانی، ص ۲۰۳۔۲۰۴

(۳۸ ابن الاثیر، الکامل، ۳/۳۹۹۔۴۰۲، بذیل سال ۱۶ھ

۸۔ اسلامی تقویم کا اجراء

مسلمانوں کو اپنا کیلنڈر جاری کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ تو اس موقع پر بھی مشاورت ہوئی۔۔۔ کچھ لوگوں نے رومیوں اور کچھ لوگوں نے اہل فارس کا طریقہ اپنانے کا مشورہ دیا، کچھ لوگوں نے۔۔۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے تاریخ شروع کرنے کی رائے دی، حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ ہجرت مکہ کو اسلامی تقویم کی اساس قرار دیا جائے، اسی رائے کو تمام لوگوں نے پسند کیا اور حضرت عثمانؓ کی رائے پر ربیع الاول کی بجائے یکم محرم سے سال کی ابتداء کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔(۳۹)

۳۔ حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں مشورہ کی روایت

حضرت عثمان دور خلافت (۲۴۔۳۵ھ) کے دوران میں بھی مشورے کی یہ روایت قائم رہی۔ البتہ ان کے آخری دور خلافت میں مشورے کی روایت کمزور ہو گئی تھی۔۔۔ بہر حال ان کے زمانے میں جن امور پر مشورہ ہوا اور اس کے نتیجے میں جو فیصلے ہوئے، وہ درج ذیل ہیں:

ا۔ حضرت عثمانؓ کی بطور خلیفہ نامزدگی

حضرت عمر فاروقؓ نے۔۔۔ اپنی وفات سے قبل چھ افراد پر مشتمل ایک خصوصی کمیٹی مجلس شوریٰ تشکیل دی تھی اور حکم دیا تھا کہ میری وفات کے بعد تین دن کے اندر اندر یہ کمیٹی میرے جانشین کا تقرر کرے گی۔ اس کمیٹی میں حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے نام شامل تھے، لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادے کے بارے میں صراحت فرمادی تھی کہ ان سے مشورہ لیا جائے، مگر ان کو خلیفہ نامزد نہ کیا جائے، لہٰذا باقی پانچ افراد میں سے خلیفہ کا انتخاب کرنا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اس کمیٹی کے سربراہ تھے، امام سیوطی نے لکھا ہے کہ انہوں نے مدینہ منورہ کے ہر صاحب رائے سے مشورہ کیا، اس کمیٹی نے باتفاق رائے۔۔۔ حضرت عثمان کے حق میں فیصلہ دیا۔(۴۰)

۲۔ قرآن کریم کے نسخوں رمصحف عثمانی کی تیاری

جب حضرت حذیفہؓ بن یمان جنگ نہاوند سے واپس آئے تو انہوں نے حضرت عثمانؓ کو مشورہ دیا کہ اس امت کو قرآن کریم کے متعلق اختلاف سے بچا لیجیے، جس پر حضرت عثمانؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کی سربراہی میں صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کو مامور کیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں تیار ہونے والے نسخے کی نقول تیار کر کے تمام اسلامی شہروں میں اس کا ایک ایک نسخہ بجھوادیں اور لوگوں کو حکم دیں کہ وہ اسی نسخے کے مطابق قرآن مجید کے نسخے تیار کر کے ان سے تلاوت کریں، اس طرح امت ایک بڑے فتنے سے بچ گئی۔(۴۱)

اس طرح حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں بھی، دینی اور انتظامی معاملات میں مشاورت کا عمل جاری رہا۔

---

۳۹) البدایہ والنہایہ، ۷ر۷۴

۴۰) تاریخ الخلفاء، ص۔۱۱۰

۴۱) ابن حجر العسقلانی، الاصابہ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، ۲ر۶۳، عدد ۴۴۸

۴۔ حضرت علیؓ کے دور میں مشورہ کی روایت

حضرت علیؓ کے دور میں بھی مشورے کی یہ روایت جاری رہی، گو اس کی زیادہ مثالیں موجود نہیں، چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت علیؓ کا انتخاب

حضرت علیؓ کے خلفیہ کے طور پر انتخاب کے وقت مشورہ ہوا۔۔۔۔اور حضرت علیؓ کو اہل مدینہ کی اکثریت نے خلیفہ کے طور پر منتخب کیا اور ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔(۴۲)

۲۔ حاکمین کی تقرری

دوسرا موقع اس وقت آیا جب۔۔۔۔حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے مابین جنگ صفین کے اختتام پر فیصلہ ہوا کہ دونوں طرف سے۔۔۔ایک ایک حکم (منصف) کا کیا جائے۔۔۔۔اس موقع پر۔۔۔۔حضرت علیؓ کی رائے ابراہیم بن الاشتر کو اپنا نمائندہ بنانے کی تھی، مگر اکثریت کی رائے۔۔۔۔حضرت ابوموسیٰؓ کے حق میں تھی، اسی لیے ان کا تقرر کیا گیا۔(۴۳)

خلاصہ بحث

ان تمام روایات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں مشاورت کی بڑی اہمیت ہے اور اس وقت جب یورپ سمیت تمام دنیا میں ظلم اور جہالت کا دور دورہ تھا اور جب ساری دنیا پر جابرانہ نظام حکومت رائج تھا۔ اس وقت اسلام میں مشورے کی روایت اتنی مستحکم تھی کہ نبی اکرم ﷺ ہر چھوٹی بڑی بات میں لوگوں سے مشورہ لیتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ نے بھی مشورے کی اس روایت کو جاری رکھا، جبکہ) حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں ایک چھوٹی اور ایک بڑی، یعنی دو مجالس شوریٰ موجود تھیں، جن میں سے ایک کو کابینہ سے اور دوسری کو پارلیمنٹ سے مشابہت دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اپنے بعد خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے انہوں نے چھ افراد پر مشتمل ایک مجلس قائم کی، یہ ان کی وہی مجلس مشاورت تھی، جس سے وہ زندگی بھر تمام معاملات کے متعلق مشورہ کیا کرتے تھے اور اگر کوئی مسئلہ اس مجلس سے حل نہ ہوتا تو پھر وہ سرکردہ مہاجرین اور انصار خصوصاً قراء سے مشورہ لیا کرتے تھے اور ان کے مشورے کے مطابق عمل فرماتے (۴۴) اسی طرح حضرت عثمان اور حضرت علیؓ کے ادوار حکومت میں بھی مشورے کے اس قرآنی حکم اور نبی اکرم ﷺ کی سنت پر عمل جاری رہا۔

لیکن افسوس کہ بعد کے ادوار میں یہ سلسلہ برقرار نہ رہ سکا اور مشورے پر شخصی حکومتیں اور افرادی آمریتیں غالب آگئیں۔(۴۵)

---

۴۲) الزرکشی، البرہان، مطبوعہ ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء، ۱/۲۳۳ تا ۲۴۰

۴۳) البدایہ والنہایہ، ۴۰/۱۰۰

۴۴) ایضاً۔

۴۵) اس عنوان پر مزید تفصیل خصوصاً مغربی نقطہ نگاہ کے لیے دیکھیے A Political Studyof Islam George Allen and Unwin, :
Keith Callard

محمد اسد،

فصل چہارم:

پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) کی رکنیت کے لیے ضروری شرائط

ہر ادارے کی رکنیت کا مسئلہ خاصا اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ادارے کو اس کے ارکان ہی چلاتے ہیں اور وہی اس کی شناخت اور اس کی پہچان ہوتے ہیں.

اب دیکھنا یہ ہے کہ آئین پاکستان کی رُو سے مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کی رکنیت کے لیے کیا شرائط رکھی گئی ہیں۔

آئین کی دفعہ ۶۱ میں طے کیا گیا ہے:

کوئی شخص مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کا رکن منتخب ہونے یا چنے جانے کا اہل نہیں ہوگا، بجز اس کے کہ

(الف) وہ پاکستان کا شہری ہو۔

(ب) وہ قومی اسمبلی کی صورت میں پچیس سال سے کم عمر کا نہ ہو اور کسی انتخابی فہرست میں ووٹر کی حیثیت سے (اول) پاکستان کے کسی حصہ میں، کسی عام نشست یا غیر مسلموں کے لیے مخصوص کسی نشست پر انتخاب کے لیے درج ہو اور (دوم) کسی صوبہ میں ایسے علاقہ میں جہاں سے خواتین کے لیے مخصوص نشست پر انتخاب کے لیے رکنیت چاہتا ہو، درج ہو۔ (۱)

(ج) وہ سینٹ کی صورت میں تیس سال سے کم عمر کا نہ ہو (۲) اور کسی صوبے میں کسی علاقے میں یا جیسی بھی صورت ہو، وفاقی دارالحکومت یا دفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات میں جہاں سے وہ رکنیت چاہتا ہو بطور ووٹر درج ہو۔

(د) وہ اچھے کردار کا حامل ہو اور عام طور پر احکام اسلام سے انحراف میں مشہور نہ ہو۔ (۳)

(ہ) وہ اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم رکھتا ہو اور اسلام کے مقرر کردہ فرائض کا پابند، نیز کبیرہ گناہوں سے مجتنب ہو۔

(و) وہ سمجھدار، پارسا ہو اور فاسق نہ ہو اور ایماندار اور امین ہو۔

(ز) کسی اخلاقی پستی میں ملوث ہونے یا جھوٹی گواہی دینے کے جرم میں سزا یافتہ نہ ہو۔

(ح) اس نے قیام پاکستان کے بعد ملک کی سالمیت کے خلاف کام نہ کیا ہو یا نظریہ پاکستان کی مخالفت نہ کی ہو۔

مگر شرط یہ ہے کہ پیرا (د) اور (ہ) میں مصرحہ نااہلیتوں کا کسی ایسے شخص پر اطلاق نہیں ہوگا جو غیر مسلم ہو، لیکن ایسا شخص اچھی شہرت کا حامل ہوگا۔

(ط) وہ ایسی دیگر اہلیتوں کا حامل نہ ہو جو مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے ایکٹ کے ذریعے مقرر کی گئی ہوں۔ (۴)

---

۱) بروئے لیگل فریم ورک آرڈر ۲۰۰۲ مورخہ ۲۱ اگست ۲۰۰۲ تبدیل کیا گیا۔ اس سے قبل ۱۹۷۳ء کے آئین آرٹیکل ۶۲ کی شق (ب) میں یہ الفاظ تھے: وہ قومی اسمبلی کی صورت میں پچیس سال سے کم عمر کا نہ ہو اور اس اسمبلی کے انتخاب کے لیے کسی انتخابی فہرست میں ووٹر کے طور پر درج ہو"۔

۲) اٹھارہویں ترمیم کی رُو سے اب سینٹ کی رکنیت کے لیے عمر کی حد ۳۵ برس کر دی گئی، دیکھیے آئین پاکستان، ص ۴۰، دفعہ ۶۲۔

۳) ۱۹۷۳ء کے آئین (دفعہ ۶۲۔ شق (د)...... میں یہ الفاظ شامل تھے: وہ ایسی دوسری اہلیتیں رکھتا ہو جو پارلیمنٹ ایکٹ کے تحت مقرر کی جائیں گی...... مگر ۱۹۸۵ء میں اس کی جگہ نئی دفعات (د) تا (ط) شامل کی گئیں اور (د) والی شق کو (ط) کے تحت لایا گیا ہے۔

۴) آئین پاکستان مطبوعہ ۲۰۰۲ء ص ۱۰۵ ا ۱۰۶۔ دفعہ ۶۱

اہلیت کی شرائط کا تاریخی پس منظر

اس کی مزید تفصیل اس طرح ہے کہ فروری ۱۹۸۵ء میں ملک بھر میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے جو غیر جماعتی انتخابات منعقد ہوئے تھے اس ضمن میں الیکشن کمیشن نے ۱۲ جنوری ۱۹۸۵ء کو امیدواروں کی اہلیت کے لیے انتخابی قواعد وضوابط کا اعلان کیا تھا اور اس بات پر زور دیا تھا کہ جب تک کوئی امیدوار مقررہ شرائط پر پورا نہیں اترتا، اس وقت تک اسے قومی وصوبائی اسمبلی یا سینٹ کے انتخاب میں حصہ لینے کا حق نہ ہوگا۔ ان قواعد وضوابط کی پابندی کا مقصد یہ تھا کہ انتخابات کے ذریعے ایسے افراد سامنے آئیں جو اپنی خواہشات کو قابو میں رکھیں اور ملکی مفاد کو ہر چیز پر ترجیح دیں تا کہ ملکی استحکام کو یقینی بنایا جائے۔ اسی بنا پر اس وقت کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے زمانے میں دفعہ ہذا میں ترمیم کر کے مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لیے اہلیت پر مزید شرائط کو شامل کیا گیا۔ اس کے مطابق کوئی بھی شخص صرف ان شرائط کے ساتھ مجلس شوریٰ کا رکن منتخب ہونے یا چنے جانے کا اہل ہے۔

(الف) پاکستان کا شہری نہ ہو

اس کے لیے جائے پیدائش وغیرہ کی کوئی شرط نہیں ہے، یعنی ایک شخص بھارت میں پیدا ہوا تھا، لیکن تقسیم کے بعد پاکستان آ گیا اور اس نے پاکستان کی شہریت حاصل کر لی۔ وہ انتخاب میں حصہ لینے کا اہل ہے۔

(ب) قومی اسمبلی کا رکن بننے کے لیے اس کی عمر پچیس سال سے کم ہو اور اس اسمبلی میں کسی مسلم یا غیر مسلم نشست کے لیے جیسی بھی صورت ہو انتخاب کے لیے اس کا نام انتخابی فہرست میں ووٹر کی حیثیت سے درج ہو، نیز کسی صوبے میں ایسے علاقے میں جہاں سے خواتین کے لیے مخصوص نشست پر انتخاب کے لیے رکنیت چاہتا ہو، درج ہو۔

(ج) سینٹ کے امیدوار کی صورت میں تیس سال (۵) سے کم عمر کا ہو اور اس کا نام کسی صوبے میں، کسی علاقے میں یا جیسی بھی صورت ہو وفاقی دارالحکومت یا وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات میں جہاں سے وہ رکنیت چاہتا ہو بطور ووٹر درج نہ ہو۔

(د) اچھے کردار کا حامل ہو اور اسلامی تعلیمات کے منافی کام کرنے کی شہرت رکھتا ہو۔

(ہ) اسے اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم نہ ہو اور وہ اسلام کے مقرر کردہ فرائض کا پابند نیز کبیرہ گناہوں سے اجتناب نہ کرتا ہو۔

(و) وہ سمجھدار، پارسا نہ ہو اور فاسق ہو اور ایماندار اور امین بھی نہ ہو۔

(ر) کسی اخلاقی جرم سے ارتکاب پر یا جھوٹی گواہی دینے کے جرم میں سزا یافتہ ہو۔

(ح) قیام پاکستان کے بعد ملکی سالمیت اور استحکام کے خلاف کام کرتا رہا ہو یا نظریہ پاکستان کا مخالف ہو اور دل و جان سے پاکستان کو نہ چاہتا ہو۔

نوٹ: پیرا (د) اور (ہ) کا اطلاق غیر مسلموں پر نہیں ہوتا، تاہم ان کے اچھے کردار کا حامل ہونا ضروری ہے۔

(ط) مجلس شوریٰ کے ایکٹ کے تحت اہلیت کی جو شرائط مقرر کی گئی ہیں، ان پر پورا نہ اترتا ہو۔

---

(۵) آئین میں 2010ء میں ہونے والی ترامیم کے مطابق۔۔۔اب سینٹ کی رکنیت کے لیے عمر کی حد ۳۵ برس کر دی گئی ہے، دیکھیے ص ۳۸۔۴۲

THe Constitution of the republic of Pakistan 1973, (as amended by the constitution eighteenth amendment act 2010) Ar.62

ایک اسلامی ملک ہونے کے ناطے سے مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لیے جو شرائط مقرر کی گئی ہیں۔ان پر اگر پوری طرح سے عمل درآمد ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان میں ایک مثالی معاشرہ قائم نہ ہو سکے۔(۶)

۲۔ مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کی رکنیت کے لیے نااہلیت

اس آرٹیکل کو مزید واضح کرنے کے لیے آئین کی شق نمبر ۶۳ کا اضافہ کیا گیا۔ جس میں قومی اسمبلی کی رکنیت سے نااہلی کے لیے......درج ذیل دفعات شامل کی گئیں۔

(۱) کوئی شخص مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے رکن کے طور پر منتخب ہونے یا چنے جانے اور رکن رہنے کے لیے نااہل ہوگا اگر:

(الف) وہ فاتر العقل ہو اور کسی مجاز عدالت کی طرف سے ایسا قرار دیا گیا ہو۔یا

(ب) وہ غیر برات یافتہ دیوالیہ ہو یا

(ج) وہ پاکستان کا شہری نہ رہے اور کسی بیرونی ریاست کی شہریت حاصل کرے۔یا

(د) وہ پاکستان کی ملازمت میں کسی منفعت بخش عہدے پر فائز ہو، ماسوائے ایسے عہدے کے جسے قانون کے ذریعے ایسا عہدہ قرار دیا گیا ہو جس پر فائز شخص نااہل نہیں ہوتا۔ یا

(ہ) اگر وہ ایسی آئینی ہیئت یا کسی ایسی ہیئت کی ملازمت میں ہو، جو حکومت کی ملکیت یا اس کے زیر نگرانی ہو یا جس میں حکومت تعدیلی حصہ یا مفاد رکھتی ہو۔یا

(و) شہریت پاکستان ایکٹ ۱۹۵۱ء (نمبر ۲ بابت ۱۹۵۱ء) کی دفعہ ۱۴۔ب کی وجہ سے پاکستان کا شہری ہوتے ہوئے اسے فی الوقت آزاد جموں وکشمیر کی قانون ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کا نااہل قرار دے دیا گیا ہو۔یا

(ز) وہ کسی ایسی رائے کی تشہیر کر رہا ہو یا کسی ایسے طریقے پر عمل کر رہا ہو جو نظریہ پاکستان یا پاکستان کے اقتدار اعلیٰ، سالمیت یا سلامتی یا اخلاقیات، یا امن عامہ کے قیام یا پاکستان کی عدلیہ کی دیانت داری یا آزادی کے لیے مضر ہو، یا جو پاکستان کی مسلح افواج یا عدلیہ کو بدنام کرے یا اس کی تضحیک کا باعث ہو۔(۷) یا

☆ (ح) وہ کسی مجاز سماعت عدالت کی طرف سے فی الوقت نافذ العمل کسی قانون کے تحت بدعنوانی، اخلاقی پستی یا اختیار یا اتھارٹی کے بیجا استعمال کے جرم میں سزایاب ہو چکا ہو، یا

(ط) وہ پاکستان کی ملازمت یا وفاقی حکومت، صوبائی حکومت یا کسی مقامی حکومت کی طرف سے قائم کردہ یا اس کے زیر اختیار کسی کارپوریشن یا دفتر کی ملازمت سے غلط روی یا اخلاقی پستی کی بنا پر برطرف کر دیا گیا ہو، یا

(ی) وہ پاکستان کی ملازمت یا وفاقی حکومت، صوبائی حکومت یا کسی مقامی حکومت کی طرف سے قائم کردہ یا اس کے زیر اختیار کسی کارپوریشن یا دفتر کی ملازمت سے غلط روی یا اخلاقی پستی کی بنا پر ہٹا دیا گیا ہو یا جبری طور پر فارغ خدمت کر دیا گیا ہو۔

اور](۸)

---

۶) زاہد حسین انجم۔ تشریحات آئین پاکستان، مطبوعہ منصور بک ڈپو، لاہور ۱۰۶

۷) شق نمبر (۱۵) سے شق نمبر (ز) کا اضافہ ۱۹۸۵ء کی ترمیم میں شامل کیا گیا جس کا مقصد مخصوص لوگوں کو پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اہل ثابت کرنا تھا۔

۸) بروئے لیگل فریم ورک آرڈر ۲۰۰۲ء بمورخہ ۲۱ اگست ۲۰۰۲ء تبدیل کیا گیا۔

(ک) وہ پاکستان کی یا کسی آئینی ہیئت یا کسی ہیئت کی جو حکومت کی ملکیت یا اس کے زیرِ نگرانی ہو یا جس میں حکومت تعدیلی حصہ یا مفاد رکھتی ہو، ملازمت میں رہ چکا ہو، تاوقتیکہ اس کی مذکورہ ملازمت ختم ہوئے دو سال کی مدت نہ گزر گئی ہو۔ یا

(ل) اسے فی الوقت نافذ العمل کسی دیگر قانون کے تحت کسی بدعنوانی یا غیر قانونی حرکت کا مجرم قرار دیا جائے تاوقتیکہ اس تاریخ کو جس پر مذکورہ حکم مؤثر ہوا ہو پانچ سال کا عرصہ نہ گزر گیا ہو۔ یا

(م) وہ سیاسی جماعتوں کے ایکٹ ۱۹۶۲ء (نمبر ۳ بابت ۱۹۶۲ء) کی دفعہ ۷ کے تحت سزایاب ہو چکا ہو، تاوقتیکہ مذکورہ سزایابی کو پانچ سال کی مدت نہ گزر گئی ہو۔ یا

(ن) وہ خواہ بذاتِ خود یا اس کے مفاد میں یا اس کے فائدے کے لیے یا اس کے حساب میں یا کسی ہندو غیر منقسم خاندان کے رکن کے طور پر کسی شخص یا اشخاص کی جماعت کے ذریعے، کسی معاہدے میں کوئی حصہ یا مفاد رکھتا ہو، جو انجمن امداد باہمی اور حکومت کے درمیان کوئی معاہدہ نہ ہو، جو حکومت کو مال فراہم کرنے کے لیے، اس کے ساتھ کیے ہوئے کسی معاہدے کی تکمیل یا خدمات کی انجام دہی کے لیے ہو۔(۹)

مگر شرط یہ ہے کہ اس پیرے کے تحت نااہلیت کا اطلاق کسی ایسے شخص پر نہیں ہوگا:

(اول) جب کہ معاہدے میں حصہ یا مفاد اس کو وراثت یا جانشینی کے ذریعے یا موصی لہ، وصی یا مہتمم ترکہ کے طور پر منتقل ہوا ہو، جب تک اس کو اس کے اس طور پر منتقل ہونے کے بعد چھ ماہ کا عرصہ نہ گزر جائے۔

(دوم) جب کہ معاہدہ کمپنیات آرڈیننس 1984ء (نمبر 47 مجریہ 1984ء) میں تعریف کردہ کسی ایسی کمپنی عامہ نے کیا ہو یا اس کی طرف سے کیا گیا ہو جس کا وہ حصہ دار ہو، لیکن کمپنی کے تحت کسی منفعت بخش عہدے پر فائز مختار انتظامی نہ ہو، یا

(سوم) جب کہ وہ ایک غیر منقسم ہندو خاندان کا فرد ہو اور اس معاہدے میں جو خاندان کے کسی فرد کے علیحدہ کاروبار کے دوران کیا ہو، کوئی حصہ یا مفاد نہ رکھتا ہو۔ یا

اس آرٹیکل میں ''مال'' میں زرعی پیداوار یا جنس جو اس نے کاشت یا پیدا کی ہو یا ایسا مال شامل نہیں ہے جسے فراہم کرنا اس پر حکومت کی ہدایت یا فی الوقت نافذ العمل کسی قانون کے تحت فرض ہو یا وہ اس کے لیے پابند ہو۔

(س) وہ پاکستان کی ملازمت میں حسب ذیل عہدوں کے علاوہ کسی منفعت بخش عہدے پر فائز ہو، یعنی:

(اول) کوئی عہدہ جو ایسا کل وقتی عہدہ نہ ہو جس کا معاوضہ یا تو تنخواہ کے ذریعے یا فیس کے ذریعے ملتا ہو۔

(دوم) نمبردار کا عہدہ خواہ اس نام سے یا کسی دوسرے نام سے موسوم ہو۔

(سوم) قومی رضا کار۔

(چہارم) کوئی عہدہ جس پر فائز شخص، مذکورہ عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے کسی فوج کی تشکیل یا قیام کا حکم وضع کرنے والے کسی قانون کے تحت فوجی تربیت یا فوجی ملازمت کے لیے طلب کیے جانے کا مستوجب ہو(۱۰)، یا

---

۹) اس آرٹیکل میں ''مال'' میں زرعی پیداوار یا جنس جو اس نے کاشت یا پیدا کی ہو یا ایسا مال شامل نہیں ہے، جسے فراہم کرنا اس پر حکومت کی ہدایت یا فی الوقت نافذ العمل کسی قانون کے تحت فرض ہو یا وہ اس کے لیے پابند ہو۔

۱۰) (ط) اور مابعد کی دفعات ۱۹۸۵ء کی ترمیم کے ذریعے اضافہ کی گئیں۔ جن کا مقصد اوپر بیان ہو چکا ہے، دیکھیے آئین پاکستان مطبوعہ ۲۰۰۶ء ص ۱۰۷۔۱۰۹۔ دفعہ ۶۳ و ذیلی دفعات۔

(ع) وہ کسی عدالت مجاز کی طرف سے فی الوقت نافذ العمل کسی قانون کے تحت مفرور ہونے کی بنا پر سزا یاب ہو چکا ہو اور اسے قید کی سزا دی گئی ہو، یا

(ف) اس نے کسی بنک، مالیاتی ادارے، کوآپریٹو سوسائٹی یا کوآپریٹو ادارے سے اپنے نام سے یا اپنے خاوند یا بیوی یا اپنے زیر کفالت کسی شخص کے نام سے دو ملین روپے یا اس سے زیادہ رقم کا قرضہ حاصل کیا ہو جو مقررہ تاریخ سے ایک سال سے زیادہ عرصے کے لیے غیر اداشدہ رہے یا اس نے مذکورہ قرضہ معاف کرالیا ہو، یا

(ص) اس نے یا اس کے خاوند یا بیوی نے یا اس کے زیر کفالت کسی شخص نے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کرتے وقت چھ ماہ سے زیادہ عرصہ کے لیے سرکاری واجبات یوٹیلیٹی اخراجات بشمول ٹیلی فون، بجلی، گیس اور پانی کے اخراجات ادا نہ کئے ہوں۔

(۲) اگر کوئی سوال اٹھے کہ آیا مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کا کوئی رکن، رکن رہنے کے لیے نااہل ہو گیا ہے تو سپیکر یا جیسی بھی صورت ہو چیئرمین اس سوال کو مذکورہ سوال پیدا ہونے سے تیس دن کے اندر چیف الیکشن کمشنر کو بھیجے گا، اور

(۳) جب کہ شق (۲) کے تحت کوئی سوال چیف الیکشن کمشنر کو بھیجا جائے تو وہ مذکورہ سوال کو الیکشن کمیشن کے سامنے رکھے گا جو چیف الیکشن کمشنر کو اس کے وصول ہونے کے زیادہ سے زیادہ تین ماہ کے اندر اس کے بارے میں اپنا فیصلہ دے گا۔(۱۱)

اراکین اسمبلی کی اہلیت پر تبصرہ

آئین کی......اراکین اسمبلی کی اہلیت کے بارے میں مذکورہ بالا دفعات پاکستان کی ۳۷ سالہ (۱۹۷۳-۲۰۱۰) پارلیمانی کارکردگی کی تاریخ بھی ہے۔ دراصل پاکستان میں اخلاقی، علمی اور سماجی رویوں کے فقدان کا یہ نتیجہ ہے کہ آئین بنانے والوں کی ساری کوششوں اور ماہرین قانون کی تمام کاوشوں کے باوصف پاکستان کی پارلیمنٹ کسی بھی موقع پر بالغ رائے وہی کا مظاہرہ نہیں کر سکی اور پاکستان کی یہ ۳۷ سالہ (اور اگر سابقہ تاریخ کو بھی شامل کرلیا جائے، تو تریسٹھ سالہ) تاریخ دراصل پارلیمنٹ اور اس کے قائدین کی ایک جیسی غلطیوں کے اعادوں اور قومی وملی معاملات میں ان کے افلاس کی تاریخ ہے، نامور ماہر آئین مسٹر محمد محمود لکھتے ہیں:

سپریم کورٹ نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی رکنیت کے لیے آئین میں بیان کردہ گریجویشن کی شرط پر فیصلہ روک رکھا ہے،......مگر چاروں معطل ہونے والی قومی وصوبائی اسمبلیوں کے لیے منتخب نمائندگان کا ریکارڈ کئی جلدوں پر مشتمل ہے، یہ ریکارڈ اس بات کا اظہار بھی کرتا ہے کہ سیاسی میدان کو افراد کی ایک جماعت نے تباہ کیا، جو ایک خاص خلعت یافتہ طبقے کی نمائندگی کرتے تھے، جو اس بات کی ضمانت فراہم کرتا ہے کہ اگر وہ منتخب نہ ہوئے تو ان کا کوئی بھانجا یا بھتیجا اسمبلی کا رکن منتخب ہو جائے گا، بلا امتیاز ان کے نظریاتی معیار کے، ان کی بنیادی کوششیں سیاسی میدان میں قدم جمانے کے لیے ہوتی ہیں۔ یہاں بہت سی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ سیاسی داؤ پیچ کے ذریعے خاندان کا ایک فرد حزبِ اختلاف میں چلا گیا اور دوسرا فرد ''حزبِ اقتدار'' کا حصہ بن گیا(۱۲)۔

اسی بنا پر دوسرے ملکوں کے برعکس پاکستان میں ''جمہوری'' دور کی روایات مسلسل ناکامیوں کی آئینہ دار ہیں...... چنانچہ سپریم کورٹ نے اپنے ایک فیصلے میں لکھا:

---

۱۱) بروئے لیگل فریم ورک آرڈر ۲۰۰۲ بمورخہ ۲۱ اگست ۲۰۰۲ء تبدیل کیا گیا۔

۱۲) The Constitution of the Republic of Pakistan ص426۔۔۔۔تشریح دفعہ 62

''جو کچھ اوپر بیان کیا گیا، اس کی روشنی میں یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ عوامی نمائندگان کے متعلق پاکستان کا سیاسی منظرنامہ افسوس ناک ناکامیوں کی داستان ہے،...... چنانچہ پاکستان کی گیارہ سالہ (۱۹۸۸-۱۹۹۹ء) سیاسی تاریخ...... ''چشم کشا'' ہے۔ اس عرصے میں حکومتی ناشائستہ رویوں اور جماعت سازی میں ناکامی کی بنا پر چار اسمبلیاں برخاست کی گئیں...... جن وجوہات کی بنا پر یہ اسمبلیاں برخاست کی گئیں اور سپریم کورٹ نے اس کی تائید کی، وہ ملک کے سیاسی کلچر میں تبدیلی کی بخوبی غمازی کرتا ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ عوامی نمائندگی کا حق ہے کہ وہ اپنی سیاسی جماعت کے ساتھ وابستگی رکھیں، لیکن اس سے ان کا یہ حق ختم نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ذمہ داری اور اس ذمہ داری کی اہمیت کا خیال رکھیں کہ تیرھویں اور چودھویں ترمیم کے وقت ہال کو کس طرح بلڈوز کیا گیا اور کسی بھی شخص نے اس مجوزہ آئین کے موقع چھوٹی انگلی بھی نہیں اٹھائی، حالانکہ ان ترامیم نے آئین کا حصہ بننا تھا اور یہ کوئی عام قانون نہیں تھا۔ آئین میں ہونے والی ترامیم ذمہ دارانہ فکر، تبادلہ خیالات اور تشکیل کا تقاضا کرتی ہیں، جو یہاں مکمل طور پر مفقود تھیں یا اسے کسی طرح بھی سنجیدگی سے نہیں لیا گیا...... درحقیقت ان معاملوں میں جس رویے کا مظاہرہ کیا گیا، وہ محض ایک پارلیمانی ڈکٹیٹرشپ تھا...... پارلیمنٹ میں جماعتی سربراہ کا خیال عوام یا ان کے نمائندوں کی خواہشات کا قائم مقام نہیں ہوسکتا...... یقیناً اُسے محض تعلیم کی بنا پر کسی سے منسوب نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ اس سے بھی زیادہ اہم مسئلے کا نتیجہ ہے، یعنی یہ کہ سیاسی نمائندوں نے جماعتی سربراہ کو یہ اجازت دے دی ہے کہ وہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلائے''(۱۳)۔

ایک ایسی پارلیمنٹ...... جس کی حالت حسب بالا ہو...... کیا ایسے اجتہاد کی اہل ہے، جو لوگوں کے لیے مستقل اور پائیدار بنیادوں پر جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے مسائل کو حل کرے۔

پھر جہاں تک تعلیمی اہلیت کا تعلق ہے پرویز مشرف حکومت نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی رکنیت کے لیے بی-اے پاس ہونے کی شرط رکھی...... تاہم اس پارلیمنٹ کا جو حال ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔ سپریم کورٹ نے ۲۰۰۹ کے اپنے ایک فیصلے میں لکھا ہے:

''بے شک روایتی تعلیم ایک ایسی شے ہے، جسے حاصل تو کیا جاسکتا ہے، مگر وراثۃً نہیں پایا جاسکتا، آئین کی شق ۶۲ میں دی گئی تعلیمی اہلیت...... ایک یا دو استثناؤں کے ساتھ ایسی ہے جسے انسانی کوشش کے ساتھ حاصل نہیں کیا جاسکتا، جیسے شہریت اور عمر وغیرہ، جبکہ فطری جوہر، جیسے دانش، علم یا سمجھ بوجھ بھی ایسے ہی زمرے میں داخل ہے اور عام طور پر روایتی تعلیم پر موقوف نہیں ہے جو لوگوں کی ذاتی خوبیوں کو چمکانے یا بہتر بنانے کا کام کرتی ہے۔

درحقیقت دانش اور علم ''عطیۂ الٰہی'' ہیں اور پیدائشی یا موروثی بھی ہوسکتے ہیں اور عام طور پر استاد سے تحصیل علم پر موقوف نہیں ہیں۔ ہمارے معاشرے میں پیدائشی سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگ بکثرت موجود ہیں اور ایسے لوگوں کی خدمات سے معاشرے کو محروم رکھنا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔ کسی فرد یا طبقے کی کارکردگی، خواہ وہ خواندہ ہو یا ناخواندہ، خواہ وہ اچھی ہو یا بری، اس کا کوئی معیار مقرر نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً عوامی نمائندگی کے شعبے کے بارے میں آئین بنانے والے پہلے ہی اہلیت سے متعلقہ تعلیم کا لحاظ رکھ چکے ہیں...... جیسے کہ دفعہ ۶۲ کی ذیلی شق (ھ) اور (د) میں ہے کہ امیدوار اسلامی تعلیمات اور اعمال کا اور اسلام نے جو واجبات اس پر

---

۱۳) دیکھیے، PLD---2002 سپریم کورٹ 994

عاید کیے ہیں، ان کے بارے میں ضروری علم رکھتا ہو اور وہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے مبرا ہو اور تیز فہم، راست باز ہو، فاسق و فاجر نہ ہو، ایمان دار ہو، کیا پھر بھی کسی انتخاب میں حصہ لینے کے لیے کسی روایتی تعلیم کی ضرورت ہے۔ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ عوامی نمائندگی کا شعبہ ایسے افراد پر مشتمل ہو، جو اس طرح کی اہلیت رکھتے ہوں،...... عوامی نمائندگی کے شعبے میں ایسے افراد کی موجودگی برائیوں سے بھرے ہوئے معاشرے میں لوگوں کو بہتری کی طرف لے جائے گی۔ (۱۴)

الغرض ایسی واجبی سی تعلیم رکھنے یا سمجھ بوجھ رکھنے والوں سے شرعی اجتہاد کی توقع رکھنا محض احمقوں کی جنت میں رہنے والی بات ہے۔

۳۔ کسی رکن کے انحراف وغیرہ کی وجہ سے نااہلیت

قومی اسمبلی اور سینٹ کے اراکین پر حکومتی نگرانی بڑھانے اور انہیں نااہلی کی تلوار سے ڈرانے کے لیے خصوصی طور پر دفعہ ۱۶۳ اے کی ذیلی شق شامل کی گئی جو اصل آئین مجریہ ۱۹۷۳ء میں شامل نہ تھی۔ (۱۵) یہ آرٹیکل اور اس کی دفعات ۲۰۰۲ء کے لیگل فریم ورک میں شامل کیے گئے، جنہیں بعد ازاں آئین کا حصہ بنا دیا گیا، تفصیل درج ذیل ہے۔

(الف) اپنی سیاسی جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو جائے یا کسی دوسری پارلیمانی پارٹی میں شامل ہو جائے، یا

(ب) اس پارلیمانی پارٹی کی طرف سے جس سے اس کا تعلق ہو جاری کردہ حسب ذیل سے متعلق کسی ہدایت کے برعکس ایوان میں ووٹ دے یا ووٹ دینے سے اجتناب کرے۔

(اول) وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ کے انتخاب، یا

(دوم) اعتماد یا عدم اعتماد کے ووٹ، یا

(سوم) کسی مالی بل تو پارلیمانی پارٹی کا سربراہ تحریری طور پر اعلان کر سکے گا کہ وہ اس سیاسی جماعت سے منحرف ہو گیا ہے اور پارلیمانی پارٹی کا سربراہ اعلان کی ایک نقل افسر صدارت کنندہ کو بھیج سکے گا اور اس طرح اس کی ایک نقل متعلقہ رکن کو بھیجے گا مگر شرط یہ ہے کہ اعلان کرنے سے پہلے پارلیمانی پارٹی کا سربراہ مذکورہ رکن کو اس بارے میں اظہار وجوہ کا موقع فراہم کرے گا کہ کیوں نہ اس کے خلاف مذکورہ اعلان کر دیا جائے۔

(۲) کسی ایوان کا کوئی رکن کسی پارلیمانی پارٹی کا رکن ہوگا، اگر وہ ایسی سیاسی جماعت کے جو ایوان میں پارلیمانی گروپ تشکیل کرتی ہو امیدوار یا نامزد کے طور پر منتخب ہو کر یا کسی سیاسی جماعت کے امیدوار یا نامزد کی حیثیت کے علاوہ بصورت دیگر منتخب ہو کر مذکورہ انتخاب کے بعد تحریری اعلان کے ذریعے مذکورہ پارلیمانی پارٹی کا رکن بن گیا ہو۔

(۳) تحریری اعلان کی منظوری پر شق (۱) کے تحت ایوان کا پریذائیڈنگ آفیسر اعلان کو دو دن کے اندر اندر چیف الیکشن کمشنر کو روانہ کرے گا جو فیصلے کے لیے الیکشن کمیشن کے سامنے رکھے گا۔ اعلان کے توثیق پذیر ہونے یا نہ ہونے کی اطلاع چیف الیکشن کمشنر اس کے وصول ہونے پر تیس دنوں کے اندر کرے گا۔

(۴) اگر الیکشن کمیشن اعلان کو جاری رکھتا ہے تو رکن جس کا شق (۱) میں حوالہ دیا گیا ہے ایوان کی نشست سے محروم

---

۱۴) -PLD 2009,C. 107

۱۵) بروئے لیگل فریم ورک آرڈر ۲۰۰۲ء

ہو جائے گا اور اس کی نشست خالی ہو جائے گی۔(۱۶)

(۵) الیکشن کمشن کی جانب سے کیے گئے فیصلے پر اگر کوئی بھی پارٹی مطمئن نہیں ہو پاتی تو وہ تیس (۱۷) دنوں کے اندر سپریم کورٹ میں اپیل کر سکتی ہے جو درخواست کی وصولی کے تین ماہ کے اندر اندر معاملے کا فیصلہ کرے گا۔

(۶) آرٹیکل ہذا میں شامل کوئی امر ایوان کے سپیکر یا چیئرمین پر اثر انداز نہ ہوگا۔

(۷) آرٹیکل ہذا کی غرض کے لیے......

(الف) ایوان سے مراد فیڈریشن کے حوالے سے نیشنل اسمبلی یا سینٹ مراد ہے اور صوبے کے حوالے سے صوبائی اسمبلی مراد ہے جیسی کہ صورت ہو۔

(ب) صدر نشین سے مراد نیشنل اسمبلی کا سپیکر، سینٹ کا چیئرمین یا صوبائی اسمبلی کا سپیکر ہے جیسی کہ صورت ہو۔(۱۸)

۴۔ نشستوں کو خالی کرنا

آئین پاکستان کے تحت کسی بھی رکن کو استعفیٰ دے کر اپنی سیٹ خالی کرنے کی اجازت بھی دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں آئین کا آرٹیکل ۶۴ اس پر روشنی ڈالتا ہے۔ جس میں ہے:

(۱) مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کا کوئی رکن، اسپیکر یا جیسی بھی صورت ہو، چیئرمین کے نام اپنی دستخطی تحریر کے ذریعے اپنی نشست سے مستعفی ہو سکے گا اور اس کے بعد اس کی نشست خالی ہو جائے گی۔

(۲) ایوان کسی رکن کی نشست کو خالی قرار دے سکے گا، اگر ایوان کی اجازت کے بغیر وہ اس کے اجلاسوں سے مسلسل چالیس روز تک غیر حاضر رہے۔(۱۹)

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اگر مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کا کوئی رکن اپنا استعفیٰ سپیکر یا چیئرمین سینٹ کو نہ بھیجے اور براہ راست صدر کو پیش کر دے اور اس میں یہ تحریر نہ کرے کہ اسے سپیکر یا چیئرمین سینٹ کو بھیج دیا جائے۔ تو یہ موثر نہ ہوگا اور رکن مذکور کی نشست کو خالی قرار نہ دیا جا سکے گا۔(۲۰)

ب۔ پارلیمنٹ کا طریق قانون سازی

پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے، جو نظریہ اسلام کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا۔ اس لیے، اسلام اس کی ایک نظریاتی اساس ہے اور پاکستان کا آئین اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ پاکستان کے آئین کی تمہید میں جو قرارداد مقاصد شامل ہے جو اس سے قبل ۱۹۵۶ء کے آئین میں بھی شامل تھی۔ اس میں قانون سازی کے حوالے سے کہا گیا ہے:

''چونکہ اللہ تبارک تعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور پاکستان کے جمہور کو جو اختیار و اقتدار اس

---

۱۷) دیکھیے آئین پاکستان، مطبوعہ قومی اسمبلی سیکرٹریٹ، ص ۳۷۔۳۸، دیکھیے آئین پاکستان، مطبوعہ ۲۰۰۴، ص ۱۱۱

۱۸) بروئے لیگل فریم ورک آرڈر ۲۰۰۲، تبدیل کیا گیا

۱۹) ایضاً

۲۰) ایضاً، آئین مجریہ ۱۹۷۳، ص ۲۸

۲۱) Pld 1966، سیکشن 105

کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہوگا، وہ ایک مقدس امانت ہے۔

چونکہ پاکستان کے جمہور کی منشا ہے کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے، جس میں مملکت اپنے اختیارات واقتدار کو جمہور کے منتخب کردہ نمائندہ کے ذریعے استعمال کرے گا۔

جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں پر جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پوری طرح عمل کیا جائے گا۔

جس میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی حلقہ ہائے عمل میں اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق، جس طرح قرآن پاک اور سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے، ترتیب دے سکیں۔

جس میں قرار واقعی انتظام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی سے اپنے مذاہب پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

جس میں وہ علاقے جو اس وقت پاکستان میں شامل یا ضم ہیں اور ایسے دیگر علاقے جو بعد ازیں پاکستان میں شامل یا ضم ہوں ایک وفاق بنائیں گے، جس میں وحدتیں اپنے اختیارات واقتدار پر ایسی حدود اور پابندیوں کے ساتھ جو مقرر کردی جائیں، خودمختار ہوں گی۔

جس میں بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی اور ان حقوق میں قانون اور اخلاق عامہ کے تابع حیثیت اور مواقع میں مساوات، قانون کی نظر میں برابری، معاشرتی، معاشی اور سیاسی انصاف اور خیال، اظہار خیال، عقیدہ، دین، عبادت اور اجتماع کی آزادی شامل ہوگی۔

جس میں اقلیتوں اور پسماندہ اور پست طبقوں کے جائز مفادات کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے گا، جس میں عدلیہ کی آزادی پوری طرح محفوظ ہوگی۔" (۲۱)

اسی طرح آئین اور پاکستانی قوانین کی حکمت عملی کے تحت دفعہ ۳۱ میں "اسلامی طریق زندگی" کی بابت تحریر ہے:

(۳) (i) پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اسلام کے ابتدائی اصولوں اور بنیادی تصورات کے مطابق اپنی زندگیاں مرتب کرنے میں مدد دینے کے لیے اور قرآن پاک اور سنت نبوی کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھنے میں مدد دینے کی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے اقدام کیے جائیں گے۔

(۲) پاکستان کے مسلمانوں کے بارے میں مملکت مندرجہ ذیل کے لیے کوشش کرے گی:

(الف) قرآن پاک کی تعلیمات اور اسلامیات کو لازمی قرار دینا۔ عربی زبان سیکھنے کی حوصلہ افزائی کرنا اور اس کے لیے سہولت بہم پہنچانا اور قرآن پاک کی صحیح اور من وعن طباعت اور اشاعت کا اہتمام کرنا۔

(ب) اتحاد اور اسلامی اخلاقی معیاروں کی تعمیل کو فروغ دینا اور

(ج) زکوٰۃ و اوقاف اور مسجدوں کی مناسب تنظیم کا اہتمام کرنا۔ (۲۲)

اسی طرح آئین کی دفعہ ۳۸ (و) میں کیا گیا ہے:

---

(۲۱) ایضاً

(۲۲) آئین پاکستان، مطبوعہ ۲۰۰۴ء مقصود بک ڈپو لاہور، ص ۱۹۔۲۰

(و) حکومت ربوا کو جتنی جلد ممکن ہو ختم کرے گی۔(۲۳)

اس سے اگلی دفعہ میں اسلامی مملکتوں کے ساتھ تعلقات کو فروغ دینے کے بابت تحریر ہے:

(۴۰) مملکت اس بات کی کوشش کرے گی کہ اسلامی اتحاد کی بنیاد پر مسلم ممالک کے مابین برادرانہ تعلقات کو برقرار رکھا جائے اور مستحکم کیا جائے۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کے مشترک مفادات کی حمایت کی جائے۔ بین الاقوامی امن اور سلامتی کو فروغ دیا جائے۔ تمام قوموں کے مابین خیر سگالی اور دوستانہ تعلقات پیدا کیے جائیں اور بین الاقوامی تنازعات کو پرامن طریقوں سے طے کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔(۲۴)

پارلیمنٹ کا طریقہ قانون سازی

قانون سازی کے طریقہ کے متعلق آئین میں دفعہ ۶۷ میں ''عام طریق کار'' کے تحت مندرج ہے:

''آئین کے تابع کوئی ایوان اپنے ضابطۂ کار اور اپنی کارروائی کو منضبط کرنے کے لیے قواعد بنا سکتا ہے اور اسے اس بات کے باوجود کام کرنے کا اختیار ہوگا کہ اس کی رکنیت میں کوئی جگہ خالی ہو۔ نیز ایوان کی کوئی کارروائی اس بنیاد پر بے ضابطہ نہیں ہوگی کہ کچھ اشخاص جو ایسا کرنے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ کارروائی کے دوران بیٹھتے، ووٹ دیتے یا کسی اور صورت میں حصہ لیتے رہے۔

(۲) شق (۱) کے تحت قواعد بننے تک کسی ایوان میں ضابطہ کار اور کارروائی کے انصرام کو صدر کے بنائے ہوئے قواعد ضابطۂ کار کے تحت منضبط کیا جائے گا۔

پارلیمنٹ میں ہونے والی قوانین سازی کی یہ کارروائی کسی بھی فورم میں زیر بحث نہیں لائی جا سکتی۔ چنانچہ آئین کی دفعہ ۶۹(۲) میں پارلیمنٹ میں بحث پر پابندی کے عنوان کے تحت درج ہے:

عدالتیں پارلیمنٹ کی کارروائی کی تحقیقات نہیں کریں گی۔(۲۵)

اسی طرح اس سے اگلی دفعہ میں ہے:

۶۹(۱) پارلیمنٹ میں کسی بھی کارروائی کی درستی پر ضابطہ کار کی کسی بے قاعدگی کی بنیاد پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) پارلیمنٹ کا کوئی افسر یا کوئی رکن جسے آئین کے تحت یا اس کی رو سے پارلیمنٹ میں ضابطہ کار یا انصرام کارروائی کو منضبط کرنے کا یا نظم برقرار رکھنے کے اختیارات دیئے گئے ہوں۔ ان اختیارات کے استعمال کے معاملے میں کسی عدالت کے اختیار کے تابع نہیں ہوگا۔(۲۶)

اس کے بعد قانون سازی کے طریق کار کے تحت درج قواعد کا ذکر ہے۔

(ج) وفاقی قانون سازی کی فہرست کے حصہ اول (۳) کے بارے میں کسی بل کی ابتدا قومی اسمبلی میں ہوگی اور اگر وہ اسمبلی اسے منظور کر دے تو سینٹ کے غور کے لیے اس کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

---

۲۳) آئین پاکستان، شائع کردہ قومی اسمبلی سیکرٹریٹ ۱۹۷۳ء، ص ۱۵

۲۴) ایضاً، ص ۱۷، دفعہ ۳۸(د)

۲۵) ایضاً، ص ۱۷، دفعہ ۴۰

۲۶) آئین پاکستان، مجریہ ۱۹۷۳ء، ص ۲۹، ۳۰

(۲) سینٹ شق (۱۱) کے تحت بل کی وصولی کے نوے دن کے اندر مع یا بغیر ترمیم کے اسے منظور کر سکتی ہے، اگر سینٹ ایسا کرنے میں ناکام رہے تو اس مدت کے اختتام پر بل ترمیم کے بغیر اس سے منظور شدہ متصور ہوگا۔

(۳) اگر بل سینٹ سے ترمیم کے بغیر منظور ہو جائے یا اس کا اس طرح منظور کیا جانا متصور ہو تو وہ منظوری کے لیے صدر کو پیش کر دیا جائے گا۔

۴۔ اگر بل سینٹ سے ترمیم کے ساتھ منظور یا مسترد ہو جائے تو اس پر قومی اسمبلی دوبارہ غور کرے گی، اور اگر وہ بل قومی اسمبلی سے مع یا بغیر ترمیم کے دوبارہ منظور ہو جائے تو وہ منظوری کے لیے صدر کو پیش کر دیا جائے گا۔

۵۔ اس دفعہ میں مقرر کردہ طریق کے مقاصد کے لیے اس سوال کا فیصلہ کہ آیا، کوئی بل وفاقی قانون سازی کی فہرست کے حصہ اول میں کسی معاملہ سے متعلق ہے یا نہیں صدر کرے گا جس کا فاصلہ آخری ہوگا۔

۶۔ اس دفعہ میں اور آئین کے مابعد احکام میں وفاقی قانون سازی کی فہرست اور مشترکہ قانون سازی کی فہرست کا مطلب علی الترتیب چھوٹے جدول میں وفاقی قانون سازی کی فہرست اور مشترکہ قانون سازی کی فہرست ہے۔(۲۷)

اسی طرح وفاقی قانون کی فہرست کے حصہ دوم یا مشترکہ قانون سازی کی فہرست سے متعلقہ امور کے بل کے متعلق تحریر ہے:

(۱) وفاقی قانون سازی کی فہرست کے حصہ دو یا مشترکہ قانون سازی کی فہرست کے کسی امر کے بارے میں کسی بل کی ابتدا کسی بھی ایوان میں ہو سکے گی اور اگر ایک ایوان اسے منظور کر دے تو اسے دوسرے ایوان کو بھیج دیا جائے گا اور اگر دوسرا ایوان بھی اسے ترمیم کے بغیر منظور کر دے تو اسے منظوری کے لیے صدر کو پیش کر دیا جائے گا۔

(۲) اگر شق (۱) کے تحت کسی ایوان کو بھیجا ہوا کوئی بل مسترد ہو جائے یا وصولی کے نوے روز کے اندر منظور نہ ہو یا ترمیم کے ساتھ منظور ہو تو اس بل پر اس ایوان کی درخواست پر جس میں وہ پہلے پیش کیا گیا تھا ایک مشترکہ نشست میں غور کیا جائے گا۔

(۳) اگر شق (۲) کے تحت کوئی درخواست کی جائے تو صدر ایک مشترکہ اجلاس بلائے گا اور اگر مشترکہ اجلاس میں مع یا بغیر ترمیم کے دونوں ایوانوں کے کل ارکان کی اکثریت کے ووٹوں سے وہ بل منظور ہو جائے تو اسے منظوری کے لیے صدر کو پیش کر دیا جائے گا۔(۲۸)

---

۲۷) ایضاً، دفعہ ۶۹، ص ۳۰

۲۸) آئین پاکستان ۱۹۷۳ء، ص ۳۰۔۳۱

فصل پنجم:

مجتہد اور رکن پارلیمنٹ کے اوصاف و کردار کے حوالے سے موازنہ

ہم اس باب کی سابقہ فصول میں مجتہد اور ممبر پارلیمنٹ کے اوصاف و کردار کا مطالعہ کر آئے ہیں، اب ان دونوں کے مابین موازنہ کرنا مناسب اور موزوں ہوگا۔

(۱) علمی اور فکری مستوی:

''مجتہد'' کا منصب اور مقام خالصتاً ایک علمی اور فکری منصب ہے اور کوئی بھی عالم...... اس پر ایک طویل جد و جہد اور فکری اور عملی سرگرمیوں کے بعد ہی فائز ہوسکتا ہے، بلکہ...... دوسرے لوگ اس پر اسے فائز کرتے ہیں، یعنی معاشرہ اس کے اجتہادات کو قبول کر کے اسے یہ منصب عطا کرتا ہے، امام الغزالیؒ نے تو مجتہد کو، اس کی کاوش اور محنت کی بنا پر...... طلب علم کی سب سے اونچی چوٹی پر فائز قرار دیا ہے۔ امام لکھتے ہیں:

والاجتهاد التام ان يبذل الوسع في الطلب بحيث يحس من نفسه بالعجز عن مزيد طلب (۱)

''اور اجتہاد تام یہ ہے کہ کسی مسئلے کے حل کی تلاش میں اس قدر کوشش اور محنت صرف کی جائے کہ اس کا نفس اس سے مزید کوشش اور سعی سے عاجزی محسوس کرے''۔

اسی طرح...... امام الآمدی، علامہ الشاطبی، محمد ابوزہرہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور علامہ محمد بن اعلیٰ التھانوی اور دوسرے علماء و فقہاء نے بھی اسے مکمل طور پر ایک علمی اور فکری منصب قرار دیا ہے، جس کے لیے طویل محنت اور فکری جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے...... اور ان سب علماء نے ''مجتہد'' کے لیے طویل محنت و ریاضت کو ضروری قرار دیا ہے۔ (۲)

جبکہ دوسری طرف ''رکن پارلیمنٹ'' کے لیے علمی اور فکری طور پر کسی خاص مستوی کا حصول ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے سرے سے ہی علمی اہلیت شرط نہیں ہے، اس لیے دونوں کے مابین علمی اور فکری مستوی کے لحاظ سے بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔

(۱) اسی طرح گویا دوسرا...... مجتہد کو یہ مقام...... اس کی اعلیٰ ترین...... علمی اور فکری اہلیت اور استعداد کی بنا پر...... دیا جاتا ہے...... جبکہ...... رکن پارلیمنٹ کو یہ مقام...... محض سیاسی بنیادوں پر حاصل ہوتا ہے...... اور اس میں اس کی ذاتی اہلیت اور ذاتی لیاقت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

(۲) وقت کے لحاظ سے:

علاوہ ازیں مجتہد کو ملنے والا مقام...... دائمی اور ابدی ہوتا ہے، یہ حکومت یا کسی دوسرے ادارے کی طرف سے تفویض شدہ نہیں ہوتا، اور نہ ہی حکومت اسے سلب کر سکتی ہے...... البتہ...... حکومت اپنی رپورٹ یا اپنے کسی بیان میں اس کا اظہار ضرور کر سکتی ہے...... (۳)۔ جبکہ رکن پارلیمنٹ کا عہدہ مقید بہ وقت ہوتا ہے، اور اس کی مدت از روئے آئین پاکستان مجریہ ۱۹۷۳ء...... پانچ سال

---

۱) المستصفیٰ فی علم الاصول، ۲/۲۶۷

۲) دیکھیے اس باب کے شروع میں فصل اول، دوم

۳) دیکھیے ـــــ باب ہذا کی فصل اول، دوم: مجتہد کی اوصاف و شرائط

مقرر ہے، تاہم ...... مڈٹرم انتخابات کی صورت میں ...... اس سے پہلے بھی ...... یہ عہدہ ختم ہوسکتا ہے۔

(۳) کردار وعمل کے پہلو سے

''مجتہد'' اپنے علم وفضل اور اپنے صلاح وتقوی، اپنے مضبوط کردار اور اپنی نیکی کی بنا پر تمام معاشرے کے لیے قابل احترام ہوتا ہے ...... جبکہ ...... رکن پارلیمنٹ میں ...... ایسی اوصاف کا ہونا ...... ضروری نہیں ہے، ...... اور اس کے لیے محض کسی مملکت کا شہری ہونا اور صدر ضیاء الحق کی ترامیم کی رُو سے، اس کے خلاف کسی فوجداری مقدمے کا موجود نہ ہونا ...... اور ...... جنرل پرویز مشرف کی مسلط کردہ ترامیم کے مطابق ...... محض بی اے پاس ہونا (جسے بعد ازاں عدالت عالیہ نے ختم کردیا) اور موجودہ قانون کے مطابق محض پاکستان کا شہری ہونا کافی ہے۔

(۴) علمی اور فکری مہارت وممارست:

دونوں کے مابین سب سے بڑا فرق ...... علوم میں مہارت ممارست کا ہے ...... رکن پارلیمنٹ کے لیے ایسی کسی مہارت کا ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے، بلکہ خواندہ ہونے کی بھی شرط نہیں ہے، ...... جبکہ ...... مجتہد کے لیے ...... آٹھ علوم میں ...... خصوصی مہارت کا ہونا ضروری تصور کیا گیا ہے ...... اور جب تک کہ متعلقہ شخص میں ...... مطلوبہ اہلیت موجود نہ ہو، اس وقت تک اس کا کیا ہوا کوئی اجتہاد بھی مطلوبہ قبولیت حاصل نہیں کرسکتا۔

(۵) مملکت کا باشندہ ہونا:

رکن پارلیمنٹ کے لیے سب سے اہم شرط یہ ہے، کہ وہ اس مملکت کا باشندہ ہو ...... جس کا پارلیمنٹ کا وہ رکن بننا چاہتا ہے اور اس کا اس حلقے یا ملک عمومی کی ووٹر لسٹ میں نام کا اندراج بھی موجود ہو ...... جبکہ ...... مجتہد کے لیے ...... اس مملکت کا باشندہ ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اسی لیے کسی بھی مسلمان ریاست کا کوئی شخص اگر پاکستان میں بطور مہمان موجود ہو، تو اس کے اجتہادات کی وہی اہمیت اور وہی وقعت ہوگی، جو ...... کسی مقامی مفتی یا مجتہد کی ہوسکتی ہے، اسی طرح مثال کے طور پر پاکستان یا اس جیسی کسی بھی ریاست کے کسی مفتی یا مجتہد کا کیا ہوا اجتہاد بھی دوسری اسلامی مملکتوں اور ریاستوں کے لیے ...... وہی اہمیت رکھتا ہے، جو اس ریاست یا مملکت کے کسی شخص کا دیا ہوا فتویٰ یا ...... اجتہاد رکھتا ہے۔

یہاں یہ امر بھی خصوصاً قابل ذکر ہے کہ صدر جنرل پرویز مشرف کی خودساختہ صدارت کے دور میں جو آئینی ترمیمات ملک پر مسلط کی گئیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ پارلیمنٹ (قومی اسمبلی) کی رکنیت کے لیے کم از کم B.A. پاس ہونے کی شرط رکھی گئی اور حکومت کی طرف سے یہ کہا گیا کہ اس نے پڑھی لکھی اسمبلی تشکیل دی ہے ...... حالانکہ پاکستان میں گریجویشن کے نصاب پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ

تعلیم کے اس مرحلے تک پہنچنے والے ...... قانون خصوصاً شریعت کا واجبی سا علم ہی رکھتے ہیں۔ اور اس نصاب میں دینی تعلیم کے بجائے، انگریزی اور دوسرے علوم کی تعلیم وتدریس پر زور دیا گیا ہے، اور اسلامیات کا محض واجبی سا علم ...... اس میں شامل ہوتا ہے، جو محض چند سورتوں اور چند احادیث مبارکہ کے مطالعے تک محدود ہے۔

جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس نصاب تعلیم سے اس کے پڑھنے والے میں، اجتہادی خصوصیات تو کجا ...... ایک عام درجے کے عالم وفقیہ کی خصوصیات بھی پیدا نہیں ہوتیں، لہٰذا ایسے لوگوں پر مشتمل کسی ''مجلس'' کا کیا ہوا اجتہاد ...... خصوصاً اس صورت میں،

جب قانون سازی کے مروجہ طریق کار کے مطابق، قومی اسمبلی اور سینٹ میں کسی بھی رائے......کو اس کے علمی تناظر میں دیکھنے کے بجائے، محض اس کے سیاسی اور جمہوری تناظر میں پرکھا جاتا ہے، کوئی علمی اور فکری حیثیت نہیں رکھتا۔(۴)

(۶) عدالت کا ہونا:

امام الغزالی اور دوسرے ائمہ کرام نے فقیہ میں عدالت (منصب مزاج اور متقی ہونے) کو بھی شرط قرار دیا ہے۔(۵)

جہاں تک ارکان پارلیمنٹ میں ''عدالت'' کی موجودگی کا تعلق ہے، تو اگرچہ صدر ضیاء الحق کے دور (۱۹۸۵ء) میں ہونے والی ترمیمات میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ ارکان اسمبلی میں اخلاقی پہلو کو واضح کیا جائے اور یہ کوشش کی جائے کہ صرف نیک اور صالح لوگ ہی اس پارلیمنٹ کے رکن بن سکیں۔''(۶)

مگر بعد کی تاریخ کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ آنے والی حکومتوں نے آئین پاکستان میں شامل ان دفعات کو صرف سیاسی مخالفین کو دبانے کے لیے ہی استعمال کیا اور اس کے علاوہ، ایسی دفعات سے قطعاً کوئی مفید پہلو نہیں لیا گیا اور آئین میں شامل کی گئی ان دفعات میں......عدالتوں سے ''سزا یافتہ'' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے(۷) اور یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ پاکستان کی وڈیرہ شاہی'' جرم کرنے کے بعد، اس کی سزا سے بچنے کے لیے بڑے لمبے ہاتھ رکھتی ہے، اور پاکستان میں کسی بڑے شخص کا...... کسی بڑے سے بڑے مقدمہ میں سزا یافتہ ہونا قریب قریب ناممکن ہے، لہٰذا اگر متعلقہ شخص...... بڑے سے بڑا جرم کر چکا ہو، وہ قتل سے لیکر راہزنی اور ملک وقوم کی امانتوں کو لوٹنے اور سیاسی عہدے کو اپنی ذاتی تجوری بھرنے کے لیے استعمال کر چکا ہو، مگر اس کا جرم کسی عدالت کے ذریعے ثابت نہ ہو، یا کوئی شخص اس کا جرم عدالت میں ثابت نہ کر سکا ہو، تو ایسا شخص آئین پاکستان کی رو سے صالح اور نیک شخص ہی تصور ہوگا، اور اس کی پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اہلیت کو کوئی شخص بھی چیلنج نہیں کر سکتا۔'' اس پر مستزاد یہ کہ......صدر پرویز مشرف نے اپنے آخری دور میں، این۔آر۔او (NRO) کے ذریعے......سیکڑوں سیاسی مجرموں کو......اپنے خصوصی اختیارات سے......''براءت اور پاک دامنی'' کا سرٹیفکیٹ عطا کر دیا۔

اسی بنا پر نامور علمائے کرام نے...... پارلیمنٹ کو اجتہادی اختیار دینے کی سخت مخالفت کی ہے۔ چنانچہ نامور عالم دین مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''غضب یہ ہے کہ اجتہاد کا نازک کام آج کل وہ لوگ اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں جو اس کام کے سرے سے اہل ہی نہیں ہیں، اجتہاد کے لیے خاص قسم کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کی ضرورت ہے''(۸)

غالباً اسی مجبوری کی بنا پر......نامور ماہر قانون اور سیرت نگار......ڈاکٹر محمد حمید اللہ......سرکاری سرپرستی میں قانون سازی کے سرے سے ہی مخالف ہیں۔ انہوں نے خطبات بہاولپور میں، اپنے ایک خطبے'' تاریخ اصول فقہ واجتہاد'' اجتہاد کی موجودہ دور میں

---

(۴) اس کا مزید اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس مروجہ طریق کے مطابق، بہت ممالک، مثلاً جرمنی وغیرہ میں ''ہم جنس پرستی'' کو قانونی شکل دی جا چکی ہے اور باہمی رضامندی سے ہونے والی بدکاری کو دنیا کے اکثر ملکوں میں گناہ اور ''جرم'' کے زمرے سے خارج کیا جا چکا ہے۔

(۵) الغزالی، المستصفی، ۲/۰ ۱۷۔۱۷۱

(۶) دیکھیے آئین پاکستان، ص ۱۱۱

(۷) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ہفت روزہ زندگی، ۴۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء، ص ۱۰۔۱۱

(۸) محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، خطبات بہاولپور، خطبہ اصول فقہ واجتہاد، ص ۱۰۶۔۱۰۷، مطبوعہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء

قابل عمل شکل بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

''اسلامی قانون کا یہ اصول ہے کہ عدالت کو حکومت سے آزاد ہونا چاہئے، یہ اصول مغرب میں تو تسلیم کرلیا گیا ہے اور ہمارے ہاں بھی برقرار و جاری ہے، اسی طرح عہد نبوی کے بعد سے لیکر آج تک اسلام میں قانون سازی (اجتہاد) ایک پرائیویٹ چیز رہی ہے''۔ کبھی حکومت کا اجارہ (Monopoly) نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان فقہاء پوری آزادی کے ساتھ قانون کی ترقی میں مشغول رہے، قانون سازی حکومت کی صرف پارلیمنٹ تک محدود نہیں، ورنہ اسلامی قانون کی ترقی اس طرح نہیں ہوسکتی تھی، جس طرح عمل میں آتی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کا یہ اصول

قانون اور حکم ہے، بلکہ اسلامی روایت (Tradition) یہ ہے کہ قانون سازی حکومت کا اجارہ نہیں ورنہ حکومت کی سیاسی ضرورتوں کی وجہ سے قانون متاثر ہوگا۔(۹)

آگے چل کر وہ مزید فرماتے ہیں:

اس کے برخلاف اگر مسلمان فقہاء کو حسب سابق آزادی رہے کہ قانون سازی وہ خود کریں یعنی احکام کے متعلق اپنے قیاس اور اجتہاد کے ذریعے رائے دیں تو حکومت کے احکام کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ایک رائے دے گا، دوسرا شخص اس کے برعکس رائے دیگا، تیسرا شخص شاید دونوں کے بین بین رائے دے گا، اس طرح ایک عام بحث و مباحثہ کے بعد ہم کسی بہتر نتیجہ پر پہنچ سکیں گے۔ جو ملت کے لیے، حکومت کے لیے اور ساری انسانیت کے لیے کارآمد ہوسکتا ہے۔(۱۰)

نامور محقق اور عالم سید کرم شاہ الازھری نے بھی اسی کے قریب قریب رائے دی ہے اور لکھا ہے:

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں، کہ عہد حاضر میں بعض مشکل اور نئے مسائل ایسے ہیں، جن کو حل کرنے کے لیے اہل علم و دانش کے اجتہاد کی ضرورت ہے، لیکن ان مجتہدین کو ان اصول و ضوابط کو پیش نظر رکھنا ہوگا، جو کہ علمائے اصول نے بیان کیے ہیں اور یہ اہم کام انفرادی طور پر کرنے کی بجائے اگر اجتماعی طور پر کیا جائے، یعنی ایسے علماء و فضلا کی مجلس مقرر کی جائے، جو ان مسائل پر سیر حاصل بحث و تمحیص کے بعد کوئی فیصلہ صادر کرے تو یہ از حد مفید ہوگا۔(۱۱)

الغرض ملک کے شعور و آگہی اور فکر و دانش رکھنے والے نامور اور جید علمائے کرام نے ہمیشہ سرکاری سرپرستی میں ہونے والی قانون سازی کو ناپسند کیا ہے...... اور خصوصاً پارلیمنٹ...... میں ہونے والی قانون سازی کی شرعی حیثیت کے متعلق شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے......

---

۹) ایضاً، ص ۱۰۷۔ مطبوعہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

۱۰) ایضاً، ص ۱۰۸

۱۱) کرم شاہ پیر سید الازھری، مقالات، مرتبہ پروفیسر حافظ احمد بخش لاہور، ضیاء القرآن، پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۰ء۔ جلد دوم، ص ۹۴

باب چہارم

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے بارے میں جدید مفکرین کا نقطہ نگاہ

فصل اول:

علامہ جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، مولانا مودودی، علامہ محمد اسد

فصل دوم:

علامہ اقبال اور ان کے شارحین کا نقطہ نگاہ

فصل اوّل:

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے بارے میں جدید مفکرین کا نقطۂ نگاہ

پارلیمنٹ کے ''طریقۂ قانون سازی'' پر گفتگو کے بعد مناسب ہوگا کہ ہم پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے بارے میں جدید مفکرین کا نقطۂ نگاہ معلوم کریں، اس حوالے سے ہم علامہ جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ محمد اسد اقبال کے افکار و خیالات پر گفتگو کریں گے...... تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ علامہ جمال الدین افغانیؒ

الف) مختصر حالاتِ زندگی

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے حوالے سے، جن لوگوں نے اہم کردار ادا کیا، ان میں ایک نام علامہ جمال الدین افغانیؒ کا بھی ہے۔ علامہ جمال الدین افغانیؒ انیسویں صدی عیسوی کی انتہائی ممتاز شخصیت تھے، وہ افغانستان میں کنٹر (۱) کی ایک بستی اسعد آباد میں، ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸۔۱۸۳۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا نسب نامہ سید علی ترمذی محدث سے ہوتا ہوا...... حضرت حسین بن علیؓ تک پہنچتا ہے...... جس کی بنا پر انہیں ''السید'' بھی کہا جاتا ہے (۲)۔

چونکہ وہ فطری طور پر بلا کے ذہین و فطین واقع ہوئے تھے، اس لیے بہت کم عرصے میں انہیں جملہ اصول و مبادی پر عبور حاصل ہو گیا اور اٹھارہ برس کی عمر میں تمام مروجہ علوم و فنون کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ (۳) پھر وہ ہندوستان گئے، جہاں انہوں نے تیرہ ماہ تک قیام کیا...... اور انہوں نے یورپ کے جدید اسلوب پر علوم ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ (۴)

مشترق مسٹر بلنٹ لکھتا ہے کہ اس زمانے میں...... مسلمانوں کے مسائل کے حل اور ان کی ترقی کے لیے اجتھاد کا دروازہ کھولنے کی سخت ضرورت ہے۔ جس کے لیے خلافت کی توثیق ضروری ہے اس کا خیال تھا، کہ جب تک خلافت دوسری قوموں کے بجائے عربوں میں نہیں آ جاتی، خلافت میں ''اجتہاد'' کی اہلیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ (۵)

دوسری تجویز...... جو حقیقتاً...... علامہ جمال الدین افغانیؒ سے لی گئی ہے علما کی مرکزی کونسل کی تشکیل تھی، جو مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں قائم کی جائے...... جس کی ذمہ داری...... خلافت کے بارے میں کسی متفقہ فیصلے تک پہنچنے کے ساتھ...... اجتہادی مسائل میں امت کی رہنمائی بھی ہو۔ (۶)

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے، کہ علامہ جمال الدین افغانیؒ...... بھی...... دوسرے علماء کی ہی طرح پارلیمنٹ کو اجتھاد کا حق دینے کے بجائے...... علماء کی ایسی ''مجالس'' کو یہ حق دینے کے حق میں تھے، جو جید علمائے کرام پر مشتمل ہوں اور اس سے بھی آگے بڑھ

---

۱) مفتی محمد عبدہ، مقدمہ، کتاب، سید جمال الدین افغانی، الرد علی الدہریین، مکتبہ شعر و ادب، اندرون لوہاری دروازہ، لاہور، ص ۸۰۷۔

۲) اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ، شاہد حسین رازقی، سید جمال الدین افغانی، حیات و افکار، ص ۱۰۔۱۷

۳) Islam and modernism in Egypt, Sir Charlis Adams، اردو ترجمہ محمد مظہر الدین، مفتی محمد عبدہ (حالات زندگی)، مطبوعہ دختر اقبال اکیڈمی، ظفر منزل تاج پورہ، لاہور، ص ۵

۴) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۷، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۰ء، ص ۳۷۳

۵) Arabic thought in the cibral, Mr, Bullent، اوکسفورڈ، ص ۱۵۵۔۱۵۷

۶) ڈاکٹر احمد امین (مصری) زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، ص ۱۰۶

فصل اوّل:

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے بارے میں جدید مفکرین کا نقطہ نگاہ

پارلیمنٹ کے ''طریقۂ قانون سازی'' پر گفتگو کے بعد مناسب ہوگا کہ ہم پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے بارے میں جدید مفکرین کا نقطۂ نگاہ معلوم کریں، اس حوالے سے ہم علامہ جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ محمد اسد اقبال کے افکار و خیالات پر گفتگو کریں گے...... تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔علامہ جمال الدین افغانیؒ

الف) مختصر حالاتِ زندگی

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے حوالے سے، جن لوگوں نے اہم کردار ادا کیا، ان میں ایک نام علامہ جمال الدین افغانیؒ کا بھی ہے۔ علامہ جمال الدین افغانیؒ انیسویں صدی عیسوی کی انتہائی ممتاز شخصیت تھے، وہ افغانستان میں کنٹر(۱) کی ایک بستی اسعد آباد میں، ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸۔۱۸۳۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا نسب نامہ سید علی ترمذی محدث سے ہوتا ہوا...... حضرت حسین بن علیؓ تک پہنچتا ہے...... جس کی بنا پر انہیں ''السید'' بھی کہا جاتا ہے(۲)۔

چونکہ وہ فطری طور پر بلا کے ذہین وفطین واقع ہوئے تھے، اس لیے بہت کم عرصے میں انہیں جملہ اصول ومبادی پر عبور حاصل ہو گیا اور اٹھارہ برس کی عمر میں تمام مروجہ علوم وفنون کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔(۳) پھر وہ ہندوستان گئے، جہاں انہوں نے تیرہ ماہ تک قیام کیا...... اور انہوں نے یورپ کے جدید اسلوب پر علوم ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔(۴)

مشترق مسٹر بلنٹ لکھتا ہے کہ اس زمانے میں...... مسلمانوں کے مسائل کے حل اور ان کی ترقی کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھولنے کی سخت ضرورت ہے۔ جس کے لیے خلافت کی توثیق ضروری ہے اس کا خیال تھا، کہ جب تک خلافت دوسری قوموں کے بجائے عربوں میں نہیں آ جاتی، خلافت میں ''اجتہاد'' کی اہلیت پیدا نہیں ہو سکتی۔(۵)

دوسری تجویز...... جو حقیقتاً...... علامہ جمال الدین افغانیؒ سے لی گئی ہے علما کی مرکزی کونسل کی تشکیل تھی، جو مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں قائم کی جائے...... جس کی ذمہ داری...... خلافت کے بارے میں کسی متفقہ فیصلے تک پہنچنے کے ساتھ...... اجتہادی مسائل میں امت کی رہنمائی بھی ہو۔(۶)

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے، کہ علامہ جمال الدین افغانیؒ...... بھی...... دوسرے علماء کی ہی طرح پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کے بجائے...... علماء کی ایسی ''مجالس'' کو یہ حق دینے کے حق میں تھے، جو جید علمائے کرام پر مشتمل ہوں اور اس سے بھی آگے بڑھ

---

۱) مفتی محمد عبدہ، مقدمہ، کتاب، سید جمال الدین افغانی، الرد علی الدہریین، مکتبہ شعر و ادب، اندرون لوہاری دروازہ، لاہور، ص ۷۔۸۔

۲) اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ، شاہد حسین رازقی، سید جمال الدین افغانی، حیات و افکار، ص ۱۰۔۱۷

۳) Islam and modernism in Egypt, Sir Charlis Adams، اردو ترجمہ محمد مظہر الدین، مفتی محمد عبدہ (حالات زندگی)، مطبوعہ خترا قبال اکیڈمی، ظفر منزل تاج پورہ، لاہور، ص ۵

۴) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۷، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۰ء، ص ۳۷۳

۵) Arabic thought in the cibral, Mr, Bullent، اوکسفورڈ، ص ۱۵۵۔۱۵۷

۶) ڈاکٹر احمد امین (مصری) زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، ص ۱۰۶

کر.....ان کا یہ خیال تھا، کہ ایک مرکزی کونسل مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں قائم کی جائے، تاکہ اجتماعی اجتہاد میں مرکزیت پیدا کی جائے.

دراصل علامہ جمال الدین افغانی کی زندگی کا مشن پارلیمنٹ کے محدود اختیارات کے تعین سے بہت مختلف تھا..... مفتی محمد عبدہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جہاں تک ان کے سیاسی مقاصد کا تعلق ہے اور جس کی طرف انہوں نے اپنی زمام افکار موڑی تھی اور اپنی ساری زندگی اس جدوجہد میں صرف کی تھی اور اس راستے میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی تھی، وہ اسلامی حکومت کے ضعف کو دور کرنا اور اس کو طاقت ور کرنا ہے تاکہ وہ دنیا کی طالب اور طاقت ور اقوام کے شانہ بشانہ آگے بڑھ سکے''(۷)

۲۔ مفتی محمد عبدہ

مفتی محمد عبدہ علامہ جمال الدین افغانی ہی کی طرح اپنے دور کی ایک اہم ترین شخصیت تھے۔ وہ مصر کے مشہور و معروف مفکر، مصلح، داعی اور نامور عالم دین تھے، جن کے خیالات و افکار سے پورے عالم اسلامی نے استفادہ کیا.

مفتی محمد عبدہ کے والد عبدہ بن حسن کا تعلق..... ترکی نسل سے تھا، جو برسوں سے مصر میں آباد تھے، جب کہ ان کی والدہ ماجدہ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے جا کر ملتا ہے.....(۸).....اسی خاندان میں مفتی عبدہ نے..... ۱۸۴۹ء/ھ آنکھ کھولی۔(۹)

مفتی محمد عبدہ نے ۱۲ برس کی عمر میں قرآن کریم حفظ کیا..... بعد ازاں طنطنا کی احمد نامی مسجد میں مزید تعلیم کے لیے داخل ہوئے، مگر نظامِ تعلیم پرانا ہونے کی بنا پر دل نہ لگا اور گھر واپس آگئے(۱۰) انہی دنوں آپ کی شادی ہوگئی کچھ عرصے بعد شیخ خضر سے ملاقات نے ان پر جادوئی اثر ڈالا(۱۱) اور حصولِ علم کا شوق دوبارہ پیدا ہوگیا(۱۲)۔ ان سے کچھ کتب پڑھیں بعد ازاں جامعۂ ازہر میں چلے آئے اور مختلف علما خصوصاً شیخ حسن الطّویل سے استفادہ کیا(۱۳) اور پھر جامعۂ ازہر میں تدوین شروع کردی، انہی دنوں علامہ جمال افغانی کی مصر آمد ہوئی اور پھر وہ ان کے دامن سے وابستہ ہوگئے(۱۴)۔ مفتی صاحب بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور بڑے دوررس اثرات چھوڑے۔

۲۔ مفتی عبدہ کا انتقال

مفتی عبدہ یورپ جانے کے لیے اپنے ایک دوست کے ہاں اسکندریہ میں مقیم تھے، کہ چند روز کی علالت کے بعد، انہوں نے وہیں ۱۱ جولائی ۱۹۰۵ء کو انتقال کیا..... ان کی لاش کو قاہرہ میں لا کر دفن کیا گیا..... اور یوں علم و عمل کا یہ عظیم سورج اپنی تابانیوں کے ساتھ، خاک عدم میں اتر گیا اور اپنی یادیں چھوڑ گیا۔(۱۵)

---

۷) Mr. Bullent، ص ۱۰۰-۱۰۷

۸) احمد امین ڈاکٹر زعماء العصر الحدیث، مطبوعہ قاہرہ، ۱۹۸۶ء، ص ۲۵۵-۲۵۶۔

۹) محمد رشید، تاریخ الاستاد، ص ۲۲،۳، نیز دیکھیے Modernism in Egypt، ص ۳۲

۱۰)

۱۱) Sir Charless Adams، ص ۳۲، ۵۲، ۵۳

۱۲) عثمان امین، محمد عبدہ، (انگریزی)، مطبوعہ مشی گن، امریکہ، ص ۸۸۔۸۹

۱۳) تاریخ الامام، قاہرہ ۱۹۳۱ء، ص ۱۵۔۴۵۵

۱۴) ایضاً، ص ۹۴۵، ۴۹، نیز سرچالس، اڈمز، ص ۷۲

۱۵) ایضاً، Sir Charless Adams، ص ۷۲۔۷۳

۳۔ اجتہاد کے حوالے سے مفتی صاحب کے خیالات

مفتی محمد عبدہ نے جب مصر میں جنم لیا، اس وقت مصر...... اپنے اداروں کی تشکیل وتدوین نو کے مراحل میں تھا۔ مفتی صاحب نے اداروں کی تشکیل جدید میں بے حد اہم حصہ لیا، وہ برسوں مصری پارلیمنٹ کے بھی رکن رہے۔

''اجتہاد'' اور قانون سازی کے حوالے سے ان کی ذات بڑی اہمیت رکھتی ہے، مصر میں...... قانون سازی کے میدان میں ''ترکی'' میں اس نوع کے ہونے والے کام کو پیش نظر رکھا گیا، جہاں جدید قانون سازی کے لیے انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں...... اس نوع کی ایک ''مجلس قانون ساز'' تشکیل دی گئی تھی، مفتی عبدہ اس بات کے حامی تھے، کہ متعلقہ شرعی قوانین، بالخصوص شخصی حیثیت اور وقف کی ضابطہ بندی کا کام مقننہ کے بجائے علماء کو سونپنے اور ریاست کی طرف سے اس کے نفاذ کے لیے شرعی عدالتوں کی تاسیس کی جائے۔(۱۶)

مصر میں اس وقت کئی ایک غیر مسلم اقوام بھی رہتی تھیں اور مصر کے مسلمانوں کو ان قوموں سے روزمرہ زندگی میں سابقہ پڑتا تھا، اس وجہ سے بہت سے ایسے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے جن میں اسلامی شریعت کی تعبیر کی ضرورت تھی، مفتی عبدہ نے جدید مسائل کا حل اجتہاد کے ذریعہ نکالنے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے، ترقی پسندانہ انداز اختیار کیا۔ اس زمانے میں خاص طور پر ان کے دو فتوے بے حد تنقید کا نشانہ بنے، پہلا فتوی یہ تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے ذبح کیے ہوئے جانور کا گوشت کھانا مسلمانوں کے لیے جائز ہے، دوسرا یہ تھا، کہ ڈاک خانوں کے سیونگ بنک میں روپیہ رکھنا اور اس سے سود حاصل کرنا بھی جائز ہے، تاہم اس سے ان کا شمار مجتہدین میں ہونے لگا۔

مفتی عبدہ اس بات کے قائل تھے کہ ''جدید عدالتوں'' اور محکموں کے سربراہوں کو دینی اور شرعی فیصلوں کا حق حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ کام علما کا ہے، کہ وہ اس بارے میں قائدانہ کردار ادا کریں، تاہم مغربی تعلیم یافتہ طبقے اور خصوصی ماہرین قانون نے ان کی مخالفت کی اور یہ کام مقننہ (پارلیمنٹ) کے ذریعے کرانے، مغرب کی طرز پر قانون سازی اور جدید عدالتی نظام کی تجدید پر زور دیا...... جس کی قدامت پرست حلقے کی طرف سے...... زبردست مزاحمت ہوئی...... تاہم حکومت نے...... درمیانی راستے کو اپنائے رکھا۔(۱۷)

مفتی محمد عبدہ نے اس عنوان پر اپنے مقالات میں (مقالہ الثالثہ والثلاثون: ۳۳) میں بعنوان الشوریٰ...... اور پھر القانون اور الشوریٰ کے عنوانات کے تحت بحث کی ہے۔(۱۸)

مفتی عبدہ نے...... اپنے ان مقالات میں عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعے ''شوریٰ'' کے قیام پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے، کہ انسان چونکہ ذاتی طور پر، مختلف خواہشات اور مختلف جذبات کے ساتھ پیدا ہوا ہے...... اور یہ جذبات وخواہشات اس حد تک بندے پر حاوی ہو جاتی ہیں کہ انسان کو اپنی بات کے سوا کوئی اور شے اچھی اور خوب صورت دکھائی نہیں دیتی...... اور یہ ایک فطری شے ہے اور انسان اس پر قابو نہیں پا سکتا۔(۱۹)

دوسری طرف کوئی ایک شخص، خواہ کتنا ہی عالی فکر اور فطانت وذہانت کے لحاظ سے کتنا ہی بلند مرتبہ کیوں نہ رکھتا ہو، وہ پوری

(۱۶ A Layish and R. Shaham, Encyclopaedia of Islam, S.V. Tashri, 10/354.

(۱۷ ایضاً محل مذکور

(۱۸ دیکھیے الوقائع، عدد ۱۲۸۹، بابت ماہ صفر ۱۲۹۹ھ/۲۴ دسمبر ۱۸۸۱ء، ۲/۱۹۷

(۱۹ الوقائع، الجزء الثانی، ۱ھ، ۲/۱۹۲۔

نمائندے ہیں اور یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں کہ...... کوئی نمائندہ اپنے ان لوگوں کے معاملات سے، کسی بھی لمحہ غافل نہیں ہوسکتا، جنہوں نے اسے نمائندگی دی ہے...... پھر مختلف اخبارات اور رسائل کے ذریعے...... اس قانون کے متعلق عام آگہی ہو جاتی ہے...... اس طرح...... مجلس نمائندگان اور رعایا کے مابین صحافی ہی سفیر ہوتے ہیں۔(۲۵)...... اور عملاً اس لیے کہ یہ ایسا قانون ہے، جو عادلانہ اور مصالح پر منطبق ہونے والا ہے اور ایسا ہی قانون دلوں کے اندر جذب ہو جاتا ہے، خصوصاً اس لیے کہ اس کو وضع کرنے والے...... اس کے اپنے نمائندے ہیں اور نمائندہ اپنے بھیجنے والوں کی ''لسان ترجمان'' ہوتا ہے۔(۲۶)

ہماری اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سب سے افضل اور فائدہ کے لحاظ سے سب سے بہتر قانون تو وہی ہے، جسے شوریٰ کی بنیادوں پر وضع کیا جائے اور شوریٰ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی، جب تک کسی ایک جگہ میں جمع ہو کر عام مشورہ نہ ہو۔(۲۷)

اس بحث کے آخر میں مفتی عبدہ نے لکھا ہے کہ مصری لوگوں نے بڑے دکھ جھیلے ہیں اور وہ اس لائق ہیں، کہ وہ اپنے صحیح نمائندے چن سکیں اور مجلس شوریٰ میں بھیج سکتے ہیں۔(۲۸)

اس تفصیلی بحث سے واضح ہوتا ہے، کہ مفتی صاحب...... اس وقت تک مجلس شوریٰ کے ساتھ علماء کی کسی الگ یا ذیلی کونسل کے حق میں نہ تھے، اس کے برعکس، ان کا خیال تھا، کہ مجلس نمائندگان پوری بحث وتمحیص کے بعد، مسائل کے متعلق قانون سازی کرے گی اور وہ عوام کی مصالح اور قانون کی نزاکتوں کا پوری طرح خیال رکھیں گے۔(۲۹)

مفتی عبدہ ۲۵ جون ۱۸۹۹ء کو مجلس قانون ساز کے مستقل رکن مقرر ہوئے، ۲۹ جون کو انہوں نے مجلس کے پہلے اجلاس میں شرکت کی، مصر میں اس وقت نیابتی حکومت کی ابتدا ہوئی تھی، اور مجلس قانون ساز کے اختیارات محدود تھے اور اس کی حیثیت صرف مشاورتی تھی، اہم معاملات میں مجلس مداخلت کرتے ہوئے پس وپیش کرتی تھی، مفتی عبدہ نے مجلس قانون ساز کی بے حد خدمت کی، ان کی رائے ہمیشہ مجلس کے لیے بڑی وزنی ہوتی تھی، اس لیے وہ مجلس پر چھا گئے۔ ان کی کوششوں سے مجلس کی کارکردگی میں اضافہ ہوا اور مجلس پر عوام کا اعتماد بحال ہوا(۳۰)۔

دراصل مفتی عبدہ کے سامنے حالات مختلف تھے، ان کے سامنے جو مجلس شوریٰ تھی، وہ ایسی لوگوں پر مشتمل تھی، جو عربی زبان وادب سے واقف تھے، قرآن کریم کو اپنی مادری زبان میں پڑھتے اور سمجھتے تھے، لہٰذا اگر انہیں مفتی صاحب جیسے عالم دین کی قیادت اور رہنمائی میسر آجائے، تو ایسی مجلس قانون سازی کا حق رکھتی ہے۔

۳۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ۳ رجب ۱۳۲۱ھ/ ۲۵ دسمبر ۱۹۰۳ء کو ریاست حیدر آباد میں، اس کے ایک شہر اورنگ آباد میں

---

۲۵) ایضاً، ۲/ ۲۰۳ح۔
۲۶) ایضاً ۲/ ۲۰۳۔
۲۷) ایضاً، ۲/ ۲۰۳-۲۰۴
۲۸) ایضاً، ۲/ ۲۰۵۔
۲۹) لطف کی بات یہ ہے کہ یہ مقالہ الوقائع المصریہ میں مفتی محمد عبدہ ہی کے نام کے تحت چھپا مگر بعد ازاں مصر کے سیاسی لیڈر سعد زغلول پاشا نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ مقالہ اس کا ہے،...... واللہ اعلم۔
۳۰) سر چارلس ایڈمز، ص ۶۲-۶۳۔ نیز دیکھیے، المنار، جلد ۹/ شمارہ ۲۱، ص ۳۵۴-۳۵۵، بابت ماہ الجوزاء، ۱۲۹۸ھ/ جون ۱۹۲۰ء۔

پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید احمد حسن مودودی تھا۔

مولانا نے ابتدائی دینی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۹۱۴ء میں انہوں نے مولوی عالم کا امتحان دیا، لیکن زیادہ تر تعلیم گھر پر ہی دلائی گئی۔ ۱۹۱۸ء میں اپنے بڑے بھائی سید ابوالخیر مودودی (م ۱۹۷۹ء) کے ہمراہ اخبار مدینہ .... کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ سیاسی میدان میں تحریک خلافت (۱۹۱۹ء) میں حصہ لیا اور اس سال ہفتہ وار تاج، جبلپور کے مدیر بنے، لیکن اخبار کے بند ہونے پر ۱۹۲۰ء میں واپس چلے گئے۔

۱۹۲۱ء میں جمعیت علمائے ہند نے ہفت روزہ اخبار ''مسلم نکالا'' تو وہ اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، یہ اخبار بھی ۱۹۲۳ء میں بند ہو گیا، ۱۹۲۴ء میں تحریک خلافت کے رہنما مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد میں کام کرنے کے لیے دہلی چلے آئے۔ اسی دوران میں وہ جمعیت علمائے ہند کے اخبار الجمعیۃ کے بھی مدیر رہے، مگر ۱۹۲۸ء میں الجمعیۃ کی ادارت سے علیحدگی اختیار کر لی اور تصنیف وتالیف کے کام میں مصروف ہو گئے. اسی سال انہوں نے اپنی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' مکمل کی (۳۱)۔

۱۹۳۳ء میں انہوں نے اپنا رسالہ ترجمان القرآن جاری کیا جو ان کی وفات (۱۹۷۹ء) تک ان کی ادارت میں نکلتا رہا اور اب بھی ان کے مشن کی تکمیل کے لیے جاری ہے۔ اس وقت مسلمانانِ برعظیم تشکیل نو کے دور سے گزر رہے تھے، اس لیے مولانا نے اپنی جماعت بنانے کا اعلان کیا اور ابتدا میں وہ دارالسلام پٹھان کوٹ میں آ گئے، جہاں انہوں نے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی۔ وہ ۱۹۳۹ء میں وہاں سے منتقل ہو کر لاہور آ گئے اور ۱۹۳۹۔۱۹۴۰ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں کچھ عرصہ کے لیے اسلامیات کی تدریس بھی کرتے رہے۔

مولانا کو ۱۹۵۳ء میں رد قادیانیت کی تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں، فوجی عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی جو بعد میں منسوخ کر دی گئی۔

مولانا نے ۱۹۷۹ء میں انتقال کیا اور لاہور میں دفن ہوئے (۳۲)۔

مولانا مودودی ایک بڑے مصنف تھے۔ ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ۸۰ کے لگ بھگ ہے۔ جس زمانے میں وہ جیل میں رہے انہوں نے قرآن مجید کی ''تفسیر تفہیم'' القرآن کی تکمیل کرنا شروع کر دی جو وہ برسوں سے کر رہے تھے۔ یہ تفسیر چھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

۲۔ مولانا مودودی اور اجتہاد کا مسئلہ

مولانا مودودیؒ نے اسلامی ریاست ''فلسفہ نظام کار اور اصول حکمرانی'' میں ...... دوسرے موضوعات کے ساتھ ساتھ اسلام میں قانون سازی اور اجتہاد پر بھی اظہار خیال کیا ہے...... مولانا کے نزدیک ''اسلام میں دائرہ عبادت کے اندر قانون سازی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ البتہ عبادات کے علاوہ معاملات کے اس دائرے میں قانون سازی کی گنجائش موجود ہے جس میں کتاب وسنت خاموش ہے۔ ان کے نزدیک اسلام میں قانون سازی کی بنیاد یہ اصول ہے کہ عبادات میں صرف وہی عمل کرو، جو بتا دیا گیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی نیا طریقہ عبادت ایجاد نہ کرو اور معاملات میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے پابند رہو، جس چیز سے روک دیا گیا ہے، اس سے رک جاؤ اور جس چیز کے بارے میں شارع (اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) نے سکوت اختیار کیا

(۳۱) سید اسعد گیلانی، مودودی سید ابوالاعلیٰ، دراردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۲۱/۷۴۱۔

(۳۲) سید اسعد گیلانی، مولانا مودودی سے ملیے، مطبوعہ لاہور، ص ۷-۸۔

ہے اس میں تم اپنی صوابدید کے مطابق کرنے کے لیے آزاد ہو۔“

بعدازاں مولانا نے قانون سازی کے چار شعبے (تعبیر، قیاس، استنباط واجتهاد اور مصالح وغیرہ) کا ذکر کیا ہے،.....جن میں سے ہر ایک قانون سازی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے.....مصالح..... کے عنوان کے تحت..... قانون سازی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

جن معاملات میں شارع نے کوئی ہدایت نہیں دی ہے ان میں اسلام کے وسیع مقاصد اور مصالح کو ملحوظ رکھ کر ایسے قوانین بنانا جو ضرورت کو بھی پورا کریں اور ساتھ ساتھ اسلام کے مجموعی نظام کی روح اور اس کے مزاج کے خلاف بھی نہ ہوں اس چیز کو فقہاء نے مصالح مرسلہ اور استحسان وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔مصالح مرسلہ کے معنی ہیں ”وہ عمومی مصلحتیں جن کو ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے اور استحسان سے مراد یہ ہے کہ ایک معاملہ میں بظاہر قیاس تو ایک حکم لگاتا تھا، مگر عظیم تر دینی مصلحتیں ایک دوسرے حکم کا تقاضا کرتی ہیں۔اس لیے پہلے حکم کے بجائے دوسرے حکم کو ترجیح دیکر جاری کیا جائے۔(۳۳)“

اول: یہ کہ جو قانون اس طریقے پر بنایا جائے وہ مقاصد شریعت کے مطابق ہو، نہ کہ ان کے خلاف۔

دوم: یہ کہ جب وہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے، تو عام عقلیں اس کو قبول کریں۔

سوم: یہ کہ وہ کسی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یا کسی حقیقی مشکل کو رفع کرنے کے لیے ہو۔(۳۴)

۳۔اجماع

جیسا کہ یہ معلوم و مسلم ہے کہ اجماع..... قانون سازی یا مآخذ شریعت کا چوتھا ذریعہ اور مآخذ ہے اور عصر حاضر کے مجتہدین نے..... پارلیمنٹ کے تحت ہونے والی قانون سازی کو..... اس کا مصداق قرار دیا ہے، مگر مولانا مودودیؒ کو اس رائے سے شدید اختلاف ہے۔انہوں نے اجماع سے قدرتی اور قانونی طریقے سے ہونے والے..... اتحاد و اتفاق کو ہی، اس کا مصداق سمجھا ہے، بعدازاں انہوں نے امام شاطبیؒ کے حوالے سے، قانون سازی کی درج ذیل چار شرائط بیان کی ہیں:

”اجماع کی تعریف میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، امام شافعیؒ کے نزدیک اجماع اس چیز کا نام ہے، کہ ایک مسئلے پر تمام اہل علم متفق ہوں اور کوئی ایک قول بھی اس کے خلاف نہ پایا جاتا ہو۔ابن جریر الطبری اور ابو بکر رازی کی اصطلاح میں اکثریت کا قول بھی اجماع ہے۔امام احمد جب کسی مسئلے میں یہ کہتے ہیں کہ ہمارے علم میں اس کے خلاف کوئی قول نہیں ہے، تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے، کہ امام موصوف کے نزدیک اس مسئلے میں اجماع ہے۔مولانا مودودی کے مطابق یہ امر سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ اجماع حجت ہے۔یعنی نص کی جس تعبیر پر یا جس قیاس و اجتہاد پر یا جس قانون مصلحت پر اجماع امت ہو گیا ہو اس کی پیروی لازم ہے، لیکن اختلاف جس امر میں ہے وہ اجماع کا وقوع و ثبوت ہے نہ کہ بجائے خود اجماع کا حجت ہونا۔مولانا کا خیال ہے، کہ جہاں تک خلافت راشدہ کے دور کا تعلق ہے چونکہ اس زمانے میں اسلامی نظام جماعت باقاعدہ قائم تھا اور شوریٰ پر نظام چل رہا تھا، اس لیے اس وقت کے اجماعی اور جمہوری فیصلے تو معلوم اور معتبر روایات سے ثابت ہیں، لیکن بعد کے دور میں جب نظام جماعت درہم برہم اور شوریٰ کا طریقہ ختم ہو گیا، تو یہ معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا کہ کس چیز پر فی الحقیقت اجماع ہے اور کس چیز پر نہیں ہے۔اسی

۳۳۔ دیکھیے، فلسفہ نظام کار اور اصول حکمرانی، باب ۱۰۔

۳۴۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست فلسفہ نظام کار اور اصول حکمرانی، مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز، لاہور بار دوم، دسمبر ۱۹۸۳ء، ص ۴۵۴۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۴۵۵۔

بنا پر خلافت راشدہ کے دور کا اجماع تو نا قابل انکار مانا جاتا ہے۔مگر بعد کے دور میں جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں مسئلے پر اجماع ہے تو محققین اس کے اس دعوے کو رد کر دیتے ہیں(۳۶)

س بحث کے اختتام پر مولانا...... لکھتے ہیں:

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کسی مسئلے میں نص شرع کی تعبیر پر یا کسی قیاس یا استنباط یا کسی تدبیر و مصلحت پر اب بھی اہل حل وعقد اجماع یا ان کی اکثریت کا فیصلہ فی الواقع ہو جائے تو وہ حجت ہوگا اور قانون قرار پائے گا۔اس طرح کا فیصلہ اگر تمام دنیائے اسلام کے اہل حل وعقد کریں تو وہ تمام دنیائے اسلام کے لیے قانون ہوگا اور اگر کسی ایک اسلامی مملکت کے اہل حل وعقد کریں تو وہ کم از کم اس مملکت کے لیے تو قانون ہونا چاہئے۔(۳۷)

مولانا نے لکھا ہے کہ حاکمیت قانون کے نظریئے کو جہاں بھی عملی جامہ پہنایا گیا ہے وہاں لازماً چار چیزوں کا ہونا ضروری سمجھا گیا ہے:

ایک ایسا معاشرہ جو قانون کا احترام کرنے والا ہو اور اس کی پیروی کا حقیقی ارادہ رکھتا ہو۔

دوسرے معاشرے میں بکثرت ایسے لوگوں کا پایا جانا جو قانون کو جانتے ہوں،لوگوں کو قانون کی پیروی میں مدد دے سکتے ہوں اور جن کا مجموعی علم اور رسوخ واثر اس بات کا ضامن ہو کہ نہ معاشرہ قانون کی راہ سے ہٹ سکے اور نہ سیاسی اقتدار کو اس سے ہٹنے کی جرأت ہو سکے۔

تیسرے ایک بے لاگ عدلیہ جو عوام و حکام اور حکومت کی باہمی نزاعات میں قانون کے مطابق ٹھیک فیصلے کرے۔

چوتھے ایک بلند ترین اختیارات رکھنے والا ادارہ، جو معاشرے کو پیش آنے والے تمام مسائل و معاملات کا آخری حل تجویز کرے اور وہی حل معاشرے میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہو۔"(۳۸)

اس بات کی صراحت کہ جمہوری طریقے سے منتخب لوگوں کو محض انتخاب کی بنیاد پر اجتہاد کا حق حاصل نہیں ہے۔انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بھی کی ہے، وہ کہتے ہیں: "غضب یہ ہے کہ اجتہاد کا نازک کام آج کل وہ لوگ اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں، جو اس کام کے سرے سے ہی اہل نہیں ہیں،اجتہاد کے لیے خاص صلاحیتوں اور اہلیتوں کی ضرورت ہے"۔(۳۹)

ریاست کے حدود عمل اور ان کا باہمی تعلق (مقننہ،انتظامیہ،عدلیہ)

مولانا مودودی کے نزدیک سورۃ النساء کی آیت ۵۹ جس میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ اس کے رسولؐ اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اسلام کے پورے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام (۴۰) کی بنیاد ہے، اس میں درج ذیل اصول مستقل طور پر قائم کر دیئے گئے ہیں:

۱۔ اسلامی نظام میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے، مسلمانوں کی انفرادی زندگی اور ان کے اجتماعی نظام دونوں کا مرکز ومحور خدا کی

۳۶۔ ایضاً،ص ۴۵۶۔بحوالہ امام شاطبی،الموافقات،۲/۱۱۰-۱۱۴۔

۳۷۔ ایضاً،ص ۴۵۹۔

۳۸۔ ایضاً،۴۶۱

۳۹۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی،انٹرویو،دو ہفت روزہ زندگی،۱۴/۱۰ اکتوبر ۱۹۷۹ء،ص ۱۰-۱۱

۴۰۔ تفہیم القرآن،سورۃ النساء آیت ۵۹

فرماں برداری اور وفاداری ہے۔

۲۔ اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسول کی اطاعت ہے، کیونکہ رسول ہی ایک مستند ذریعہ ہے جس سے ہم تک خدا کے احکام اور فرامین پہنچتے ہیں۔

۳۔ تیسری اطاعت اولی الامر کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں، ان میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں۔

۴۔ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے تمام مسائل زندگی میں کتاب اللہ اور سنت رسول کو "مسند مرجع اور حرف آخر تسلیم کرنا" اسلامی نظام کی لازمی خصوصیت ہے۔

درج بالا اصول اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ریاست میں مختلف ادارے اپنے اپنے دائرہ کار کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق کاروبار حکومت کو مربوط رکھیں ریاست کے مختلف ادارے یہ ہیں: (۱) مجلس قانون ساز (Legistrative)، (۲) انتظامیہ (Exective)، (۳) عدلیہ (Juditiary) (۱۲) ایک اسلامی ریاست کے اندران اعضا کے اختیارات اور حدود عمل درج ذیل ہیں:

(الف) مقننہ: سب سے پہلے مجلس شوریٰ قانون ساز یا مقننہ کو لیجیے اسے اصطلاحاً "اہل الحل والعقد" کہا جاسکتا ہے یہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے خلاف قانون سازی کی مجاز نہیں ہے، مولانا مودودیؒ کے نزدیک ایک مقننہ چار قاعدوں کے تحت قانون سازی کر سکتی ہے، جو کہ یہ ہیں:

۱۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے واضح اور قطعی احکام کے نفاذ کے لیے ایک مقننہ قواعد وضوابط مقرر کر سکتی ہے۔

۲۔ ایسے معاملات جن میں کتاب وسنت کے احکام کے لیے ایک سے زیادہ تعبیرات ہوں مقننہ مختلف تعبیرات سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی مجاز ہے۔

۳۔ جن معاملات میں احکام موجود نہ ہوں وہاں مقننہ اسلام کے اصول عامہ کو پیش نظر رکھ کر نئے قوانین وضع کر سکتی ہے۔ کتب فقہ میں سے مدون کیے ہوئے قوانین میں سے بھی کسی ایک کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ جن معاملات میں کوئی رہنمائی نہ ملتی ہو تو مقننہ ان کے لیے مناسب قوانین بنا سکتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ قانون کسی شرعی حکم یا اصول سے متصادم نہ ہوں (۴۲)

مولانا مودودی کا کہنا ہے کہ بنیادی اصولوں کو جوں کا توں قائم رکھتے ہوئے موجودہ دور کی ضرورتوں کے مطابق جزوی ردو بدل کیا جاسکتا ہے وہ اس سلسلے میں رائے دیتے ہیں کہ مثلاً صدر ریاست کے انتظامی اور عدالتی اختیارات خلفائے راشدین کی بہ نسبت محدود کیے جاسکتے ہیں وہ اس کے لیے یہ دلیل دیتے ہیں کہ "اب اس درجے کے قابل اعتماد صدر ریاست ہمیں نہیں مل سکتے، جیسے خلفائے راشدین تھے، اس لیے ہم اپنے صدر کے انتظامی اختیارات پر بھی پابندیاں عائد کر سکتے ہیں تا کہ وہ ڈکٹیٹر نہ بن جائے (۴۳)۔

عدلیہ: مقننہ اور انتظامیہ کے بعد عدلیہ ریاست کا تیسرا اہم شعبہ ہے قدیم اصطلاح میں یہ قضاء کے ہم معنی ہے اسلام کے اولین

۴۱۔ ایضاً

۴۲۔ ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۵۲ء، ماہنامہ چراغ راہ کراچی، اسلامی قانون نمبر جولائی، اگست ۱۹۵۸ء

۴۳۔ ترجمان القرآن باب ماہ دسمبر ۱۹۵۲ء، بعنوان اسلامی ریاست

جج خود انبیاء تھے، انہوں نے لوگوں کے معاملات کا فیصلہ قانون الٰہی کے مطابق کیا۔

(ج) قانون سازی کی حدود

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عدلیہ اہل الحل والعقد کے کسی فیصلے کو خلاف کتاب وسنت قرار دے کر مسترد کر سکتی ہے، مولانا مودودیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ خلافت راشدہ میں کم از کم اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی قاضی نے ایسا کیا ہو۔ وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت اہل الحل والعقد کتاب وسنت میں گہری بصیرت رکھنے والے لوگ تھے اور پھر خود خلفائے راشدین کی صدارت میں کوئی مسئلہ خلاف کتاب وسنت طے ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، مولانا مودودیؒ رائے دیتے ہیں کہ آج کے دستور میں کسی مجلس قانون ساز سے کوئی قانون خلاف کتاب وسنت پاس نہ ہو سکے تو عدلیہ کو مقننہ کے فیصلوں کا پابند کیا جا سکتا ہے لیکن جب اس طرح کی قانون سازی کا قابل اطمینان انتظام نہ ہو سکے تو پھر آخری چارہ کار کے طور پر عدلیہ کو خلاف کتاب وسنت قوانین کو رد کرنے کا اختیار دیا جا سکتا ہے (۴۴)۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا مقننہ اسلام میں محض صدر ریاست کی مشیر ہے یا صدر ریاست اس کے اجماع کے فیصلوں کا پابند ہے، مولانا مودودیؒ نے قرآن کی روشنی میں اس کا جو واحد حل تلاش کیا ہے وہ یہ ہے کہ ''مسلمانوں کے اجتماعی معاملات باہمی مشورے سے انجام پانے چاہئیں ''و امرهم شورى بينهم'' ایک دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے: ''وشاورهم فى الامر فاذا عزمت فتوكل على الله'' (آل عمران ۱۵۹) اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو۔ پھر (مشورے کے بعد) جب تم عزم کر لو تو اللہ کے بھروسے پر عمل کرو''

بعض علماء کا کہنا ہے کہ صدر ریاست اہل الحل والعقد سے مشورہ کرنے کا پابند ہے مگر وہ ان کی متفقہ رائے پر عمل کرنے کا پابند نہیں ہے، یعنی ایک لحاظ سے اسے ویٹو کے اختیارات حاصل ہیں۔ وہ اس کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں جیش اسامہ کے معاملے اور مرتدین کے خلاف ان کے جہاد کے معاملے کی نظیر پیش کرتے ہیں۔ ان مواقع پر خلیفہ وقت نے اہل الحل والعقد کی متفقہ رائے کے خلاف کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مولانا مودودیؒ کی رائے یہ ہے کہ ''اگر شوریٰ کا طرز اور اس کی روح اور اہل شوریٰ کی ذہنیت اور سیرت وہی ہو جو خلافت راشدہ کے اس دور میں ہم دیکھتے ہیں تو پھر اس سے بہتر کوئی طریق کار نہیں ہے جو وہاں اختیار کیا گیا (۴۵)۔

۴۔ علامہ اسد کے نظریات

مناسب ہوگا اگر ہم یہاں معروف اسلامی مفکر علامہ محمد اسد کے افکار و خیالات شامل کریں۔ علامہ اسد (Leopold) کا شمار عصر حاضر کے بلند پایہ محققین اور مفکرین میں ہوتا ہے، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (م ۱۹۷۹ء) کے مطابق موجودہ دور میں اسلام کو یورپ سے جتنے بھی غنائم ملے ہیں، ان میں یہ (محمد اسد) سب سے زیادہ قیمتی ہیرا ہے (۴۶)۔

علامہ اسد نے ۱۹۰۰ء میں پولینڈ کے معروف شہر لوو (Lwow) کے ایک یہودی (Jew) خاندان میں جنم لیا اور اپنی خاندانی

۴۴۔ تفہیم القرآن سورۃ النور حاشیہ ۱۵۔

۴۵۔ ترجمان القرآن، مقالہ اسلامی ریاست۔ ذیلی عنوان مختلف اعضائے ریاست کا باہمی تعلق: نیز فرید پراچہ، ص ۱۶۶-۱۶۷۔

۴۶۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، انگریزی ترجمہ صحیح البخاری...... از علامہ محمد اسد، ترجمان القرآن، بابت ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ، ص ۷۵۔

روایات کے مطابق اپنے مذہب کی تمام بنیادی کتب پڑھیں اور یہودیوں کی قومی زبانیں عبرانی اور آرامی بھی سیکھیں......(۴۷)۔
بعدازاں انہوں نے ویانا یونیورسٹی میں فلسفہ (Philasophy)، ادب (Literature) اور تاریخ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی......
لیکن یہ تمام علوم اور یہ تمام کتب محمد اسد کے ذہن کو مطمئن نہ کرسکیں اور ان کے شکوک وشبہات میں مزید اضافہ ہوگیا، دوسری طرف انہیں عیسائیت میں بھی کوئی کشش محسوس نہ ہوئی اور وہ اپنے ماحول سے بھی بیزار ہوگئے۔

ان کی زندگی میں سب سے اہم موڑ اس وقت آیا جب وہ سیر وسیاحت کی غرض سے مشرق وسطیٰ کے سفر پر روانہ ہوئے، ان کا یہ سفر فلسطین سے شروع ہوکر شام، مصر، عراق، ترکی، ایران، افغانستان اور وسط ایشیائی ممالک کو محیط تھا۔ دوران سفر یہ ذہین نوجوان اسلام سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے واپسی پر ایران میں ایک ہندوستانی مبلغ ڈاکٹر عبدالخیر خیری (۱۸۸۰-۱۹۵۸ء) کے ہاتھوں پر اسلام قبول کرلیا اور بقیہ زندگی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں بسر کردی......قبول اسلام کے بعد انہوں نے عالم اسلام کا دوبارہ سفر کیا، جس کے دوران وہ ہندوستان بھی آئے، یہ ۱۹۳۲ء کا زمانہ تھا اور انہوں نے حیدرآباد دکن، دہلی، سری نگر، بھوپال اور لاہور کی بھی سیاحت کی اور علامہ اقبال اور ان کے افکار سے بے حد متاثر ہوئے (۴۸)۔

علامہ اسد نے اسلام اور مسلمانوں کے حالات پر کئی معرکۃ الآراء کتب تصنیف وتالیف کی ہیں، جن میں ان کی ذاتی خود نوشت (Road to Mecca) مکہ مکرمہ کی طرف سفر (Islam at the Cross Road) اسلام دوراہے پر، قرآنی پیغام (The Message of Quran) اور صحیح البخاری کا انگریزی ترجمہ...... اسلام میں ریاست وحکمرانی کے اصول (The Principals of the State and Government)...... اسلام اور ریاست (Islam and Politics) کے علاوہ بیسیوں مقالات شامل ہیں (۴۹)۔

علامہ اسد نے ریاست کی تشکیل، طریقہ کار، پارلیمنٹ اور اجتہاد وغیرہ کے موضوع پر بہت تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(الف) اسلام میں ریاست کی تشکیل:

علامہ اسد، تصور پاکستان پیش کرنے والے مفکر اسلام علامہ اقبال سے بھی ملے تھے اور ان کے نظریات سے بے حد متاثر ہوئے...... اسی لیے وہ اپنے خصوصی افکار کی بنا پر نظریاتی طور پر برصغیر میں پاکستان جیسی ایک نظریاتی مملکت کے حامی تھے......ان کے نزدیک قیام پاکستان کی تحریک مکمل طور پر ایک ایسی نظریاتی اور فکری تحریک تھی، جس کا قرار واقعی مقصد مسلمانان برصغیر کے صرف سیاسی اور معاشی مفادات ہی کا تحفظ نہ تھا، بلکہ ایک ایسی ریاست اور ایک ایسی حکومت کی تشکیل وتاسیس تھا، جہاں معاشرے اور سوسائٹی اور ریاست کی تشکیل کے لیے اسلامی نظریۂ حیات کی کارفرمائی کی ہو (۵۰)۔

ایسے محسوس ہوتا ہے کہ علامہ محمد اسد جسمانی طور پر تو نہیں، بلکہ ذہنی اور فکری طور پر تحریک پاکستان کے سفر میں شامل تھے،

۴۷۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے محمد اسد، Road to Mecca......مطبوعہ لنڈن ۱۹۵۴ء، ص ۳۱۔

۴۸۔ ایضاً......ص ۱۴۹-۱۵۰، ۱۵۱ وغیرہ

۴۹۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، پیش لفظ وتعارف، مشمولہ علامہ محمد اسد، طوفان سے ساحل تک،......ترجمہ وتلخیص سید محمد الحسنی، کراچی ۱۹۹۷ء، ص ۲۹۔

۵۰۔ دیکھیے محمد اسد، ڈاکٹر علامہ، پاکستان کا مطلب کیا ہے (What we do mean by Pakistan)، در عرفات، ۱/۸ (مئی ۱۹۴۷ء)، ص ۲۳۱-۲۳۲......۲۳۵۔

اسی لیے انہوں نے قیام پاکستان کے اعلان (۳ جون ۱۹۴۷ء) کے ساتھ ہی...... پاکستان کو حقیقی معنوں میں ایک اسلامی ریاست بنانے کی جدوجہد شروع کردی، اس وقت بعض حلقوں کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جارہا تھا کہ پاکستان ایک نظریاتی اسلامی مملکت ہو، یا ایک سیکولر ریاست...... علامہ اسد نے پوری شدت کے ساتھ ثانی الذکر موقف کی مخالفت کی اور اُسے اجتماعی وملی مقاصد سے یکسر مخالف بلکہ متصادم قرار دیا...... ان کا خیال تھا کہ یہ "تصور" نظریۂ پاکستان اور تحریک پاکستان" کی عمومی طور پر نفی کرنے کے مترادف ہے۔

ان کا یہ بھی موقف تھا کہ اگر پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنایا گیا، تو اس ریاست کے اندر بھی انتشار پیدا ہوگا جو ریاست کی بقا اور اس کی سالمیت کے لیے از حد درجہ نقصان دہ ہوگا، اس لیے کہ ایسا کرنا ریاست کی اساس کو ختم کرنا ہوگا (۵۱)۔

علامہ محمد اسد نے پاکستان کے قیام کے متصل بعد اس ریاست کو ایک مکمل اسلامی ریاست بنانے کے لیے عملی اور نظریاتی جدوجہد شروع کردی اور انہوں نے اس نوزائیدہ ریاست کے لیے اسلامی نظام کے دستور کا جامع خاکہ (Blue Print) بھی پیش کیا، جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نوزائیدہ ریاست میں معیشت، قانون اور تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشرت اور سماج کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ پاکستان کو ایک مکمل اسلامی ریاست بنانے کی راہ میں مغربی نظام تعلیم اور اس کے مضر اثرات، روایتی قدامت پرستی...... عوام کی حقیقی اسلامی مذہبی تعلیمات سے بے خبری وغیرہ حائل ہیں اور جب تک ان موانع کا ازالہ نہیں کیا جاتا اس وقت تک پاکستان ایک حقیقی اسلامی ریاست نہیں بن سکتا، ان کا یہ بھی نقطۂ نظر تھا کہ پاکستان کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کے لیے اسکولوں کالجوں اور جامعات میں عربی زبان اور علوم اسلامیہ کی مؤثر تعلیم و تدریس از بس ضروری ہے،...... اسی طرح ان کا خیال تھا کہ اس ریاست اور مسلم معاشرہ میں پیدا ہونے والے مسائل کے حل اور ان کے ادراک کے لیے اجتہاد کی صلاحیت رکھنے والے علما کی تیاری بھی ضروری ہے، جس کے لیے انہوں نے جامعۃ الازہر (قاہرہ، مصر) کی طرز پر ایک جدید دارالعلوم کو قائم کرنے اور چلانے کی تجویز دی اور کہا کہ اس دارالعلوم میں جدید عمرانی علوم کی تعلیم کو بھی شامل کیا جائے (۵۲)۔

محمد اسد کی رائے میں ترک تقلید اور اجتہاد کی روح کے احیاء کے بغیر عصر جدید میں اسلام کا احیاء کسی طور پر بھی ممکن نہیں ہے،(۵۳) اس کے بغیر نہ تو مسلمان اپنے تہذیبی ومعاشرتی جمود وانحطاط پر قابو پاسکتے ہیں اور نہ ہی شریعت کسی اسلامی مملکت کے لیے نظام قانون بن سکتی ہے۔(۵۴)

اسلامی قانون کی تدوین جدید۔ منہاج واصول

محمد اسد مسلمانوں کو تجدد و مغربیت اور مغرب کے تہذیبی وسماجی، قانونی وعدالتی اور سیاسی ومعاشی نظام واقدار کی تقلید ونقالی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک ناگزیر شرط قرار دیتے ہیں (۵۵)۔ ان کے خیال کے مطابق اسلام کے حقیقی واصلی مآخذ قرآن وسنت کے نصوص واحکام پر از سر نو غور وفکر کرکے اور اجتہاد سے کام لے کر ایک نئی فقہ تشکیل دینا ناگزیر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قدیم فقہی سرمایہ

۵۱۔ دیکھیے محمد اسد، ڈاکٹر، Enforcement of Sharia in Pakistan، ص ۱۵۔

۵۲۔ Islamic Construction، ص ۱۰-۱۱۔

53) Asad, "Is Religion a Thing of the Past?" , PP.56-64

54) Asad, Principles of state, PP.102-103

55) Asad, Law of Ours, PP. 11-70, esp. PP.66-70 ; Idem, Crossroads, PP. 158-159

اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور ایک زمانے تک اس کا مسلمہ کردار رہا ہے لیکن اب حالات بدل گئے ہیں اور جدید اجتہاد کی ضرورت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

The Islamic shari'ah, as presented by them {later Muslim legists) fuqha}, is only partially derived from injunctions given in unequivocal terms (nass) by the Quran or the Prophet: to a certain extent it is built on deductions, from both, by the early scholars-(56)

علامہ اسد لکھتے ہیں کہ اگر اسلامی نظریات وافکار کو ایک بار پھر مسلمانوں کی زندگی میں ایک تخلیقی وحیات آفرین قوت بنانا مقصود ہے تو ضروری ہے کہ ہم ان کو اصلی وحقیقی مآخذوں (قرآن وسنت) سے متعلق اپنے فہم کے مطابق از سر نو مرتب کریں اور ان پر سے روایتی تاویلات وتشریحات کی وہ موٹی و دبیز تہیں ہٹادی جائیں جو صدیوں سے ان پر جمی رہی ہیں اور جو موجودہ زمانے کے لیے ناکافی پائی گئی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی مساعی کا نتیجہ ایک نئی فقہ کی صورت میں برآمد ہو، جو اسلام کے دو حقیقی مآخذوں قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کے عین مطابق ہو اور جو ساتھ ہی ساتھ دور حاضر کی زندگی کے تقاضوں کو بطریق احسن پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ قدیم فقہ جدید صنعتی دور کے لیے پہلے کے ادوار، کہ جن پر نوافلاطونی فلسفہ ومنطق کا اثر غالب تھا، کے تقاضوں کو پورا کرتی تھی۔(۵۷)

محمد اسد نے قانون اسلامی کی تدوین جدید کا ایک منہاج (Method) بھی تجویز کیا ہے، جس کو بروئے کار لا کر، ان کی رائے میں یہ اہم کام انجام دیا جاسکتا ہے۔ اس منہاج کے خدوخال یہ ہیں:

تدوین نصوص قرآن وسنت

محمد اسد کے نزدیک قانون اسلامی کی تدوین جدید کے پہلے مرحلے میں ضروری ہے کہ ظواہر نصوص قرآن وسنت یعنی ایسی آیات واحادیث جن کے ظاہر الفاظ میں احکام وقوانین اس طرح سے صریح طور پر بیان کر دیے گئے ہیں کہ ان کی تعبیر وتشریح سے متعلق کسی فقہی مذہب میں اختلاف رائے کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی، کی تدوین مختلف موضوعات وعنوانات کے تحت ہو جائے۔ ان کے خیال میں نصوص قرآن وسنت کی تدوین کی صورت میں ہمارے پاس احکام وقوانین شریعت کا ایک ایسا مختصر و بلیغ اور جامع ضابطہ موجود ہوگا، جو متفق علیہ ہوگا اور اسلامی قانون کی تدوین کے سلسلہ میں ایک محکم اور ٹھوس بنیاد کے طور پر ہمارے سامنے رہے گا۔(۵۸)

تاہم محمد اسد موقتی اور دائمی نوعیت کے حامل نصوص سنت کے مابین فرق وامتیاز کا کوئی واضح وقابل عمل قرینہ تجویز نہیں کر پائے۔ محمد اسد کی رائے میں کسی بھی معاملہ میں قرآن وسنت کے نصوص سے شرعی قانون وحکم معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نصوص قرآن وسنت کا پورا سیاق وسباق پیش نظر رکھ کر ان پر غور کیا جائے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی کوئی آیت بجائے خود کوئی قانونی حکم پیش نہیں کرتی۔ تاہم اگر اسے کسی دوسری آیت یا صحیح حدیث سے ملا کر دیکھا جائے تو قانون کی نص بن

56) Asad, "Resurrection of thaught", PP.13

57) Asad, "Resurrection of thaught", PP.15-16

58) Asad, "Islamic Reconstruction" , Arafat, No.I (1948), PP.11-12

جاتی ہے۔عموماً یہی کیفیت رسول اللہ ﷺ کی سنت کی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے ملت کے امام اور شارع وقانون ساز کی حیثیت میں جو کچھ ارشاد فرمایا اور جو قانونی احکام جاری کیے، موجودہ احادیث میں سے اکثر حضور ﷺ کے ارشادات کے محض بعض حصے یا متفرق واقعات بیان کرتی ہیں۔لہذا حضور کی صرف سے جو قانونی احکام جاری ہوئے وہ بعض اوقات اس وقت واضح ہوتے ہیں جب متعدد صحیح احادیث کی کسی ہم معنی قرآنی آیت یا آیات سے ملا کر پڑھا جاتا ہے۔(۹۵)

اسد کی رائے میں یہ حقیقت کبھی نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ قرآن وسنت ایک لاینفک کل ہیں، جو ایک دوسرے کی توضیح و تفسیر کرتے ہیں۔لہذا مجوزہ شرعی ضابطہ ترتیب دیتے وقت دونوں (یعنی قرآن وسنت) کا پورا متن سامنے رہنا چاہیے۔محمد اسد کی رائے میں اس اصول اور طریق پر قرآن وسنت سے جو فقہی وقانونی احکام واضح ہوں، جن کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی وسیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہو، انہیں خاص عنوانات کے تحت مرتب کر لینا چاہیے۔اس طرح قانون عامہ (Public Law) کا ایک ایسا مجموعہ مرتب ہو جائے گا جو حجم میں کم، حد درجہ اور اوسط درجے کی عقل وتعلیم سے بہرہ ور مسلمان مرد و زن کے لیے قابل فہم ہوگا۔ پھر اس ملک کے قانون اساسی (Basic Law of the Land) کی حیثیت اختیار کر لیا جائے۔(۶۰)

۲: قانون سازی بذریعہ اجتہاد اور اصول استصلاح

نصوص قرآن وسنت کی تدوین اور ایک اساسی شرعی ضابطہ قانون کی ترتیب کے بعد، محمد اسد کی رائے میں اجتہاد اور آزادانہ غور وفکر کے لیے ایک وسیع میدان باقی رہے گا۔اجتہاد کے ذریعے اجتماعی زندگی کے جملہ پہلوؤں کے بارے میں قانون سازی کی جائے گی۔محمد اسد کے الفاظ میں:

If we codify the social ordinances of th shari'ah on the lines suggested above... The need for learned ijtihad will not thereby be abolished ; it will be , if anything intensified. we must remember that the true Shari'ah (consisting of nass ordinances of Qur'an and sunnah) was never intended to Coner detail and every possible constellation of our lives, but it only a framework withing which we are expected to unfold our creative powers and in the light of which we have to regulate our daily affairs. If we remember this, we realize at once how immense the field is witing which we must exercise our independent reasoning-(61)

غرضیکہ محمد اسد اسلامی قانون کی تدوین کے پہلے مرحلے میں شریعت حقہ (قرآن وسنت) کے احکام کو انسانی اجتہادات سے الگ کر کے ان کو ایک مجموعہ کی صورت میں مدون کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ان کی رائے میں احکام شریعت کے اس مختصر ضابطہ کو مختلف مذاہب فقہ کے درمیان قدر مشترک کا درجہ حاصل ہوگا اور پھر ان پر غور وفکر کر کے اور اجتہاد کو بروئے کار لا کر توسیع

---

59) Asad, Principles of State, P.104

60) Asad, Principles of State, P.104-105

61) Asad, Principles of State, P.105-106

واضافی قانون سازی کا کام انجام دیا جائے گا۔

قانونِ اسلامی کی تدوینِ نو کے سلسلہ میں محمد اسد کسی معین فقہی مذہب کو اساس بنانے کے مخالف ہیں وہ قانون اسلامی کی تدوین جدید کے سلسلہ میں کسی خاص فقہی مذہب کے اصول و احکام اور اجتہادات کو بنیاد بنانے کے حق میں نہیں۔ اس سلسلہ میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ مروجہ فقہی مذاہب میں سے کوئی بھی عصر جدید کی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ ہر فقہی مذہب کے استخراجات بڑی حد تک اس زمانے کے تجربات پر مبنی ہیں جو ہمارے زمانے سے مختلف تھا۔ ثانیاً عصر جدید کی اسلامی مملکت کے پاس اسلامی قوانین کا ایک ایسا مجموعہ ہونا چاہیے جو تمام مسلمان شہریوں اور مختلف فقہی مذاہب کے پیروکاروں کے نزدیک قابل قبول ہو۔ چنانچہ ضروری ہے کہ تدوین جدید میں کسی معین فقہی مذہب سے کوئی امتیازی تعلق پیش نظر نہ رکھا جائے۔(۶۲)

محمد اسد تدوین جدید میں تلفیق اور مختلف فقہی مذاہب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے اصول کی پیروی کے حق میں بھی نہیں۔ ان کی رائے میں تلفیق یعنی مختلف فقہی مذاہب سے اخذ واکتساب، بظاہر کتنی ہی مطلوب ہو وہ ایک ایسا مجموعہ قوانین مطلقاً پیدا نہیں کرسکتی جو بالکل سادہ ہو، تلفیق کا مطلب یہ ہوگا کہ ان حد درجہ اور بے شمار اجتہادات و استخراجات میں، جن سے تمام مذاہب کی فقہ مرکب ہے، مصنوعی لحاظ سے ارتباط پیدا کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیاسی فقہ کا نظام پیچیدہ تر ہو جائے گا۔ یوں ہمارا تصور شریعت پھر اس فکر کی زنجیروں میں جکڑا جائے گا جو تاریخ کے ایک خاص دور میں رائج تھا(۶۳)۔ محمد اسد تدوین جدید میں گزشتہ ادوار کے فقہا کے اجماع واجتہادات سے بہت ہی محدود طور پر استفادہ کرنے کے حق میں ہیں۔

وہ اپنے تصور اجتہاد اور قانونِ اسلامی کی تدوین جدید میں متعدد روایتی فقہی ماخذ اور اصول اجتہاد مثلاً قیاس، اجماع، تعامل صحابہ اور استدلال واستصحاب وغیرہ کو رد کردیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اجتہاد کے باب میں کسی خاص فقہی مذہب کے اصول وقواعد کی پیروی کو قطعاً ضروری خیال نہیں کرتے۔ وہ دراصل اجتہادِ مطلق کے حامی معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے نزدیک اس معاملہ میں مالکیہ کے اصول، استصلاح، کو بنیاد بنایا جائے گا۔ قانون سازی کے طریق کار اور اصول کے بارے میں رقم طراز ہیں:

It is as well to say here a few words about the lines which we may legitimately follow in evolving our temporal amendable, Muslim Law as complement of the eternal, unchangeable, Islamic Law (the shari'ah). In cases where no detailed shar'i rulings are availablw but where the interests of the community do call for detailed rulings, we must , first of all, look into the context of the shari'ah for a general priniple of Law. If such a general priniple is forthcoming from the nusus of Qur'an and Sunnah, it falls within the scope of Muslim Law to evolve the relevant details of legislation in consonance with the established shar'i principles. But we may also be

---

62) Asad, Principles of State, P.101

63) Asad, Principles of State, P.101-102

confronted with problems entirely untoched by the shari'ah-that is to say, legal cases and situations with regard to which neither detailed rulings nor even a general principle have been formulated in the nusus of the Two Sources.: and in such cases we are entirely free to formulate our own, temporal laws, taking only the spirit of Islam, and the community's welfare into consideration. This is precisely what Imam Malik has described as the method of istisla_(64)

۳:اجتماعی وشورائی اجتہاد

محمد اسد اسلامی ریاست میں قانون سازی کے سلسلہ میں انفرادی اجتہاد کی بجائے اجتماعی وشورائی اجتہاد کے تصور کے داعی وعلمبردار ہیں۔ان کی رائے میں اجتماعی اور ملکی معاملات سے متعلق قانون سازی کا حق بحیثیت مجموعی پوری ملت کو حاصل ہے۔ملت نہ صرف یہ کہ نئے قوانین وضع کرسکتی ہے بلکہ سابقہ اجماع واجتہاد کو منسوخ بھی کرسکتی ہے۔ملت کا یہ اختیار انفرادی صواب دید پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔قانون سازی ملت کے اجتماعی اور اس کے اجماع واتفاق پر ہی مبنی ہونی چاہیے(۶۵)۔محمد اسد اجتہاد اور قانون سازی کے طریق کار کے متعلق رقم طراز ہیں:

It goes without saying that in matters affecting the communal side of our life no legislative ijtihadi decisions can possibly be left to the discretion of individuals: they must be based on a definite consensus (ijma) of the whole community (which, of course, does not preclude the community's agreement, in any matter under consideration, on an ijtihadi finding arrived at previously by an individual scholars or a group of scholars)-(66)

محمد اسد ملت کے اختیار اجتہاد وقانون سازی کو اس (ملت) کے معتمد علیہ اہل حل وعقد پر مشتمل مجلس تشریعی / مجلس شوریٰ کو تفویض کرنے کے حق میں ہیں۔ان کی رائے پوری ملت کا نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد وقانون سازی کی غرض سے کسی ایک جگہ مجتمع ہونا امر محال ہے،دریں صورت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملت کے افراد کی ایک محدود تعداد کو،جو اس کی نمائندہ ومعتمد علیہ ہو اور اس کی آزادانہ رائے سے منتخب کردہ ہو،اپنا اختیار قانون سازی تفویض(delegate) کردے(۶۷)۔محمد اسد اس سلسلہ(اجتماعی وشورائی اجتہاد) میں قرآن حکیم کی آیت:وامرھم شوریٰ بینھم سے استدلال کرتے ہیں۔ان کی رائے میں یہ صریح نص نظم ونسق

---

64) Asad, "Islamic Constitution-Making", PP.28-29

65) Asad, Principles of State, P.43

66) Asad, Principles of State, P.43

67) Asad, Principles of State, P.43

اسلامی مملکت کے بارے میں ایک اصولی حکم (Fundamental Operative Clause) کا درجہ رکھتی ہے۔اس صریح حکم کا لازمی تقاضا ہے کہ کاروبار حکومت اور اجتماعی نوعیت و اہمیت کے جملہ امور و معاملات کا فیصلہ ہی نہیں بلکہ قانون سازی کا کام بھی لازماً ملت کے مشورے سے انجام دیا جائے۔ چنانچہ اس نص پر عمل کی صورت یہی ہے کہ ریاست کے اختیارات قانون سازی ایک ایسی مجلس کو تفویض کیے جائیں جو ملت کی معتمد علیہ و نمائندہ ہو اور جسے ملت خاص اس مقصد سے منتخب کرے (۶۸)۔غرضیکہ محمد اسد کی رائے میں اسلامی ریاست میں قانون سازی بہرحال ملت کے مسلمہ و معتمد علیہ نمائندوں کی باہمی مشاورت (اجتماعی و شورائی اجتہاد) ہی کے ذریعے سے ہونی چاہیے۔(۶۹)

۴: قانون سازی۔مجلس تشریعی کا دائرہ اختیار

محمد اسد نے قانون سازی کے سلسلہ میں مجلس تشریعی کے دائرہ کار و اختیار کی نشان دہی بھی کی ہے۔ان کی رائے میں مجلس تشریعی کا اختیارِ قانون سازی ان مسائل و معاملات تک محدود رہے گا جن سے متعلق شریعت نے تفصیلی احکام کی بجائے یا تو صرف عمومی اصول دیے ہیں یا پھر سکوت اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ان معاملات سے متعلق جب بھی ملت کے مصالح و مفادات قانون سازی کا تقاضا کریں گے تو مجلس تشریعی ضروری قوانین وضع کرے گی (۷۰)۔تاہم محمد اسد کے نزدیک مجلس تشریعی قانون سازی کے معاملہ میں چند اہم بنیادی اصولوں کی پابند رہے گی:

ا) اسلامی ریاست میں قانون سازی کا اہم ترین اصول یہ ہے کہ یہ شریعت (نصوص قرآن و سنت) کے تابع ہوگی۔قانون سازی میں شریعت کی روح کو ملحوظ رکھا جائے گا۔احکام شریعت کے منافی و متصادم قانون سازی کی قطعاً کوئی گنجائش نہ ہوگی۔اسلامی ریاست میں حقیقی اقتدار اعلیٰ (قانونی و سیاسی) اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے۔قانون دینے کا اختیار فقط اسی ذات بے ہمتا کو ہے۔ وہی شارع حقیقی ہے۔اقتدار اعلیٰ کا حقیقی مآخذ منشائے ربانی ہے، جس کا اظہار احکام شریعت میں ہوا ہے۔ چنانچہ امت کو قانون سازی کا مطلق نہیں بلکہ محدود اختیار حاصل ہے اور یہ اختیار حاکم و شارع حقیقی کی مرض و منشا، جس کا اظہار قرآن سنت میں ہوا ہے، کے تابع ہے (۷۱)۔ بایں وجہ امت کو اس امر کا قطعاً کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔کہ وہ شریعت کے منافی و متصادم کوئی قانون وضع کر سکے قانون سازی قطعاً جائز (Valid) نہ ہوگی (۷۲)۔ شریعت نے اوامر و نواہی اور حلال و حرام کا جو دائرہ کھینچ دیا ہے اس کے اندر رہتے ہوئے ہی ضروری قانون سازی کی جائے گی۔بالفاظ دیگر اسلامی ریاست میں قانون سازی شریعت کے عمومی اصول و ہدایات کے فریم ورک کے اندر رہتے ہوئے ہی انجام پائے گی۔(۷۳)

ب) محمد اسد کی رائے میں مجلس تشریعی زیر نظر معاملات و مسائل ہی سب سے پہلے نصوص کتاب و سنت اور ان کے سیاق و سباق

---

68) Asad, Principles of State, P.44-45

69) Asad, Principles of State, P.52

70) Asad, Principles of State, P.47

71) Asad, Principles of State, P.38-39

72) Asad, Principles of State, P.35

73) Asad, Principles of State, P.15

پر غور کرے گی اور ان کی بابت عمومی اصول تلاش کرے گی۔ اگر کوئی ایسا اصول مل جائے تو اس کا کام یہ ہوگا کہ وہ اس اصول کے موافق نئے اضافی قوانین وضع کرے۔ ایسے معاملات کہ جن میں شریعت نے سکوت اختیار کیا ہے، ان میں مجلس تشریعی شریعت کی روح اور ملت کی بہبود اور مصالح کی رعایت کرتے ہوئے قوانین بنائے گی محمد اسد کی اس رائے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مالکیہ کے اصول ''استصلاح'' اور احناف کے اصول ''استحسان'' کو قانون سازی میں بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ (۷۴)

ج) کسی بھی معاملہ میں قانون سازی کی ضمن میں مجلس تشریعی کے ارکان کے مابین اختلافات رائے کا پیدا ہونا بعید از امکان نہیں بلکہ موافق ومخالف آراء کا سامنے آنا ایک فطری امر ہے۔ محمد اسد کے نزدیک ایسی صورت میں اصول اکثریت کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ یعنی اجماع واتفاق رائے کی عدم موجودگی کی صورت میں کثرت رائے کو ترجیح دی جائے گی۔ عام اور معمولی نوعیت کے قوانین سادہ اکثریت سے جبکہ غیر معمولی اہمیت کے حامل قوانین دوتہائی ارکان کی رائے سے منظور کیے جائیں گے۔ (۷۵)

محمد اسد نے شرائط اجتہاد کی فہرست کو بہت مختصر کردیا ہے۔ ان کی نگاہ میں قانون سازی اور اجتہاد پر مامور مجلس کے ارکان کے اندر دو شرائط: نصوص قرآن وسنت سے واقفیت اور دینوی امور معاملات سے آگاہی یعنی ملت کے سماجی وتمدنی مسائل وضروریات کے عمیق فہم وشعور کا پایا جانا کافی ہے(۷۶)۔ محمد اسد کو اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ دور حاضر میں معیاری اجتہادی شرائط کے حامل افراد کا ملنا اور ان کا مجلس تشریعی میں پہنچنا آسان کام نہیں۔ چنانچہ قانون سازی کے عمل کو دائرہ شریعت کے اندر رکھنے اور نصوص قرآن وسنت کی غلط تعبیرات کی روک تھام کے لیے انہوں نے مجلس تشریعی سے باہر بہترین علماء فقہاء پر مشتمل ایک ''سپریم ٹریبونل'' کے قیام کی تجویز پیش کی ہے۔ وہ اس ادارے کے لیے مجلس تشریعی کے وضع کردہ قوانین کو، خلاف شریعت ہونے کی صورت میں ویٹو کرنے کا اختیار تجویز کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں مجوزہ ٹریبونل میں وہ لوگ شامل کیے جائیں گے جو پوری ملت میں سے بہترین فقیہ ہوں گے، جو نہ صرف قرآن وسنت پر عبور رکھتے ہوں بلکہ دینوی مسائل ومعاملات سے بھی پوری طرح آگاہی ہوں گے۔ یہ ادارہ اس امر کا فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا کہ مجلس تشریعی کا وضع کردہ کوئی قانون شریعت سے ہم آہنگ ہے یا متصادم۔ محمد اسد کی رائی میں اس ٹریبونل کے ارکان کا انتخاب وتقرر خود مجلس شوریٰ کرے گی۔ (۷۷)

الغرض علامہ اسد کی طرف سے،......ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کے لیے جو نظریات پیش کیے گئے، ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں نفاذ شریعت اور نفاذ اسلام کا ایک مکمل اور جامع خاکہ موجود تھا اور ان کا خیال تھا کہ آئین میں اس محض ایک شق کہ ''مملکت کا سرکاری مذہب اسلام ہے'' نیز ''مذہبی امور کی وزارت'' کے قیام اور اسی طرح کے دو چار اقدامات کافی نہیں ہیں، بلکہ اس کے لیے سنجیدہ فکر اپنانے کی ضرورت ہے۔

علامہ اسد کے نزدیک اسلامی ریاست کے احیاء اور ''تشکیل جدید'' سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ انتظامی وادارتی معاملات میں خلافت راشدہ کی کاملاً پیروی کی جائے، بلکہ ان کا موقف یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں جدید معاصر دنیا کے تجربات سے بہتر

---

74) Asad, Principles of State, P.47-48

75) Asad, Principles of State, P.48-49

76) Asad, Principles of State, P.48

77) Asad, Principles of State, P.66-68

انداز میں استفادہ کیا جائے اور اس کی روشنی میں اسلامی اداروں کی تشکیل نو کی جائے ...... اسی لیے وہ اس امر کے قائل تھے کہ امامت وقیادت کے متعلق قدیم وجدید مجتہدین کے افکار وخیالات کے بجائے براہ راست قرآن وسنت سے استفادہ کیا جائے۔

ان کا خیال ہے کہ قرآن وسنت میں چند بنیادی امور کی صراحت کر دی گئی ہے اور ان کی تفصیلات مجتہدین کے اجتہاد پر چھوڑ دی گئی ہیں، مثلاً یہ واضح کر دیا گیا کہ حکمران مسلمان ہوں گے اور عدل وتقویٰ اور امانت کی اوصاف کے حامل ہوں گے اور انتظام مملکت شورائیت کی بنیاد پر چلایا جائے گا، ...... جبکہ قیادت کے انتخاب کس طرح کیا جائے گا، یا حلقۂ رائے دہندگان اور مجلس شوریٰ کی ہیئت ترکیبی کے متعلق خاموشی اختیار کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلامی شریعت کی روح اور اس کے مزاج کے مطابق جو بھی طریقہ کار اختیار کیا جائے گا وہ مناسب ہوگا(۷۸)

علامہ محمد اسد کے نزدیک اسلامی ریاست مکمل طور پر ایک دستوری ریاست ہے، جہاں انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کی تشکیل اور ان کی حدود کار وغیرہ کا تعین کر دیا گیا ہے...... اگرچہ اسلامی ریاست کے امیر کو مقتدر اور بااختیار دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن ان کا یہ خیال ہے کہ ریاست کے تمام اجتماعی امور ومعاملات میں فیصلہ اور قانون سازی کا حق جمہور کے منتخب اہل حل وعقد پر مشتمل پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ کو حاصل ہے اور تمام فیصلے اتفاق رائے یا کثرت رائے سے کیے جائیں گے، ان کا یہ بھی خیال ہے اسلامی ریاست کے سربراہ کو پارلیمنٹ کے فیصلوں کو مسترد کرنے کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔(۷۹)

اسلامی ریاست کی پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) کے متعلق علامہ اسد کے خیالات قدیم وجدید کا حسین عکس ہیں...... اسی لیے وہ ایک طرف تو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلامی ریاست میں ہونے والی تمام قانون سازی ...... پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ کے ذریعے ہی ہونی چاہیے، جنھیں ملک کی اکثریت نے کسی بھی انتخابی طریقۂ کار کے مطابق منتخب کیا ہو...... دوسری طرف وہ اس امر پر بھی زور دیتے ہیں کہ مجلس شوریٰ کے ارکان میں دانائی وبصیرت...... قرآن وسنۃ کے احکام سے واقفیت اور حالات زمانہ کا صحیح ادراک جیسی اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے، تاکہ وہ اسلامی ریاست کے لیے ٹھیک ٹھیک قانون سازی کر سکیں۔ یہاں ہمیں علامہ اقبال کے ساتھ ان کے خیالات میں تھوڑا سا فرق دکھائی دیتا ہے کہ انہوں نے اجتہاد کرنے کا حق ایسی پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ کو دیا ہے، جو عقل وبصیرت، قرآن وسنۃ کے احکام سے واقفیت اور حالات زمانہ کا صحیح صحیح ادراک جیسی اوصاف سے متصف، جبکہ علامہ اقبال نے ایسی کوئی صراحت نہیں کی۔

اس کے ساتھ ہی علامہ اسد...... اسلامی ریاست کی پارلیمان کی اجتہادی قانون سازی کو قابل ترمیم واصلاح بلکہ قابل تنسیخ قرار دیتے ہیں، تاکہ ان کے اجتہاد میں اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو، تو اس کی اصلاح وتہذیب ہی نہیں، بلکہ اس کی درستگی بھی کی جا سکے(۸۰)۔

اسی طرح علامہ اسد نے مجلس پارلیمان کے ساتھ کسی الگ ''علماء کی کونسل'' بنانے کی بھی بات نہیں کی، جس کی کچھ عرصہ کے لیے ہی سہی علامہ اقبال نے تجویز پیش کی ہے(۸۱)۔

---

78) The Principle of State, p 17, 211......

79) Did.

80) Did, pp. 43, 45, 51, 52.

۸۱) تفصیل کے لیے دیکھیے، ڈاکٹر محمد ارشد اسلامی ریاست کی تشکیل جدید: محمد اسد کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ، در پاکستان جرنل آف اسلامک ریسرچ، جلد ۴، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۰۔۱۱۵

مختصر یہ کہ علامہ محمد اسد کے نظریات میں جدت کے ساتھ قدامت کے ساتھ وابستگی کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ وہ جدید پارلیمنٹ کو "اجتھاد" کا حق دینے کے حامی تھے۔ بشرطیکہ ان میں دانائی، بصیرت اور قرآن وسنۃ کے احکام سے واقفیت اور حالاتِ زمانہ کا صحیح ادراک جیسی اوصاف پائی جاتی۔

فصل دوم:

علامہ اقبال اور ان کے شارحین کا نقطہ نگاہ

۲۔ علامہ اقبال اور اجتہاد

علامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب تشکیل جدید الٰھیات (Reconstruction of Religious thought in Islam)، میں اجتہاد کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی وفات کے بعد سے لیکر اب تک ہمیشہ اہل علم...... کے ہاں بحث وتمحیص کا موضوع رہا ہے...... علامہ اقبال کی اس کتاب کے عنوان سے، جو دراصل ان کے آٹھ خطبات پر مشتمل مجموعہ مقالات ہے، یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ جدید علوم وفنون اور جدید سائنسی انکشافات کی روشنی میں اسلامی افکار کو نئے انداز میں پیش کرنے کے خواہش مند تھے، وہ یہ چاہتے تھے، کہ مختلف علوم وفنون پر اسلامی افکار کو ایک نئے اور مربوط انداز میں اس طرح پیش کیا جائے کہ جدید علم وتحقیق کے ساتھ، ان کا تصادم دکھانے کے بجائے، جدید علوم وفنون کو، ان کا ایک خادم اور ان کا مؤید وحامی کے طور پر پیش کیا جائے،...... اس بنا پر وہ فکری آزادی کے علمبردار تھے،...... اس ضمن میں علامہ اقبالؒ نے ''اجتہاد'' کے مسئلے کو بڑی اہمیت دی ہے، انہوں نے اپنی کتاب تشکیل جدید الٰھیات میں اجتھاد کے عنوان پر تفصیل سے لکھا ہے(۱)۔

علامہ اقبال کے خیال میں،...... اجتہاد پر عمل کرنا...... اسلامی فتوحات اور مسلمانوں کی روزمرہ ضروریات کی تکمیل کے لیے بھی ناگزیر تھا...... وہ اپنے اسی خطبے میں مزید لکھتے ہیں:

''یوں بھی جن حضرات نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے، خوب جانتے ہیں کہ فتوحات میں اضافے کے ساتھ ساتھ قانون میں باقاعدہ غور وفکر ناگزیر ہو گیا تھا، انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ فقہائے متقدمین نے خواہ وہ عرب ہوں یا عجم اس سلسلے میں جس محنت اور عرق ریزی سے کام لیا، اس کے نتائج بالآخر ہمارے مشہور مذاہب فقہ کی تدوین میں ظاہر ہوئے ان مذاہب کے نزدیک اجتہاد کے تین درجے ہیں:

(الف) تشریع یا قانون سازی میں مکمل آزادی، لیکن جس سے عملاً مؤسسین مذاہب نے ہی فائدہ اٹھایا۔

(ب) محدود آزادی، جو کسی مخصوص مذہب فقہ کی حدود کے اندر ہی استعمال کی جاسکتی ہے۔

(ج) وہ مخصوص آزادی، جس کا تعلق کسی ایسے مسئلے میں، جسے مؤسسین مذاہب نے جوں کا توں چھوڑ دیا ہو، قانون کے اطلاق سے ہے۔(۲)''

علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلام زندگی کو متحرک اور متغیر قرار دیتا ہے، جس کی بنا پر چاہئے تو یہ تھا، کہ اجتہاد کا یہ طاقت ور اصول...... مسلمانوں کی تاریخ میں ہمیشہ اسی طرح کارفرما اور متحرک رہتا، کہ یہ بات اسلامی تاریخ کو زیادہ متحرک بنا دیتی، اس لیے کہ اسلام کائنات کو ایک ساکن اور جامد شے تسلیم نہیں کرتا۔ (۳) اس کے برعکس وہ اسے ایک متحرک قرار دیتا ہے...... تاہم...... اسلامی تاریخ

۱۔ The Reconstruction of Religious Thought in Islam، ومطبوعہ بزم اقبال، لاہور، مئی ۱۹۸۳ء، ص ۲۲۸۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۲۸-۲۲۹۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۲۳۔

میں کچھ ایسے عوارض اور ایسے حوادث پیش آئے ،جن کی بنا پر، اجتہاد کا ادارہ ...... بحیثیت مجموعی جمود کا شکار ہو گیا، اقبال اس رائے سے اتفاق نہیں رکھتے ، کہ مسلمانوں میں یہ جمود...... ترکی خلافت کے زیر اثر پیدا ہوا، وہ لکھتے ہیں:

مغربی اہل قلم میں سے ،بعض کے نزدیک تو یہ نتیجہ ہے ترکی اثرات کا، لیکن میری اپنی رائے میں ان کا یہ خیال بڑا سطحی ہے کیوں کہ ترکوں کے اثرات اسلامی تاریخ میں ظاہر ہوئے تو اس وقت جب مذاہب فقہ کو قائم ہوئے صدیاں گذر چکی تھیں ۔(۴)

بعد ازاں علامہ اقبال نے بڑی مفصل بحث کے ذریعے...... اس جمود اور اس عدم تحرک کے اسباب متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

(۱) عہد عباسی کی تحریکوں کا ردِ عمل

عہد عباسی میں...... اٹھنے والی...... عقلیین (معتزلہ) کی تحریک کا ردعمل، جس کے نتیجے میں علمانے یہ فیصلہ کیا کہ وہ شریعت کی قوت جامعہ سے کام لیں اور جہاں تک ہو سکے، قوانین کے اندر سختی پیدا کرتے چلے جائیں ۔(۵)

(۲) رہبانی تصور کا نشو ونما

ان کے خیال میں، اس جمود اور عدم تحریک کا دوسرا سبب رہبانی تصوف کا نشو ونما تھا، جو غیر اسلامی اثرات کے ماتحت رفتہ رفتہ صرف غور وفکر تک محدود ہو کر رہ گیا۔(۶)

(۳) مسلمانوں کے سب سے بڑے علمی اور فکری مرکز بغداد کی تاتاریوں کے ہاتھوں تباہی:

اس سے لوگوں میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں مجموعی طور پر، ایک مایوسی پیدا ہوئی...... اس کے نتیجے کے طور پر، فقہائے متقدمین نے قوانین شریعت کی تعبیر جس طرح کی تھی، اس کو جوں کا توں برقرار اور ہر قسم کی بدعات سے پاک رکھا۔(۷)

ان کے خیال میں...... شیخ ابن تیمیہ...... حافظ ابن حزم، اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریکیں اس جمود کے خلاف ایک کھلی بغاوت یا دعوت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تاہم ان تحریکوں سے بھی وہ جمود ختم نہ ہوا، جو عملاً دنیائے اسلام پر محیط اور طاری ہے۔(۸) اس کے برعکس علامہ کے نزدیک ترکوں کے سیاسی اور مذہبی افکار میں اجتہاد کا جو تصور کام کر رہا تھا، اسے عہد حاضر کے فلسفیانہ خیالات سے اور زیادہ تقویت پہنچی اور جس سے اس میں مزید وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔(۹)

بعد ازاں علامہ اقبالؒ نے کئی صفحات پر پھیلے ہوئے، اپنی فاضلانہ بحث میں ترکوں کے سیاسی اور مذہبی خیالات کے خلاصے پیش کر کر کے...... یہ ثابت کیا ہے، کہ ترکوں کے خیالات بہت حد تک جدید تھے اور ان کے ہاں اجتہاد کا اصول بڑی حد تک کارفرما رہا تھا۔(۱۰)

۴۔ ایضاً،ص ۲۳۰۔
۵۔ ایضاً،ص ۲۳۰-۲۳۱
۶۔ ایضاً،ص ۲۳۱-۲۳۲۔
۷۔ ایضاً،ص ۲۳۲۔
۸۔ ایضاً،ص ۲۳۵-۲۳۶۔
۹۔ ایضاً، ۲۳۶-۲۵۲۔
۱۰۔ ایضاً،ص ۲۶۷-۲۶۸۔

۲۔ اجماع اور پارلیمنٹ

اجتہاد پر اپنی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے، علامہ اقبال ''نے مآ خذ فقہ'' کے ضمن میں قرآن وحدیث کے تحت اجماع کی حجیت پر زور دیتے ہوئے، اسے عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ قرار دیا ہے۔ وہ اس عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

(ج) اجماع:

فقہ اسلامی کا تیسرا مآ خذ اجماع ہے اور میرے نزدیک اسلام کے قانونی تصورات میں سب سے زیادہ اہم ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ اس نہایت ہی اہم تصور پر اگر چہ صدر اسلام میں نظری اعتبار سے تو خوب پذیرائی ہوتی رہی، لیکن عملاً اس کی حیثیت ایک خیال سے آگے نہیں بڑھی، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ممالک اسلامیہ میں یہ تصور ایک ادارے کی صورت اختیار کر لیتا، شاید اس لیے کہ خلیفہ چہارم کے بعد جب اسلام میں مطلق العنان ملوکیت نے سر اٹھایا تو یہ اس کے مفاد کے خلاف تھا کہ اجتہاد کو ایک مستقل تشریعی ادارے کی شکل دی جاتی، اموی اور عباسی خلفاء کا فائدہ اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق بحیثیت افراد مجتہدین ہی کے ہاتھ میں رہے۔ بجائے اس کے کہ اس کے لیے ایک مستقل مجلس قائم ہو، جو بہت ممکن ہے کہ انجام کاران سے بھی زیادہ طاقت حاصل کر لیتی، بہر حال یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اس وقت دنیا میں جو نئی قوتیں ابھر رہی ہیں، کچھ ان کے اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیش نظر مسلمانوں کے ذہن میں بھی اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے مخفی امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔(۱۱)

علامہ اقبالؒ نے اجماع پر اپنی بحث کو...... منطقی انجام تک پہنچاتے ہوئے اور جدید قانون ساز اداروں کو...... پیش نظر رکھتے ہوئے...... درج ذیل موقف اختیار کیا ہے:

''بلاد اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشوونما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام ایک بڑا ترقی کا قدم ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مذاہب اربعہ کے نمائندے جو سر دست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں، اپنا یہ حق مجالس تشریعی کو منتقل کر دیں گے، یوں بھی مسلمان چونکہ متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، اس لیے ممکن بھی ہے تو اس وقت اجماع کی یہی شکل۔ مزید براں غیر علماء (ماہرین قانون) بھی جو ان امور میں بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، اس میں حصہ لے سکیں گے، میرے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے، جس سے کام لیکر، ہم زندگی کی اس روح کو جو ہمارے نظامات فقہ میں خوابیدہ ہے، ازسرنو بیدار کر سکتے ہیں، اسی طرح اس میں ایک ارتقائی نظر پیدا ہوگا۔''(۱۲)

علامہ اقبال نے اس سوال پر بھی بحث کی ہے کہ پارلیمنٹ کے اراکین کی اکثریت اگر ناخواندہ ہے، یا دینی علم سے بے بہرہ ہے تو اس صورت میں، ان کا کیا ہوا اجتہاد کیا حیثیت رکھتا ہے، اس سوال کا جواب دیتے ہوئے، علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے:

لیکن ابھی ایک اور سوال ہے، جو اس سلسلے میں کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں تو جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی قانون ساز مجلس قائم ہوگی، اس کے ارکان زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے جو فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے ناواقف ہیں، لہٰذا اس کا طریق کار کیا ہوگا کیوں کہ اس قسم کی مجالس شریعت کی تعبیر میں بڑی بڑی شدید غلطیاں کر سکتی ہیں، ان غلطیوں کے ازالے یا کم سے کم امکان کی صورت کیا ہوگی؟ ۱۹۰۶ء کے ایرانی دستور میں تو اس امر کی گنجائش رکھ لی گئی ہے کہ جہاں تک امور دینی کا تعلق ہے ایسے علماء کی جو

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۶۷-۲۶۸۔

معاملات دنیوی سے بھی خوب واقف ہیں، ایک الگ مجلس قائم کر دی جائے، تا کہ وہ مجلس کی سرگرمیوں پر نظر رکھے...... یہ چیز بجائے خود بڑی خطرناک ہے، لیکن ایرانی نظریہ دستور کا تقاضا کچھ ایسا ہی تھا،......

بہر حال ایرانی نظریہ دستور کچھ بھی ہو، یہ انتظام بڑا خطرناک ہے اور سنی ممالک اسے اختیار بھی کریں تو عارضی طور پر، انہیں چاہیے کہ مجالس قانون ساز میں علماء کو بطور ایک مؤثر جزو شامل تو کر لیں، لیکن علماء بھی ہر امر قانونی میں آزادانہ بحث وتمحیص اور اظہار رائے کی اجازت دیتے ہوئے، اس کی رہنمائی کریں، بایں ہمہ شریعت اسلامی کی غلط تعبیرات کا سدباب ہو سکتا ہے، تو صرف اس طرح کہ بحالت موجودہ بلاد اسلامیہ میں فقہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے، اس کی اصلاح کی جائے۔ فقہ کا نصاب مزید توسیع کا محتاج ہے، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ جدید فقہ کا مطالعہ بھی باحتیاط اور سوچ سمجھ کر کیا جائے۔ (۱۳)

خلاصہ مباحث:

(الف) علامہ اقبال زندگی کے دوسرے شعبہ جات کی طرح ''فقہ اسلامی'' کی تشکیل جدید کے بھی خواہش مند تھے اور اس ضمن میں وہ اجتہاد کے ادارے کو از سر نو متحرک اور فعال دیکھنا چاہتے تھے۔

(ب) علامہ اقبال نے اپنے خطبے میں اجتہاد کی بندش کے تین اسباب کا ذکر کیا ہے اور ان کے ازالے کی طرف اہل علم کو دعوت دی ہے۔

(ج) علامہ اقبال اور دور جدید میں اجتہاد کو انفرادی کے بجائے اجتماعی سطح پر سرانجام دینے اور اسے پارلیمنٹ کی سطح پر مربوط اور منظم طور پر پیش کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے درج ذیل تین تجاویز دی ہیں:

۱۔ ایران کے دستور ۱۹۰۶ء کی طرح جید اور نامور علمائے کرام پر مشتمل ایک ایسی مجلس قائم کی جائے، جو مجلس قانون ساز کی اس نوع کی سرگرمیوں پر نظر رکھے...... لیکن علامہ کے خیال میں یہ تجویز بجائے خود بڑی خطرناک ہے...... اور اسے سنی ممالک میں عبوری طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ مجالس قانون ساز میں ایک مؤثر جزو کے طور پر علماء کو شامل کیا جائے اور آزادانہ بحث وتمحیص کے بعد...... قانون سازی کی جائے۔

۳۔ مسلمان ممالک...... فقہ اسلامی کے نصاب پر نظر ثانی کریں اور ایک ایسا توسیع پسندانہ نصاب تیار کیا جائے، جس سے عام لوگ بھی اسلامی احکام سے مناسب طور پر واقف ہو سکیں۔

علامہ اقبالؒ کے تصور اجتماعی اجتہاد...... یا مجالس قانون ساز کے ذریعے ہونے والے اجتہاد یا اجماع کے حوالے سے خیالات بالکل واضح اور دوٹوک ہیں اور ان پر کسی حاشیہ آرائی...... یا مزید وضاحت یا تشریح کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن علامہ اقبالؒ کے شارحین نے ان خیالات کو ایک چیستاں بنا دیا اور اس کی عجیب وغریب تشریحات پیش کیں، علامہ اقبال کے چند شارحین کے خیالات درج ذیل ہیں:

ا۔ پروفیسر محمد عثمان

اقبالؒ کے ایک شارح پروفیسر محمد عثمان نے ''فکر اقبال کی تشکیل نو'' کے عنوان سے، اپنی کتاب میں، علامہ اقبال کے مذکورہ

۱۳۔ ایضاً، ۲۶۸۔

الفاظ پردرج ذیل تبصرہ کیا ہے:

بہرحال ایران کا یہ بندوبست اور علماء کی اس نوع کی بالادستی اقبالؒ کے نزدیک جدید زمانے کی روح اور خود اسلام کی منشا کے منافی تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ دوسرے اسلامی ملک اپنے ہاں اسی طرز کا کوئی نگران ادارہ قائم کریں، ان کے خیال میں بہترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ خود علماء خاصی تعداد میں مجلس قانون ساز کے باقاعدہ اور منتخب رکن ہوں، تاکہ اسلامی ملکوں میں بھی مسائل پر آزادانہ بحث کے ساتھ فیصلوں پر پہنچنے کی جمہوری روایت قائم ہو سکے۔ دوسرے لفظوں میں اقبال رائے عامہ اور ووٹ کے ذریعے منتخب ہونے والی مجلس کے اختیارات پر کسی مخصوص طبقے یا مفاد کی پردہ داری کو اسلامی فقہ اور جمہوریت کی آزادانہ نشوونما میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی فکر کا یہ پہلو بڑی دوررس اہمیت کا حامل ہے، بالخصوص ایک ایسے دور میں جب کہ پاکستان کی ملت اسلامیہ جمہوریت کے حصول اور جمہوری اداروں کی بحالی کے لیے سرتوڑ کوشش میں مصروف ہے۔ علامہ اقبال کا یہ واضح موقف ان کی طرف سے عوامی جمہوریت کی یہ بے لاگ حمایت، منتخب افراد پر ان کا یہ پختہ اعتماد ہمارے لیے روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اسلامی ممالک کے نظام تعلیم کی اصلاح پر بھی توجہ دلائی ہے۔ تاکہ اہل سیاست اور عام تعلیم یافتہ مسلمان اسلام کی روح کو بہتر طور پر سے سمجھنے کے قابل ہو سکیں۔ (۱۴)

اس پیراگراف پر غور کرنے کے بعد درج ذیل نتائج واضح ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال نے منتخب یا غیر منتخب کی بات نہیں کی۔ انہوں نے علماء کو مؤثر طور پر پارلیمنٹ میں شریک اور شامل کرنے پر زور دیا ہے اور عبوری طور پر، کسی ایک مجلس کے قیام کو بھی...... کچھ عرصہ کے لیے...... درست قرار دیا ہے، مگر...... علامہ کے شارح نے اسے کچھ اور ہی بنا کے رکھ دیا ہے۔

پروفیسر محمد عثمان صاحب نے علماء کو شامل کرنے کے لیے ان کے منتخب ہونے کی شرط کا اضافہ کر دیا ہے، حالانکہ علامہ اقبال نے علماء کے منتخب یا غیر منتخب ہونے کی بات نہیں کی اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ منتخب اور غیر منتخب میں بے حد فرق ہے۔

۲۔ علامہ اقبال نے علماء کو پارلیمنٹ میں مؤثر جزو کے طور پر شامل کرنے پر زور دیا ہے، جبکہ پروفیسر عثمان نے اس کی جگہ یہ جملہ اضافہ کر دیا ہے:

دوسرے لفظوں میں اقبال رائے عامہ اور ووٹ کے ذریعے منتخب ہونے والی مجلس کے اختیارات کسی مخصوص طبقے یا مفاد کی پردہ داری کو اسلامی فقہ اور جمہوریت کی آزادانہ نشوونما میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ (۱۵)

۳۔ علامہ اقبال کے سامنے سب سے اہم مسئلہ ایک یہ تھا کہ ایک ایسی فقہ کی تشکیل کی جائے، جو عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ چاروں فقہی مسالک پر مبنی ہو، مگر پروفیسر عثمان کے نزدیک اصل مسئلہ جمہوریت کی بقا اور اس کی بحالی کا ہے، اسی لیے پروفیسر عثمان نے علماء کے منتخب ہونے پر زور دیا ہے اور ان کے نزدیک غیر منتخب علماء کا مجلس میں اضافہ جمہوریت کے لیے نقصان دہ ہے۔

۲۔ ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کی تشریحات

اس سے ملتا جلتا بلکہ اس سے کافی آگے بڑھتا ہوا انداز...... ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کا بھی ہے۔ انہوں نے ''اقبال اور

۱۴۔ فکر اقبال کی تشکیل نو، اقبال اکیڈمی لاہور، ۱۱/۲۷۱۔

۱۵۔ پروفیسر محمد عثمان، فکر اقبال کی تشکیل نو، ص ۲۷۱۔

اجتہاد'' کے عنوان پر، ایک مختصر سا کتابچہ تحریر کیا ہے، جس میں علامہ اقبال کے اسی خطبے کو موضوع بحث ٹھہرایا ہے......اور اس سے ایسے ایسے معانی پیدا کیے ہیں، جو شاید علامہ مرحوم کے ذہن وفکر میں بھی موجود نہ تھے...... چنانچہ ڈاکٹر صاحب ''تعبیر شریعت کا اختیار پارلیمنٹ کو کیوں'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کا جواب نیابت واضح اور دوٹوک ہے، ان کے نزدیک اب وقت آ گیا ہے کہ فقہی مسلکوں کے غیر منتخب نمائندوں سے اختیار اجتہاد لیکر اسے قوم کی منتخب اور نمائندہ قانون ساز اسمبلی کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرقے دور ملوکیت اور استعمار کی پیداوار ہیں اور اب جمہوریت کا دور ہے۔ چوتھے خلیفہ راشد کی وفات کے عہد بنی امیہ اور بعد میں عہد بنوعباس میں تعبیر شریعت کا اختیار امت کے فقہی مسلکوں اور فرقوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔''(۱۶)

علامہ کا اجتہاد غیر مبہم ہے، عہد جدید میں تعبیر شریعت کا اختیار صرف اور صرف منتخب قومی اسمبلی کو حاصل ہے ان کے اس اجتہاد کے دو بڑے سبب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ فقہی مسلکوں کے افراد تعبیر شریعت کے اہل نہیں ہیں، کیوں کہ پوری قوم کی شریعت ایک ہے، جب کہ وہ ایک شریعت کے بجائے مختلف اور متحارب فقہوں کے نمائندے ہیں۔ وہ اپنے فرقے کے لیے اپنی فقہ کی تعبیر کر سکتے ہیں، مگر پوری قوم کے لیے شریعت کی تعبیر نہیں کر سکتے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام میں اختیار تعبیر شریعت پوری قوم کا حق ہے۔ خدا نے یہ اختیار کسی فرد یا فرقے کو تفویض نہیں کیا، بلکہ اس کا اختیار پوری قوم کو دیا ہے۔

حالانکہ علامہ اقبالؒ کی عبارت میں ایسی کوئی تلمیح یا اشارہ تک موجود نہیں ہے۔

جہاں تک علماء کی نامزدگی کا سوال ہے، جسے علامہ اقبال نے ......عبوری طور پر گوارا کرنے ...... کا عندیہ دیا ہے، اس پر ڈاکٹر صاحب کا تبصرہ یہ ہے:

علامہ ہر حالت میں قانون ساز اسمبلی کی بالادستی کے قائل ہیں، وہ علماء کی کسی نامزد کونسل کو اسمبلی کی نگرانی پر برداشت نہیں کرتے، انہوں نے ۱۹۰۶ کے ایرانی دستور میں علماء کی نگران کونسل کی شق پر سخت تنقید کے بعد اسے خطرناک انتظام قرار دیا ہے۔(۱۷)

(الف) ڈاکٹر گورایہ...... اسمبلی کو...... اجتہاد مطلق کا حق دینے کے قائل ہیں...... ان کا خیال ہے کہ ووٹ کی بنیاد پر معرض وجود میں آنے والی اسمبلی...... گزشتہ دور کے تمام فرسودہ اجتہادات کو اور حتی کہ صحابہ کرام تک کے اجتہادات کو مسترد کرنے کی مجاز ہے۔(۱۸)

حالانکہ علامہ اقبال نے...... بین السطور بھی، ایسی کوئی بات نہیں کی ہے......

(ب) ڈاکٹر گورایا...... نے اس سے بھی ایک قدم آگے...... اس خطبے کی بنیاد پر، علامہ اقبال کو...... ''مجتہد مطلق'' کے منصب صدارت پر بٹھادیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال اجتہاد کے درجہ اول (First Degree of Ijtihad) (اجتہاد مطلق) کے داعی ہیں، وہ خود مجتہد مطلق ہیں، ان دو اصطلاحوں کا استعمال وہ اپنے قلم سے خود کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اجتہاد کے اصول خود وضع کیے ہیں اور انہیں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے مآخذ شریعت قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس پر جو بحث کی ہے وہ نہایت بصیرت افروز

۱۶۔ اقبال اور اجتہاد، مطبوعہ فیروز سنز لاہور، بار اول ۱۹۸۹ء۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۵۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ڈاکٹر گورایا صاحب کا یہ دعویٰ، بذات خود متنازع ہے، اس لیے کہ امت میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کوئی شخص صحابہ کرامؓ کے اجتہادات کو ختم کر سکتا ہے ان کا یہ دعویٰ ''مدعی سست گواہ چست'' کے زمرے میں آتا ہے۔

ہے، جس سے ان کے اجتہاد کے وضع کردہ قواعد وضوابط واضح ہوتے ہیں۔(۱۹)''

(ج) اجتہاد کی آزادی

اسی طرح...... آگے چل کر پارلیمنٹ کے اجتہاد کا مفہوم کے تحت، انہوں نے...... درج ذیل عبارت لکھی ہے:

''علامہ اقبال کے اس اجتہاد کی بھی مخالفت ہوئی تھی کہ تعبیر شریعت کا اختیار پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔ اعتراض یہ تھا کہ گذشتہ زمانے کی فقہ میں اجتہاد کی جو شرائط درج ہیں، وہ کوئی پوری نہیں کرسکتا۔ اقبال کا جواب یہ تھا، کہ اول تو ناممکن العمل شرائط کا کوئی جواز نہیں، اجتہاد امت کی مسلسل اور غیر مختتم ضرورت ہے، جسے ہرگز ملتوی نہیں کیا جاسکتا ان کا دوسرا جواب یہ تھا کہ اگر یہ شرائط کسی ایک فرد میں نہیں پائی جاتیں تو وہ پوری قوم میں تو موجود ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اجتہاد مطلق کا اختیار پوری قوم کی منتخب پارلیمنٹ کو دیا۔ پارلیمنٹ میں ہر استعداد اور صلاحیت کے ارکان موجود ہوتے ہیں، ان سب کا مجموعی علم اور تجربہ یقیناً کسی بھی بڑے سے بڑے مجتہد سے زیادہ ہوتا ہے، جب پارلیمنٹ کا اختیار واجتہاد مان لیا جائے گا تو قوم کا شعور اور احساس خود بخود بیدار ہو جائے گا، کہ وہ ایسے نمائندے منتخب کرے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہوں۔(۲۰)''

اس عبارت میں بھی مذکورہ بالا دونوں سوالوں کے جواب کو علامہ اقبال کی طرف غلط طور پر منسوب کیا ہے، جس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ موصوف جن باتوں کے ذاتی طور پر قائل ہیں اور جن باتوں کی وہ شد و مد سے دعوت دیتے رہے ہیں، انہوں نے وہ تمام باتیں، علامہ اقبال کے نام سے منسوب کر دی ہیں...... یہ سوچے سمجھے اور یہ جانے بوجھے بغیر کہ ان کی ان باتوں سے...... علامہ اقبالؒ کی ذات پر بھی حرف آئے گا اور ان کے ان مزعومہ خیالات سے...... پارلیمنٹ کی اصلاح کے بجائے...... اس میں موجود خرابیوں کی مزید حوصلہ افزائی ہوگی۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ اقبال نے ۱۹۳۲ء کے خطبہ صدارت میں یہ بھی فرمایا تھا:

''میں علماء کی اسمبلی کے قیام کا مشورہ دوں گا، جس میں مسلمان وکلا بھی شامل ہوں۔ (جو فقہ سے واقف ہوں) اس کا مقصد حفاظت اسلام اور تجدید ہوگا، لیکن اس طریقے میں بنیادی اصولوں کی روح قائم رہے اور اس اسمبلی کو دستوری سند حاصل ہو، اس قسم کی اسمبلی کا قیام اسلامی اصولوں کو سمجھنے میں بڑا مددگار ثابت ہوگا۔(۲۱)''

علامہ اقبال اسلام اور اسلامی تہذیب سے جس طرح کی محبت رکھتے تھے، اس کا اندازہ ان کے الفاظ سے کیا جاسکتا ہے، انہوں نے ایک خطبے میں فرمایا تھا:

''مسلمانوں کو بے شک علوم جدیدہ کی تیز رفتاری کے قدم بقدم چلنا چاہئے، لیکن یہ بھی ضروری ہے، کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو اور یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو، جسے ہم اپنی قومی تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں، ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے، تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو اسلام کے آب حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں مسلمان کا اضافہ نہیں کررہے جو بوجہ کسی اکتسابی یا اتحادی مرکز کے نہ ہونے کے اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا اور گرد و پیش کی ان قوموں میں سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائے گا، جس میں اس کی

۱۹۔ علامہ اقبال اور اجتہاد، ص ۲۹۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ ڈاکٹر محمد طاہر القادری اقبال کا خواب اور آج کا پاکستان۔ ص ۱۴، ۱۵۔

نسبت زیادہ قوت جان ہوگی۔(۲۲)"

۳۔ پروفیسر خالد مسعود کی تشریحات

علامہ اقبال کے شارحین میں پروفیسر خالد مسعود کا نام بھی شامل ہے..... پروفیسر صاحب ان سطور کی تحریر کے وقت اسلامی نظریاتی کونسل کے سربراہ ہیں اور ان کا شمار وطن عزیز کے نامور ماہرین قانون اور اقبال شناس لوگوں میں ہوتا ہے..... انہوں نے اپنی کتاب..... "اقبال کا تصور اجتہاد" میں لکھا ہے:

علامہ اقبالؒ نے اس مسئلے پر سب سے پہلے اپنے افکار ۱۹۰۸ء میں شائع کیے۔ انہوں نے انگریزی میں ایک مقالہ "اسلام اور خلافت" کے عنوان سے لکھا جو لندن کے مجلّے "سوشیالوجیکل ریویو" میں چھپا (۲۳)، اس مقالے میں انہوں نے استدلال پیش کیا کہ خلافت اپنی روح اور اساس کے لحاظ سے جمہوری ہے۔ اس کی تشکیل انتخاب سے ہوتی ہے اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد عرب کے قبائلی سیاسی نظام پر ہے لیکن جوں جوں اسلامی فکر میں نظر و تدبر کے دائرے وسیع ہوتے گئے یہ ابتدائی سیاسی ڈھانچہ ایک سیاسی اصول کی حیثیت اختیار کرتا گیا۔ یہ سیاسی اصول دو تھے:

۱۔ جمہوریہ اسلامیہ کی بنیاد شریعت کے مطابق مطلق و آزاد مساوات پر قائم ہے۔ کسی کو دوسرے پر قانونی یا دینی برتری حاصل نہیں۔ اسلامی شریعت میں مذہب و سیاست میں کوئی تفریق نہیں۔

۲۔ مذہب و حکومت کو یکجا کرنے کا نام سیاست نہیں، بلکہ سیاست وہ عنصر غالب و منفرد ہے جس سے مذہب کو جدا نہیں کیا جا سکتا چنانچہ خلیفہ کی حیثیت خدا کے نائب کی نہیں اور نہ ہی وہ کوئی مذہبی پیشوا ہے۔(۲۴)

اقبال کے نزدیک اسلامی قانون کی روح جمہوری ہے کیونکہ "مذہب اسلام میں اساسی قانون کی بنیاد اور شریعت کے تصریحی احکام کے بعد تمام تر قوانین کے لیے اصول اتحادِ آرائے جمہورِ ملت ہے۔ نئے مسائل پیش آنے کی صورت میں اجماع امت کو منبع قانون تصور کیا جائے گا۔"

اسلامی سیاست کا بنیادی اصول انتخاب ہے جو خلافت کو جمہوری شکل دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اسی اصول کی صراحت کی گئی ہے اور باقی تفصیلات کا فیصلہ امت پر چھوڑ دیا ہے۔ پھر جہاں تک طریقہ انتخاب کا تعلق ہے، تو وہ علامہ اقبال کے نزدیک جمہوری ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود علامہ اقبال کے مذکورہ بالا رسالے خلافت اسلامیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

علامہ اقبالؒ اسلام کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں نے انتخاب کے تصور پر کما حقہ توجہ نہیں دی اور اس کی بنیاد پر سیاسی نظام پیش نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خلافتِ راشدہ کے بعد بہت جلد حکومت پر ایسے لوگوں کا عمل دخل ہو گیا جو انتخاب کے مفہوم اور اہمیت سے واقف نہیں تھے خصوصاً ایرانی اور منگول جو بادشاہ کو خدا کا مظہر سمجھتے تھے۔ ان سے پہلے اموی دور میں بھی مسلمان خود تو جنگوں اور فتوحات میں مشغول رہے اور کاروبارِ حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو مطلق العنانی کے نظریے کے قائل تھے، چنانچہ اس طرح قرآنی تعلیمات، منہاجِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کی روح کے برعکس انتخاب اور جمہوریت

۲۲۔ ایضاً۔

۲۳۔ اس مقالہ کا اردو ترجمہ چوہدری محمد حسین نے "خلافتِ اسلامیہ" کے عنوان سے کیا یہ ترجمہ فکر اقبال، مرتبہ غلام دستگیر رشید (لاہور، اردو مرکز، ۱۹۵۶ء) میں شامل ہے۔

۲۴۔ اقبال کا تصور اجتہاد، ص ۲۲۶۔۲۲۷۔

کے اصول کی اہمیت کم ہوتی گئی اور خلافت اجتماعی اصول کی بجائے انفرادی بنتی چلی گئی۔حتیٰ کہ خلافت اور مطلق العنان بادشاہت میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔(۲۵)

ڈاکٹر خالد مسعود نے مزید لکھا ہے:

خلافت کے اجتماعی اور جمہوری تصور کا احیاء دورِ جدید میں ہوا ہے۔علامہ اقبالؒ کا کہنا ہے کہ آج جن اصلاحات کو ہم یورپی اور مغربی سمجھ رہے ہیں دراصل اسلامی ہیں۔

''میں ان تمام سیاسی مصلحین کو یہ رائے دوں گا کہ ان کے لیے اشد ضروری ہے کہ پیشتر اس کے کہ وہ اپنے آپ کو نئی تہذیب کے پیغمبر ظاہر کر کے اپنے لوگوں کی اس قدامت پسندی کو جو قدرتاً ان سے بدظن ہے، صدمہ پہنچائیں وہ اسلامی آئینِ اساسی کے اصولوں کا بغور وخوض مطالعہ فرمالیں اور اگر اس طرح جمہور پر یہ ثابت کر دیں اور ان کو یقین دلا دیں کہ سیاسی آزادی کے وہ اصول جو بظاہر غیر اسلامی نظر آتے ہیں فی الحقیقت عین اسلامی ہیں، اسلام ہی کا مقصود و منتہا ہیں اور آزاد اسلامی ضمیر کا مطالبہ اسلامی اصولوں ہی پر مبنی ہے اور انہی کا مقتضی ہے تو یقیناً وہ جمہور اور عامۃ الناس کو زیادہ متاثر کر سکیں گے اور ان کو مطلوبہ سیاسی انقلاب کے لیے آمادہ کار پائیں گے''۔(۲۶)

علامہ اقبالؒ کا یہ مقالہ حقیقتاً اس دور کا ہے جب ابھی مسئلہ خلافت پر بحثیں نظری تھیں اور ترکی میں اصلاحی کام کا آغاز ہوا تھا، لیکن ابھی خلافت میں تبدیلی کا مسئلہ زیرِ بحث آیا، تو علامہ اقبال کے تجزیے کی توثیق ہوئی، چنانچہ مقالہ اجتہاد کے زمانے میں عملی طور پر خلافت کے خاتمے کا اعلان کر کے ترکی میں جمہوری حکومت کا آغاز ہوا۔ علامہ کے نزدیک یہ سارے واقعات دراصل اسلام کی جمہوری روح کے غماز تھے۔ بلکہ علامہ نے اس ساری پیش رفت کو دورِ جدید میں اصولِ اجتہاد کی کارفرمائی قرار دیا، اس حوالے سے علامہ اقبال کے افکار کی وضاحت ڈاکٹر خالد مسعود نے یوں کی ہے:

''خلافت کی اس جمہوری اور اجتماعی شکل کی وضاحت کے لیے ابن خلدون اور ابوبکر باقلانی کے حوالے سے علامہ اقبالؒ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگر چہ امامت یا خلافت اہلِ سنت کے نزدیک نظری طور پر یہ لازمی سمجھا گیا کہ وہ سارے عالمِ اسلام کے لیے ایک ہو، یعنی عالمگیر ہو لیکن تاریخ کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ عملاً ایسا نہیں رہا۔ خلافت مختلف علاقوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور فقہا نے نظری طور پر بھی اس کا جواز پیش کیا، لیکن آج کے دور میں اب حالات کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان حکومتیں اپنے اپنے علاقوں میں قوت پکڑیں اور بعد میں وفاقی قسم کے اتحاد میں وہ عالمگیر امامت یا خلافت کا قیام عمل میں لا سکتی ہیں۔ خلافت کے مسئلے میں حالات سے سمجھوتے کی مثال قریشیت کی شرط سے پیش کی جا سکتی ہے۔ بہت عرصے تک خلافت کا بنیادی اصول یہ رہا کہ خلافت قریش میں محدود رہے، لیکن جب قریش کی قوت کمزور پڑی اور وہ حکمرانی کے قابل نہ رہے تو علماء نے خلافت کے لیے قریشیت کی شرط پر نظر ثانی کی۔ چنانچہ ترکی کے عثمانی خلفاء قریش نہ ہوتے ہوئے بھی مسندِ خلافت پر متمکن رہے۔(۲۷)''

بقول ڈاکٹر خالد مسعود علامہ اقبالؒ کے نزدیک اجتہاد اور خلافت دونوں اصولوں کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے۔

۲۵۔ ایضاً۔ص ۲۲۷۔

۲۶۔ ایضاً، بحوالہ اقبال، خلافت اسلامیہ، ص ۸۹، ایضاً۔

۲۷۔ ایضاً۔ص ۲۲۸

چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ جب تک خلافت اجتماعی اور جمہوری رہی اجتہاد بھی اجتماعی رہا، لیکن خلفائے راشدین کے بعد جونہی خلافت انفرادی اقتدار اور ملوکیت میں تبدیل ہوئی اجتہاد کی اجتماعی حیثیت بھی ختم ہو گئی اور اس طرح اجتہاد کے ایک باقاعدہ قانون سازی کا ادارہ تعمیر کرنے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔(۲۸)

۲۔ علامہ اقبال اور اصول اجماع

''اجماع'' کا اصول تمام دنیائے اسلام میں ایک مسلمہ اصول کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے لیے صاحب اجتہاد لوگوں کا کسی ایک رائے پر متفق ہونا ہے، جب کہ علامہ اقبال کے شارحین کے نزدیک اجماع کا اطلاق پارلیمنٹ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود لکھتے ہیں:

علامہ اقبالؒ اجماع کو ایسا اصول سمجھتے تھے جس میں قانون ساز اسمبلی بننے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں، لیکن اگرچہ قرونِ اولیٰ میں اس کے کردار کے بارے میں بحثیں ہوتی رہیں اور نظری طور پر آج بھی اس کی تعریف اسی انداز سے کی جاتی ہے لیکن یہ بات ایک خیال سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکی اور اجماع عملی طور پر ایک باقاعدہ ادارہ نہ بن سکا۔ عین ممکن ہے کہ مطلق العنان بادشاہوں نے ایسے ادارے کے قیام کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھا ہو اور اس کے ارتقاء کو روک دیا ہو۔ تاہم دورِ جدید میں حالات بدل چکے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک اجماع جمہوری اصول تھا اور اس کی رو سے قانون سازی کا حق چند افراد میں محدود کرنے کی بجائے جمہورِ امت کی اس میں شرکت کی تائید ہوتی تھی۔ ویسے بھی جیسا کہ ہم گذشتہ ابواب میں وضاحت کر آئے ہیں مسائل کی نوعیت اب اتنی بدل گئی ہے اور علوم کی حدود اتنی وسیع ہو گئی ہیں کہ ان کے لیے اصول فقہ میں شرائط اجتہاد میں مذکور علوم اجتہاد کے لیے کافی نہیں رہے۔ آج اجتہاد کے لیے علومِ اقتصادیات، سیاسیات، نفسیات، طبیعیات غرض بہت سے علوم سے واقفیت اشد ضروری ہے اور ان شرائط کا پورا کرنا انفرادی اجتہاد کے بس کی بات نہیں۔ آج کا اجتہاد محض روایتی مجتہد اور عالم کی طاقت سے باہر ہے، لیکن اسی طرح روایتی عالم کی مدد کے بغیر بھی اجتہاد ممکن نہیں۔ چنانچہ قانون ساز اسمبلی کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے اور اسے اجماع کی جدید شکل قرار دیتے ہوئے بھی اس کی ہیئت کا سوال باقی رہ جاتا تھا۔(۲۹)

سوال یہ تھا کہ مجالسِ قانون ساز کو اجتہاد اور اجماع کی ذمہ داری سونپنے کے لیے کیا اس میں ماہرینِ علم وفن کی شرکت لازمی نہیں ہو گی؟ اور انہیں شریک کیا جائے تو اس کی شکل کیا ہو گی؟ معلوم ہوتا ہے برصغیر میں ان مسائل پر بہت سوچا جا رہا تھا۔ بہت سے علماء کا خیال تھا کہ قانون ساز اسمبلیوں میں علماء کا ہونا ضروری ہے۔ وحید احمد مسعود صاحب اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے یاد ہے کہ مولانا محمد علی صاحب چندواڑہ جیل سے رہائی کے بعد جب ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں مقیم تھے تو مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے میر محفوظ علی صاحب بی۔اے بدایوانی سے کہا تھا کہ عزت گم شدہ حاصل کرنے کے لیے علماء کو

۲۸۔ ایضاً۔ ص ۲۳۰۔

۲۹۔ ایضاً۔ ص ۲۳۱۔

لیجسلیٹوز (Legislatives) کے انتخابات میں حصہ لینا ضروری ہے کیونکہ قوم کی صحیح نمائندگی وہی کر سکتے ہیں۔''(۳۰)

اس اقتباس سے تو اندازہ یہی ہوتا ہے کہ یہاں اسمبلیوں میں شرکت کی نوعیت سیاسی دباؤ کی تھی اور غالباً وہ مقصود بالکل نہیں تھا جو علامہ اقبالؒ کا تھا۔ بہر کیف برِصغیر کا یہ رجحان ایرانی رجحان کے برعکس تھا جہاں علماء باقاعدہ مجلس قانون سازی کا حصہ بننے کی بجائے اپنی الگ مجلس کے قیام کے حق میں تھے۔ درحقیقت علامہ جمال الدین افغانیؒ بھی علماء کی ایسی مجالس کے قیام قائل تھے، جو جمہوری قانون ساز اداروں سے الگ ہوں اور دینی امور میں رہنمائی علماء کے ذمے ہو جب کہ باقی امور ان کے دائرہ اختیار میں نہ ہوں۔

علامہ اقبالؒ یہ سمجھتے تھے کہ علماء کو اس طرح کا اختیار دینے سے ایک طرف تو پاپائیت یا مذہبی پیشوائی کی راہ کھلے گی، دوسرے اس سے اسلامی سیاسی ڈھانچے کی جمہوری روح ختم ہو جائے گی، اس کی بجائے وہ علماء کو جمہوری عمل کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ علماء کی علیحدہ مجالس کے قیام کی بجائے ان کی تجویز تھی کہ:

''علماء کو مسلم قانون ساز اسمبلیوں کا لازمی حصہ بننا چاہئے تا کہ وہ قانون سے متعلقہ سوالات میں آزادانہ بحث میں مدد اور رہنمائی مہیا کر سکیں۔''(۳۱)

اس مقالے کے بعد البتہ علامہ اقبالؒ کو غالباً اس سلسلے میں عملی دشواریوں کا تجربہ رہا اور یہ مسئلہ سامنے آیا کہ برِصغیر کی اس وقت کی قانون ساز اسمبلیوں میں ایک تو ویسے ہی مسلمان اقلیت میں تھے اور پھر ان میں علماء کی بہت ہی کم تعداد انتخاب کے ذریعے جا سکتی تھی۔ اس لیے اسلامی قانون کی پیش رفت کے لیے مجبوراً انہوں نے اسی پہلے طریقے کی حمایت کی، جسے وہ اسلام کے لیے انتہائی خطرناک سمجھتے تھے اور جس کو محض عارضی طور پر آزمانے کے حق میں تھے، لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۲۱/ مارچ ۱۹۳۲ء کو صدارتی خطبہ میں انہوں نے فرمایا:

''میں تجویز کرتا ہوں کہ علماء کی ایک مجلس تشکیل دی جائے جس میں مسلم قانون دانوں کو بھی شامل کیا جائے جنہوں نے جدید اصولِ قانون کی تعلیم پائی ہو اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی قانون کی حفاظت اور توسیع اور اگر ضرورت ہو تو جدید حالات کی روشنی میں اس کی تعبیر نو کی جائے۔ اس میں اس روح کے قریب رہا جائے جو اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں میں کارفرما ہے۔ اس مجلس کو آئینی تحفظ حاصل ہونا ضروری ہے، تا کہ مسلمانوں کے شخصی قوانین کے سلسلے میں کوئی بل اس وقت تک اسمبلی میں پیش نہ ہو سکے جب تک وہ مجلس کی نظروں سے گذر نہ جائے۔''(۳۲)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تجویز اس وقت کی ہندوستان کی قانون ساز اسمبلیوں کی ہیئت کے پیشِ نظر دی گئی تھی اور غالباً یہ عارضی تجویز تھی۔ حقیقتاً علامہ اقبالؒ علماء کی قانون ساز اسمبلیوں میں باقاعدہ شرکت کے حامی تھے، کیونکہ اگر علماء کو قانون ساز اسمبلیوں کا رکن نہ بنایا جائے تو قانون ساز اسمبلیوں کے اجماع اور اجتہاد کے ادارے بننے کی وہ بات پوری نہیں ہو سکتی جس کو علامہ اقبالؒ اتنی اہمیت دیتے تھے۔

اجماع اور اجتہاد کے بارے میں علامہ نے ایک طرح سے دو اجتہادات پیش کیے تھے۔ ایک تو اجتہاد کے انفرادی کی

۳۰۔ ایضاً، بحوالہ وحید احمد مسعود، ''تم کو بے مہری یار و وطن یاد نہیں'' در رسالہ برہان، دہلی اپریل ۱۹۶۲ء، ص ۲۴۵۔

۳۱۔ تشکیل نو، ص ۱۷۶۔

۳۲۔ ایضاً، بحوالہ A.R Tariq, Speeches and Statements of Iqbal (Lahore, 1973) p. 14.

بجائے اجتماعی عمل کا تصور، دوسرے قانون ساز اسمبلیوں سے اجماع اور اجتہاد یا اجتماعی اجتہاد کے اداروں کا کام لینے کی تجویز۔ ان میں سے پہلی بات تو علماء میں خاصی مقبول ہوئی اور بہت سے علماء کے ہاں اس کی تائید ملتی ہے اگرچہ اس میں براہِ راست اقبال کے حوالے سے بات نہیں کی گئی تاہم پاکستان میں مولانا محمد یوسف بنوری اور بھارت میں مولانا محمد تقی امینی (۳۳) نے بہت زور کے ساتھ انفرادی کی بجائے اجتماعی اجتہاد پر زور دیا ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی اس خیال کو حمایت حاصل ہوئی ہے، چنانچہ شیخ ابوزہرہ (۳۴) اور مصطفیٰ احمد الزرقا (۳۵) اور دوسرے علماء نے اجتماعی اجتہاد پر زور دیا ہے۔ البتہ اس اجتماعی اجتہاد کی شکلیں کیا ہوں، اس پر علامہ اقبالؒ کے خیال کو قبولِ عام حاصل نہیں ہوسکا اکثر علماء نے جن میں شیخ ابوزہرہ اور مصطفیٰ زرقا بھی شامل ہیں علماء کی خصوصی مجالس اور تحقیقاتی اداروں کی تشکیل کی تجاویز دی ہیں، لیکن یہ اختیارات قانون ساز اسمبلیوں کو دینے کی تائید علماء کی جانب سے ابھی تک نہیں ہوئی۔ (۳۶)

قیام پاکستان کے بعد اگرچہ قانون ساز اسمبلی میں واضح اکثریت مسلمانوں کی تھی اور اس لحاظ سے علامہ اقبالؒ کی اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ممکن تھا کہ اسمبلی کو اجماع اور اجتہاد کا ادارہ بنالیا جائے، لیکن بوجوہ ایسا نہ ہوسکا اس کی بجائے پہلے پہل علماء کا خصوصی بورڈ قائم ہوا جو قانون ساز اسمبلی کی کارروائی کی نگرانی ورہنمائی کرسکے۔ تحقیقی ادارے مثلاً ادارہ تحقیقاتِ اسلامی وغیرہ بھی قائم ہوئے۔ علماء کی مجالس اسلامی مشاورتی کونسل اور اسلامی نظریاتی کونسل کے نام سے آئینی تحفظات کے ساتھ قائم ہوئیں لیکن یہ چونکہ قانون ساز اسمبلی کا باقاعدہ حصہ نہیں اس لیے علامہ اقبالؒ کی تجویز عمل میں نہیں لائی جاسکی اور وہ طریقہ جسے وہ سنی ملکوں کے لیے خطرناک سمجھتے تھے اکثر اسلامی ممالک میں رائج چلا آرہا ہے۔

خلاصہ بحث:

علامہ اقبال کے دوسرے شارحین کے برعکس خالد مسعود نے علامہ اقبال کے افکار کو کافی حد تک ان کے صحیح سباق وسیاق میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، اگرچہ ان کے خیالات پر بھی جدیدیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔

(الف) ڈاکٹر خالد مسعود نے اپنے تجزیاتی مطالعہ میں علامہ اقبال کے خطبات مدراس کے پہلے اور بعد کے دور کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور علامہ اقبال کے افکار کو حالات زمانہ کی رفتار کے مطابق ارتقاء پذیری کی حالت میں پیش کیا ہے۔

(ب) ڈاکٹر خالد مسعود اور علامہ اقبال کی اس فکر کو واضح کرتے نظر آتے ہیں کہ اسلامی دنیا میں اجتھاد کا ادارہ مضبوط اور مستحکم ہونا چاہیے اور یہ کہ دورِ حاضر میں اجتھاد کو انفرادی کے بجائے اجتماعی ہونا چاہیے اور جماع کے لیے پارلیمنٹ ہی سب سے بہترین جگہ ہے۔

(ج) علامہ اقبال نے کسی بھی جگہ مجتہدین کی بیان کردہ شرائط اجتھاد سے انحراف نہیں کیا، بلکہ انہوں نے اس مسئلے پر ضمنی طور پر بحث کی ہے، وہ اس طرح کہ انہوں نے پارلیمنٹ کے ذریعے ہونے والے اجتھاد کی خوبی یہ بیان کی ہے کہ وہاں دوسرے مضامین کے ماہرین بھی موجود ہوں گے، جس کی بنا پر جامع قسم کا اجتھاد وقوع میں آئے گا، جبکہ ڈاکٹر خالد مسعود کے نزدیک:

۳۳۔ ایضاً، تقی امینی مقالہ ''اجتہاد در برہان'' جنوری ۱۹۷۷ء، ص ۲۳۰

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۳۰، بحوالہ شیخ ابوزہرہ الاجتهاد فی الفقه الاسلامی۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۳۰، بحوالہ مصطفیٰ احمد الزرقاء، الاجتهاد فی مجال التشریع فی الاسلام۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۳۲-۲۳۳۔

اب مسائل کی نوعیت اتنی بدل گئی ہے اور علوم کی حدود اتنی وسیع ہوگئی ہیں کہ ان کے یہ اصول فقہ میں شرائط اجتھاد میں مذکور علوم اجتھاد کے لیے کافی نہیں رہے، آج اجتھاد کے لیے علوم اقتصادیات، نفسیات، طبیعیات غرض بہت سے علوم سے واقفیت اشد ضروری ہے اور ان شرائط کا پورا کرنا انفرادی اجتھاد کے بس کی بات نہیں...... آج کا اجتھاد محض عدالتی مجتھد اور عالم کی طاقت سے باہر ہے(۳۷)۔

اس طرح اصل اور اس کی شرح کے مابین فرق و امتیاز کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

۳۷۔ خالد مسعود، اقبال کا تصور اجتہاد، ص۲۳۲۔۲۳۳۔

باب پنجم

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے مؤیدین

اور

مخالفین کا نقطہ نگاہ

فصل اول:

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے مؤیدین کا نقطہ نگاہ

موقف ودلائل

فصل دوم:

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے مخالفین کا نقطہ نگاہ

موقف ودلائل

فصل سوم:

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے مؤیدین اور مخالفین کے دلائل کا تجزیہ وتقابل

فصل اول:

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے مؤیدین کا نقطۂ نگاہ

سابقہ باب میں پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے بارے میں جدید مفکرین، خصوصاً علامہ جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، علامہ اقبال، مولانا مودودی اور متجددین کے خیالات وافکار پر بحث کی گئی، جب کہ یہ باب پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے موافقین اور مخالفین کے افکار وخیالات کے جائزے اور ان کے تجزیے پر مشتمل ہے۔

جیسا کہ سابقہ باب میں تفصیل سے گفتگو ہوئی...... پارلیمنٹ کا ادارہ چند صدیاں قبل وجود میں آیا تھا۔(۱) اور اسلامی دنیا میں اس کا آغاز وارتقاء بیسویں صدی عیسوی میں شروع ہوا...... اور اس کے ساتھ ہی مسلمان ملکوں میں یہ بحث بھی چھڑ گئی کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

پھر چونکہ پارلیمنٹ کے حوالے سے ''ترکی'' کو تقدم کا شرف حاصل ہے، اس لیے باقی اسلامی دنیا میں ''ترکی'' کی مثال کو پیش نظر رکھا جاتا رہا...... اور اس کے بلاد اسلامیہ کی سیاست اور ان کے عمرانی نظریات پر بڑے اثرات مرتب ہوئے...... اسلامی دنیا میں سب سے پہلے اس مسئلے پر علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کھل کر اظہار خیال کیا۔ علامہ اقبال ترکی کے سیاسی اور مذہبی فکر کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابھی زیادہ دن نہیں گذرے...... جب ترکی فکر نے دو راستے اختیار کر رکھے تھے۔ ایک وہ جس کی نمائندگی حزب وطنی نے کی۔ دوسرا حزب اصلاح مذہبی کا راستہ۔ حزب وطنی کو دلچسپی تھی تو صرف ریاست سے، مذہب سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ریاست سے الگ مذہب کا کوئی وظیفہ نہیں...... ریاست ہی حیات قومی کا بنیادی جزو ہے اور اس لیے باقی سب اجزا کی نوعیت اور وظائف بھی ریاست ہی سے متعین ہوں گے، لہٰذا اس بارے میں کہ مذہب اور ریاست کے وظائف کیا ہیں۔ انہوں نے قدیم (شرعی یا اسلامی) نقطۂ نظر تسلیم نہیں کیا، بلکہ اس امر پر زور دیا کہ ریاست اور کلیسا (مذہب) کو ایک دوسرے سے الگ کر دینا ضروری ہے۔ اب جہاں تک ایک سیاسی مذہبی نظام کی حیثیت سے اسلام کی ترکیب کا تعلق ہے اس نظریے کو بھی شاید ایک حد تک جائز تسلیم کر لیا جائے۔ گو مجھے ذاتی طور پر اس سے اختلاف ہے کہ اسلام کی توجہ تمام تر ریاست پر ہے اور ریاست ہی کا خیال اس کے باقی تصورات پر حاوی ہے۔''(۲)

آگے چل کر علامہ اقبال ترکوں کے دوسرے نقطۂ نظر کے متعلق لکھتے ہیں:

''برعکس اس کے ''حزب اصلاح مذہبی'' نے جس کی زمام قیادت سعید حلیم پاشا کے ہاتھ میں تھی۔ اس بنیادی حقیقت پر زور دیا کہ اسلام میں عینیت اور اثباتیت دونوں کا امتزاج نہایت خوبی سے ہو چکا ہے۔ یوں بھی اس نے حریت ومساوات اور استحکام انسانیت کی ابدی صداقتوں کو چونکہ ایک وحدت میں سمو دیا، لہٰذا اس کا کوئی وطن نہیں...... سعید حلیم پاشا کو افسوس ہے کہ اسلام کے اخلاقی واجتماعی مقاصد بھی بعض ایسے توہمات کے زیر اثر ہیں، جو امم اسلامیہ کے اندر زمانہ قبل اسلام سے کام کر رہے تھے اور جو

---

۱) اقبال، علامہ، خطبات، اردو ترجمہ سید نذیر نیازی، ص ۲۳۶_۲۳۶

۲) ایضاً، ص ۲۰۱

غیر اسلامی شکل اختیار کرتے چلے گئے۔''(۳)

جس طرح علامہ اقبال نے ترکی کے متعلق دو جماعتوں اور دو طرح کے نظریات کا ذکر کیا ہے...... ''شومیٔ قسمت'' سے اسی طرح کے دو مکاتب ہمارے ہاں بھی موجود ہیں...... ایک سیکولر نظام حکومت کے حامیوں یا اس کے مؤیدین کا گروہ ہے...... جو ملک میں مکمل طور پر لادینی طرزِ سیاست اور اندازِ حکمرانی کا قائل ہے...... ان کے خیال میں آج کے دور میں ''ریاست اور کلیسا'' کو ایک ساتھ چلانا ممکن نہیں ہے...... دونوں کے راستے اور دونوں کی منزلیں ایک دوسرے سے مختلف اور ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ہمارے ہاں کی بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی سیاسی جماعتیں...... اسی نقطۂ نظر کا پرچار کر رہی ہیں۔ اس گروہ کے نزدیک پارلیمنٹ ایک مقتدر قومی ادارہ ہے۔ جدید جمہوری نظام میں یہ اس ملک کے تمام لوگوں کی نمائندہ اور ان کے حقوق کی محافظ ہے جس سے عوامی رائے کی بالادستی کا اظہار ہوتا ہے اور اگر کسی اور ادارے یا فرد کو اس سے بالاتر مقام دیا جائے، تو اس سے عوامی رائے کی نفی ہوگی۔ اور اسے ہر طرح کی قانون سازی کا حق حاصل ہے اور اس کے ذریعے حکومت منصوص احکام میں ردوبدل کر سکتی ہے۔ علامہ اقبال کے زیادہ تر شارحین کا بھی یہی نقطۂ نگاہ ہے۔

اس کے برخلاف تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ جس میں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ اور کچھ روشن خیال لوگ شامل ہیں، یہ کہتا ہے کہ اسلام نے سیاست، معیشت اور معاشرت میں جو حدیں مقرر کی ہیں، ان کو حالات اور ماحول کے تقاضے کے تحت بدلا اور توڑا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ سیاست، معیشت اور معاشرت کے مسائل میں ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے اس ارتقاء کا ساتھ دینا ضروری ہے ورنہ اسلامی ممالک، معاشی، معاشرتی اور سیاسی بدحالی میں مبتلا ہو جائیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ بات اسلامی دستور کی روح کے منافی ہے اور جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں معاشی بدحالی کے ساتھ اور دوسرے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان کو عقائد و عبادات کے علاوہ دوسرے مسائل میں دوسرے باشندگان ملک کے ساتھ پوری ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیے۔(۴)

ان لوگوں نے...... ''اجتہاد'' کا مفہوم ''احکام میں تبدیلی'' قرار دیا ہے۔ چنانچہ پاکستان میں ۱۹۵۵ء میں قائم شدہ عائلی کمیشن نے...... جو رپورٹ دی تھی۔ اس میں اجتہاد کی یہ تعریف کی گئی تھی:

''لفظ اجتہاد کے معنی کوشش کرنے کے ہیں اور اسلامی قانون کی اصطلاح میں اس کا مفہوم کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنے کا ہے۔''(۵)

ان لوگوں نے ''اجماع'' کی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جس طرح سائنس میں ہے اسی طرح قانون کی تاریخ میں بھی یہ بات ہے کہ بعض اوقات کسی خاص دور کے تمام مجتہدین کا کسی بات پر اجماع اس کی صحت اور صداقت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔''(۶)

دوسری طرف سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں، علماء اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک طبقے کا یہ کہنا ہے کہ کتاب و سنت کے تمام احکام ابدی اور لافانی ہیں۔ ان میں کسی ترمیم و اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ اسلامی دستور کے نفاذ کے معنی یہ ہیں کہ اسلام نے عقائد، عبادات

---

۳) دیکھیے مجیب اللہ ندوی، اجتہاد اور تبدیلی احکام، مطبوعہ دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور، ص ۱۱

۴) مجیب اللہ ندوی، ص ۱۱ر۱۲

۵) ایضاً، ص ۱۵، بحوالہ عائلی کمشن

۶) ایضاً، ص ۱۵۔۱۶

اوراخلاق کی طرح سیاست، معاشرت اور معاشیات کے سلسلے میں حلال اور حرام، جائز و ناجائز کی جو حدیں مقرر کی ہیں ان سے قدم باہر نہ نکالا جائے۔اس طبقے کے افراد کا خیال ہے کہ ''اجتہاد'' ہر کس و ناحق کے بس کی بات نہیں ہے۔اس کی کچھ شرائط اور قیود ہیں اور محض منتخب ہونے سے یا حاکمیت کی مسند پر مسلط ہو جانے سے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ ''احکام'' میں اپنی مرضی کا ردّ و بدل کر سکے،ان لوگوں کے خیال میں پارلیمنٹ کی بالادستی والا نظریہ شریعت اسلامیہ سے متصادم ہے۔

(ا) پارلیمنٹ کے حق اجتھاد کے مؤیدین کا موقف:

اس اجمال کی مزید تفصیل یہ ہے کہ جیسا کہ ہم پہلے باب میں یہ جائزہ لے چکے ہیں کہ پارلیمنٹ کا وجود جمہوریت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے کہ پارلیمنٹ کی موجودگی عوامی نمائندگی کی مظہر ہے، اسی لیے ملک کی بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی زیادہ تر سیاسی جماعتیں اسی نظریے کی حامی اور اسی کی مؤید ہیں کہ پارلیمنٹ ہر طرح کا قانون بنانے کا حق رکھتی ہے اور اس پر کسی پابندی کا مطلب ہے، عوامی رائے کا عدم احترام۔

ا۔ علامہ اقبالؒ کا موقف:

علامہ اقبالؒ کا نام بعض شرائط کے ساتھ اس جماعت میں سرفہرست طور پر شامل ہے۔

انہوں نے اس حوالے سے جو کچھ تحریر کیا......اس پر گزشتہ باب میں بحث ہو چکی ہے۔ یہاں......ان کی تمام باتوں کا اعادہ مقصود نہیں ہے، دراصل علامہ اقبال کے زمانے میں ایران اور ترکی کے سوا کوئی ایسی اسلامی مملکت نہیں تھی، جہاں پارلیمنٹ یا اس کے قائم مقام کوئی مجلس موجود ہوتی اور وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ اسلامی دنیا بڑی تیزی سے آزادی اور جمہوریت کی طرف بڑھ رہی ہے اور وہ دن دور نہیں جب پوری اسلامی دنیا میں آزادی کا سورج طلوع ہوگا اور چونکہ پارلیمنٹ ملک کی اکثریت کی نمائندہ ہوتی ہے اور جدید مغربی دنیا میں اُسے آزادانہ طور پر قانون سازی کا حق ہے۔اسی لیے انہوں نے پارلیمنٹ کو قانون سازی کا حق دیا ہے،......

ان کے خیالات کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

(۱) بلاد اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشو و نما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام ایک بڑا ترقی افزا قدم ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مذاہب اربعہ کے نمائندے جو سردست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں۔اپنا یہ حق مجالس تشریعی کو منتقل کر دیں گے۔یوں بھی مسلمان چونکہ متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، اس لیے ممکن بھی ہے تو اس وقت اجماع کی یہی شکل ہے۔(۷)

(۲) ایک مغربی نقاد نے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ کیا اجماع قرآن مجید کا بھی ناسخ ہے......مگر اسلامی فقہ میں اس قسم کی غلط بیانی کی تائید میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔میرے خیال میں مصنف کو لفظ نسخ سے غلط فہمی ہوئی ہے۔

(۳) موجودہ زمانے میں تو جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی قانون ساز مجلس قائم ہوگی تو اس کے ارکان زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے، جو فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے واقف ہیں، لہٰذا اس کام کا طریقہ کار کیا ہوگا۔کیونکہ اس قسم کی مجالس تعبیر شریعت میں بڑی بڑی شدید غلطیاں کر سکتی ہیں۔(۸)

(۴) ۱۹۰۶ء کے ایرانی دستور میں تو اس امر کی گنجائش رکھ لی گئی ہے کہ جہاں تک امور دینی کا تعلق ہے ایسے علماء کی جو معاملات

---

۷) خطبات، ص ۲۶۹

۸) ایضاً، ص ۲۶۹۔۲۷۰

دینوی سے بھی خوب واقف ہیں۔ایک الگ مجلس قائم کر دی جائے تا کہ وہ مجلس کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں...... یہ چیز بجائے خود خطرناک ہے......اور سنی ممالک اسے اختیار بھی کریں تو عارضی طور پر(۹)

(۵) انہیں چاہیے کہ مجالس قانون ساز میں علماء کو بطور ایک مؤثر جزو شامل کرلیں، لیکن علما بھی ہر امر قانونی میں آزادانہ بحث و تمحیص اور اظہار رائے کی اجازت دیتے ہوئے اس کی رہنمائی کریں۔(۱۰)

الغرض علامہ اقبالؒ نے ''مجالس قانون ساز'' کی رہنمائی کے لیے علماء کی کسی مجلس کی عبوری طور پر اجازت دی ہے، لیکن وہ مستقل طور پر ایسے انتظام کے حق میں تھے کہ خود مجالس قانون ساز (Parliaments) میں علماء کی مؤثر انداز میں شرکت بے حد ضروری ہے......تا کہ آزادانہ بحث و تمحیص کے ذریعے صرف استحقاق پر مسائل کا حل تلاش کیا جاسکے اور عوام کی منتخب شدہ پارلیمنٹ کو بالادستی حاصل ہو سکے۔

۲۔ علامہ اقبالؒ کے بعض شارحین کا نقطۂ نظر:

علامہ اقبالؒ نے تو پارلیمنٹ کے اجتہاد والی بات (۱۱) تمام احتیاطوں اور ضروری تدابیر کے ساتھ پیش کی ہے۔اس لیے کہ انہیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والی اسمبلیوں اور مجالس شوریٰ کا علمی پایہ کیا ہوگا۔اس لیے انہوں نے پارلیمنٹ کے ''حق اجتہاد'' کو عبوری دور کے لیے علماء کی کمیٹی اور پھر علماء کی پارلیمنٹ میں شرکت اور آخر میں پوری قوم کے لیے ''فقہ اسلامی'' کی لازمی تعلیم کے ساتھ مشروط کیا ہے۔جس کے متعلق ان کے بعض شارحین نے آخر میں ان کے اس موقف سے رجوع کا بھی ذکر کیا ہے۔(۱۲)

علامہ اقبال کے شارحین کے ہاں ہمیں واضح طور پر دو گروہ نظر آتے ہیں: ان میں سے بعض شارحین نے تو اس بارے میں کچھ حدود و قیود کا خیال رکھا ہے اور علامہ کے ان افکار کو ان کے اپنے الفاظ اور حقیقی تناظر میں ہی دیکھا ہے۔اس ضمن میں کچھ شارحین کا ذکر سابقہ ابواب میں آچکا ہے،اس ضمن میں معروف ماہر اقبالیات پروفیسر مرزا محمد منور کے افکار کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔پروفیسر صاحب ''علامہ اقبال اور اجتہاد'' پر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''جیسا کہ پہلے اشارہ ہوا حضرت علامہ نے دور معاصر کے تقاضوں کی روشنی میں اجماع کا حق ایک طرح سے ہر اسلامی ملک کی پارلیمنٹ کو دیا ہے، لیکن یہ اس خطرے سے بخوبی واقف تھے کہ عام مجالس قانون ساز کے رکن وہ بھی ہوں گے جو بالعموم فقہ کی نزاکتوں سے آگاہ نہ ہوں گے،اس کا علاج ایران نے ۱۹۰۶ء میں یہ کیا کہ ایک مجلس علماء کی بنیاد رکھی تا کہ وہ پارلیمنٹ کی قانون سازی پر نظر رکھے،مگر علامہ کو علماء کی اس مجلس سے بھی کھٹکا محسوس ہوتا ہے اور اس طریق کار کو بھی پُر خطر قرار دیتے ہیں، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ ایران کی مثال کو اگر سنی ممالک سامنے رکھیں تو بھی یہ زیادہ مدت کے لیے نہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ موقت بندوبست کے طور پر وہ کسی مجلسِ علماء کے خلاف نہیں، تاہم ایک دائمی ادارے کے طور پر اس کا قیام لازمی و لابد نہیں جانتے۔گمان یہ ہے کہ حضرت

---

(۹) ایضاً،ص ۱۷۰-۱۷۱

(۱۰) ایضاً،۱۷۱

(۱۱) خطبات،اقبال،ص ۱۷۱،۱۷۲

(۱۲) یوسف صلاح الدین، حافظ، مقالہ اجتماعی اجتہاد اور اجتماعی اجتہاد تصور،ارتقاء اور عملی صورتیں، مطبوعہ بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد (اسی نام سے ہونے والے ایک سیمینار کے مقالات کا مجموعہ) ص ۱۷۰-۱۷۷

علامہ علماء کو پارلیمنٹ کے خلاف فیصلہ کن ووٹ کی حیثیت نہیں دینا چاہتے، وہ پارلیمنٹ کی نگرانی یا رہنمائی بھی چاہتے ہیں مگر علماء کے ویٹو سے بھی محترز ہیں، ممکن ہے وہ علماء کی اکثریت کو فقہ میں اجتہاد کا قائل نہ جانتے ہوں، یہ بھی ممکن ہے وہ فقہاء کے نزاع باہم سے بھی گھبراتے ہوں، بہر حال علامہ کی وضع احتیاط کا تقاضا یہی ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح کا تناسب وتناسق چاہتے ہیں۔ کوئی عدم توازن انہیں گوارا نہیں...... تاہم جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ علامہ یہ تجویز فرماتے ہیں کہ مجلس قانون ساز میں علماء کو بطور ایک مؤثر جزو کے شامل کیا جائے اور علماء کو بھی تلقین کی ہے کہ وہ کھلے مباحثے کی مدد سے بھی اور تبادلہ آراء کی اجازت دے کر بھی حق رہنمائی ادا کریں۔''(۱۳)

آگے چل کر پروفیسر صاحب مزید لکھتے ہیں:

''حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پارلیمنٹ یا مجلس قانون ساز کو ایک طرح سے مجلس شوریٰ کی حیثیت حاصل ہے۔ جس میں علماء کی ایک تعداد بھی رکن ہو اور اگر وقتی طور پر علماء کی کوئی اعلیٰ مجلس ایسی بھی ہو جو باہر سے پارلیمنٹ کی فقہی کارروائیوں پر نگاہ رکھے تو تب بھی کوئی حرج نہیں، مگر واضح رہے کہ علامہ نے اس ضمن میں بہ تفصیل بات نہیں کی، انہوں نے (Broad Based) وسیع القواعد کے اصول بتا دیئے ہیں...... یہ امر کہ مجلس قانون ساز کے رکن کس اہلیت کے ہوں؟ علماء کے انتخاب کی صورت یا طریق کیا ہو؟ اور جو علماء پارلیمنٹ سے باہر پارلیمنٹ کے ناظر و نگران ہوں ان کا چناؤ کس طرح عمل میں آئے گا گویا یہ سب معاملات حقیقت واقعی کے ظہور پذیر ہونے کی ساعتوں کے امانت دار ہیں...... عملی دور شروع ہو تو علمی تشکیلی اور نفاذی عقدے رفتہ رفتہ حل ہونے لگتے ہیں......''(۱۴)

مولانا محمد تقی امینی بھی اجماع کے سلسلے میں ایک مجلس مشاورت کے قیام کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، مثلاً لکھتے ہیں:

''اجماع کی اصل اور ممکن العمل صورت یہی ہے کہ قانونی معاملات میں اہل حل وعقد کی ایک مجلس مشاورت قائم ہو، اور وہ حالات ومسائل میں غور وفکر کے بعد اس کا صحیح حل تجویز کرے، جو ایک طرف کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو اور دوسری طرف ضروریات زندگی سے ہم آہنگی پیدا کرنے والا اور دشواریوں پر قابو پانے والا ہو۔''(۱۵)

محمد تقی امینی نے ''مجلس مشاورت'' کا مشورہ تو دیا، مگر یہ واضح نہیں ہوتا کہ آیا مجلس مشاورت سے مراد پارلیمنٹ ہے یا مجلسِ قانون یا محض اہل حل وعقد کی ایک جمعیت جو مشورے پیش کرتی رہے، اسی طرح انہوں نے یہ بھی واضح نہیں کیا کہ اہلِ حل وعقد سے کیا مراد ہے؟ یہ لوگ کن اوصاف وکمالات کے مالک ہوں گے اور علم دین سے ان کی آگاہی کا درجہ کیا ہوگا۔ یہ جملہ مسائل تشنۂ تشریح ہیں۔''(۱۶)

لیکن جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے زمانے میں مسلمانوں کی مؤثر نمائندگی والی کوئی پارلیمنٹ خصوصاً ہندوستان میں موجود نہ تھی۔ اس لیے انہیں عملی طور پر اس امر کا اندازہ نہیں تھا کہ انہیں اس سلسلے میں کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ چنانچہ پروفیسر منور مرزا مرحوم لکھتے ہیں:

---

۱۳) محمد منور مرزا پروفیسر، اقبال اور اجتہاد، سہ ماہی منہاج، لاہور، جلد ا شمارہ ا، ربیع الاول ۱۴۰۳ھ جنوری ۱۹۸۳ء، ص ۵۱، بحوالہ تشکیل جدید، ص ۲۷۱

۱۴) ایضاً۔

۱۵) تقی امینی، مولانا، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، مطبوعہ لاہور، ص ۲۷

۱۶) ایضاً، ص ۵۲-۵۳

''حضرت علامہؒ ۱۹۳۸ء میں انتقال فرما گئے، ان کی وفات تک محض چند مسلم ممالک کو چھوڑ کر باقی سب مغربی استعمار کے پنجہ غلامی میں گرفتار تھے اور علامہ نے جو کچھ بھی لکھا عیاں ہے کہ وہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کی خاطر نہ تھا، بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے تھا، جنگ عظیم دوم کے بعد استعماری قوتیں ٹوٹ گئیں اور مسلم اوطان واقوام نے یکے بعد دیگرے آزادی کا سانس لینا شروع کیا، پاکستان بھی معرضِ وجود میں آ گیا (جس کے قیام کا تصور حضرت علامہ ہی نے دیا تھا، جس کے وجود میں آ جانے کا انہیں یقین تھا اور جس کے حصول کی خاطر انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کو اُمت کا خضرِ وقت قرار دیا اور یہ ذمہ داری سنبھالنے کے معاملے میں ان کو قائل کرنے کے لیے تادم آخر تلقین جاری رکھی اور پھر اسی راہِ جہاد میں انہوں نے اپنے آخری دو سال میں گونا گوں عوارض کے باوصف اپنے آپ کو قائداعظمؒ کا ایک سپاہی بنائے رکھا)۔ بہرحال مختلف مسلم ممالک واقوام کی آزادی کے بعد اجماع کے باب میں میدانِ عمل بہت وسیع ہو گیا۔ اہل نظر مسلمانوں نے محسوس کیا کہ اب مل بیٹھنے کے مواقع میسر آ سکتے ہیں چنانچہ ۱۹۴۹ء میں پاکستان میں مسلم ممالک کی پہلی اقتصادی کانفرنس منعقد ہوئی، پھر یہ سلسلہ جاری رہا، مسلم ممالک کے نمائندے کسی نہ کسی انداز میں اکٹھے ہوتے ہی رہتے ہیں، حتیٰ کہ جدہ میں عالم اسلام کا ایک مشترکہ سیکرٹریٹ بھی وجود میں آ چکا ہے، اب گنجائش ہے کہ اجماع کو ایک مشترک ''ندوہ'' میسر آ جائے جس میں پورے عالم اسلام کے چیدہ اہل نظر وفکر اور ارباب فقہ واصول کا اجتماع ہو جہاں وہ مل بیٹھیں اور مسائل پر اجتماعی آراء کا نچوڑ امت کی خدمت میں پیش کریں تاکہ امت کی فقہی نظر یکساں ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری امت کا رویہ عمل ہم آہنگ ہو سکے گا۔ پوری امت کا ہمدل و ہم فکر ہونا ممکن نظر آئے گا اور پھر جب ہم آئینی و دستوری معاملات میں خود اعتمادی پیدا کر لیں گے اور سعی وکوشش سے اس میدان میں بھی خود کفیل ہو جائیں گے تو پھر ہم مختلف ممالک سے لیے ہوئے دستوری قرضے بھی لوٹا دیں گے۔ مسلم امت اس وقت کہیں فرانسیسی قواعد کی مقروض ہے کہیں برطانوی قانون اور عدالت نظام کی، کہیں سوئٹزرلینڈ کے ضوابط مستعار لیے ہوئے ہیں اور کہیں اطالوی، ہسپانوی اور ولندیزی، انشاءاللہ دیگر قرضوں کی طرح ہم یہ قرض بھی اتار دیں گے۔(۱۷)

۳۔ ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کی تشریحات:

تاہم اس بارے میں...... ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ (۱۷-الف) نے جو تشریحات پیش کی ہیں وہ دینی حلقوں کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے خصوصی حلقوں میں ہمیشہ متنازعہ فیہ رہی ہیں انہوں نے اس موضوع پر بڑی تفصیلی اور مدلل بحث کی ہے، ان کی بحث انہی کے الفاظ میں پیش خدمت ہے:

(الف) تعبیر شریعت پارلیمنٹ کا اختیار:

اسلامی ریاست کی منتخب مقننہ کا بنیادی فریضہ ''تعبیر شریعت'' ہے۔ اس وقت یہی سب سے اہم مسئلہ قوم کو درپیش ہے کہ شریعت کی تعبیر کا اختیار کس کو حاصل ہے؟ کیا فقہی مسلکوں کے غیر منتخب افراد اس کا حق رکھتے ہیں یا تعبیر شریعت کا اختیار منتخب قومی اسمبلی کو حاصل ہے اور تعبیر شریعت کا نام اجتہاد ہے، آیئے اس سوال پر علامہ اقبالؒ کے افکار سے رہنمائی حاصل کریں۔ وہ فرماتے ہیں:

---

۱۷) محمد منور مرزا پروفیسر، اقبال اور اجتہاد، در منہاج، ص ۵۴

۱۷۔الف) ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ...... کافی عرصہ اوقاف کے زیر اہتمام ''علماء اکیڈمی'' اوقاف کے ڈائریکٹر ہے، ان کے زمانے میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے ترجمہ کے ساتھ تاریخ تصوف کی متنازعہ اشاعت پر ہونے والے احتجاجی مظاہروں کے بعد حکومت نے انہیں اوقاف کے دفتر (واقع مال روڈ) میں ''افسر بکار خاص'' (OSD) بنادیا، وہ اپنی ریٹائرمنٹ تک اسی عہدے پر فائز رہے، وہ چند کتب کے مؤلف بھی ہیں۔

''فقہی مسلکوں کے انفرادی نمائندوں سے اجتہاد کا اختیار ایک مسلم قانون ساز اسمبلی کو منتقل کر دیا جائے۔ محارب فرقوں کے پیدا ہو جانے کے پیش نظر عہد جدید میں یہی ایک صورت ممکن ہے جو اجماع اختیار کر سکتا ہے اور صرف اسی شکل میں عوام کی شرکت کو قانون سازی کے عمل میں یقینی بنایا جا سکتا ہے کیونکہ عوام معاملات میں گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہی ایک واحد فریضہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنے فقہی نظام میں خوابیدہ روح کو از سر نو فعال اور متحرک بنا کر اسے ارتقائی شکل دے سکتے ہیں۔'' (۱۸)

تعبیر شریعت کا اختیار پارلیمنٹ کو کیوں؟

اس کے بعد انہوں نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے بڑی مفصل بحث کی ہے اور لکھا ہے:

''علامہ اقبالؒ کا جواب نہایت واضح اور دوٹوک ہے۔ ان کے نزدیک اب وقت آ گیا ہے کہ فقہی مسلکوں کے غیر منتخب نمائندوں سے اختیار اجتہاد لے کر اسے قوم کی منتخب نمائندہ قانون ساز اسمبلی کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فرقے دور ملوکیت اور استعمار کی پیداوار ہیں اور اب جمہوریت کا دور ہے...... چوتھے خلیفۂ راشد کی وفات کے بعد عہد بنی امیہ اور عہد بنو عباس میں تعبیر شریعت کا اختیار امت سے فقہی مسلکوں اور فرقوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تعبیر شریعت کا اختیار فقہی مسلکوں کے افراد سے لے کر قوم کو منتقل کر دیا جائے جو اس کے اصل اور جائز حق دار ہیں۔'' (۱۹)

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ان اللّٰہ لایجمع امتی اوقال امة محمد ﷺ علی ضلالة (اللہ، میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا) (۲۰) تعبیر شریعت میں ایک فرد یا فرقہ یا طبقہ گمراہی اختیار کر سکتا ہے مگر یہ پوری قوم گمراہ نہیں ہو سکتی۔ ''ید اللہ علی الجماعة'' جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ (۲۱)

۲۔ اہلیت رکنیت

ڈاکٹر گورایا صاحب نے اجتہاد اور پارلیمنٹ کی رکنیت کی اہلیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تعبیر شریعت کی صلاحیت رکھنے والا، اچھی شہرت کا مالک، ہر بالغ مسلمان مرد و زن قانون ساز ادارے کی رکنیت کا اہل ہے۔ صلاحیت قرآن و سنت کی تعلیمات، جدید علوم و تجربات اور درپیش قومی اور بین الاقوامی مسائل و حالات کی مہارت پر مشتمل ہے۔ البتہ مالی ذرائع یا تفرقی حیثیت یا نسبی عصبیت یا علاقائی تعصّب کا استحصال کرنے والا اس کی رکنیت کا اہل نہیں، کیونکہ مال یا فرقے یا نسب یا علاقے کا استحصال قرآنی شرائط اخلاص اور تقویٰ کے منافی ہیں۔'' (۲۲)

۳۔ اجتہاد کا دروازہ بند ہونا محض افسانہ ہے:

اس عنوان کے تحت محمد یوسف گورایہ نے لکھا ہے:

''علامہ اقبال مسلسل اجتہاد کے قائل ہیں۔ وہ قاضی شوکانی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ اجتہاد آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں بھی ہوتا رہا ہے۔ اس سے تو یہ امر قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اجتہاد کسی دور میں بند نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اجتہاد کا

---

۱۸) ڈاکٹر یوسف گورایہ، اقبال اور اجتہاد، ص ۱۹

۱۹) ایضاً

۲۰) الترمذی، ابوعیسیٰ، الجامع السنن، کتاب الفتن ولزوم الجماعة، حدیث ۲۱۶۷

۲۱) اقبال اور اجتہاد، ص ۲۰

۲۲) ایضاً، ص ۲۱

دروازہ بند ہونے کا نظریہ محض افسانہ ہے۔

علامہ لکھتے ہیں:

"The Closing of the door of Ijtihad is pure fiction."(p.178)

''اجتہاد کا دروازہ بند ہونا محض افسانہ ہے۔'' (۲۳)

اس کے بعد انہوں نے علامہ اقبالؒ کے حوالے سے اس پر مزید بحث کی۔

۴۔ اب اجتہاد کے زیادہ مواقع موجود ہیں، ڈاکٹر گورایہ لکھتے ہیں:

علامہ نے تیسرے مفروضے کے جواب میں لکھا ہے کہ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد اور انتہائی نامعقول ہے کہ پہلے مجتہدین کو اجتہاد کی زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، موجودہ مجتہدین کو زیادہ مشکلات درپیش ہیں۔ انہوں نے اس افسانے کو بے ہودہ قرار دیا اور واضح کیا کہ دراصل موجودہ مجتہدین کو پہلوں کی نسبت زیادہ سہولتیں میسر ہیں، اس پر سرخسی کے حوالے سے علامہ نے یہ رائے دی ہے:

''اس افسانے کے حامی اگر یہ سمجھتے ہیں کہ متاخرین فقہاء کے راستے میں زیادہ مشکلات ہیں تو یہ انتہائی بے ہودہ بات ہے کیونکہ اسے سمجھنے کے لیے زیادہ عقل درکار نہیں کہ متاخرین فقہاء کے لیے متقدمین فقہاء کی نسبت اجتہاد کرنا زیادہ آسان ہے۔ درحقیقت قرآن کی تفاسیر اور سنت کی شروح کا ذخیرہ اس کثرت سے مدون اور عام ہو چکا ہے کہ آج کے مجتہدین کے پاس تعبیر شریعت کے لیے اس کی ضرورت سے زیادہ مواد موجود ہے۔'' (۲۴)

۴۔ علماء کی نامزد کونسل:

ڈاکٹر گورایا صاحب...... اپنے مؤقف کے حق میں اس قدر تعصب رکھتے ہیں کہ انہوں نے علامہ اقبالؒ کی تصریحات کو بھی مرضی کے معنی پہنائے ہیں۔ مثال کے طور پر علماء کی کونسل کے متعلق ڈاکٹر گورایا صاحب لکھتے ہیں:

''علامہ ہر حالت میں قانون ساز اسمبلی کی بالادستی کے قائل ہیں۔ وہ علماء کی کسی نامزد کونسل کو اسمبلی کی نگرانی پر برداشت نہیں کرتے۔ انہوں نے ۱۹۰۶ء کے ایرانی دستور میں علماء کی نگران کونسل کی شق پر سخت تنقید کے بعد اسے خطرناک انتظام "Dangorous arrangement"(p.175) قرار دیا۔ ان کی رائے میں علما بھی اسمبلی کا حصہ بنیں، اس کی آزادانہ قانونی بحثوں میں مدد اور رہنمائی کی خدمات انجام دیں، مگر وہ علما کو نامزدگی کے ذریعے اسمبلی کی نگرانی پر مسلط کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ (۲۵)

۵۔ کیا اسمبلی گزشتہ تعبیر شریعت کی پابند ہے؟

ڈاکٹر گورایا نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر پارلیمنٹ کو...... تمام سابقہ اجتہادات اور اجماعات پر بھی نظر ثانی کا حق دیا ہے۔ ایک جدید اسلامی ریاست کی مقننہ کے اختیارات کے ضمن میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ اسمبلی گزشتہ زمانوں میں کی ہوئی

---

۲۳) ایضاً، ص ۴۱

۲۴) ایضاً، ص ۴۴

۲۵) اقبال اور اجتہاد، ص ۲۵

شریعت کی تعبیر اور فقہاء کے اجتہادات کی پابند ہے؟ اس مسئلے پر علامہ کا اجتہاد یہ ہے کہ موجودہ اسمبلی اس کی پابند نہیں، کیونکہ جیسے بیان ہو چکا ہے گزشتہ دور کی فقہ کے خود بانیوں کو اپنے اجتہادات اور تعبیرات کے حرف آخر ہونے کا دعویٰ نہ تھا۔

علامہ کی رائے میں گزشتہ فقہی افکار فرسودہ ہو چکے ہیں اور کسی قوم کے فرسودہ افکار اس کے احیاء وتجدید کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ انہوں نے اپنے اس نظریے کی تائید میں یہ رائے پیش کی ہے:

The wordict of history is that worn-out Ideas have never rison to power among a people who have worn them out."(p.15)

''تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ جن فرسودہ نظریات کو خود کسی قوم نے ایک دفعہ فرسودہ قرار دے دیا ہے۔ وہ اس قوم میں دوبارہ کبھی قوت حاصل نہیں کر سکتے۔''(۲۶)

۸۔ کیا اسمبلی صحابہ کے فیصلے کی پابند ہے؟

اس عنوان کے تحت گورایا صاحب نے لکھا ہے:

''جدید اسلامی ریاست کی مقننہ کے اختیارات اجتہاد اور تعبیر نو کی بحث میں علامہ نے ایک نہایت حساس سوال اٹھایا ہے اور وہ یہ کہ کیا بعد کے مسلمان صحابہ کے کسی اجماعی فیصلے کے پابند ہیں؟''

''میری رائے میں یہ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں امر واقعی سے متعلق فیصلے اور امر قانونی سے متعلق فیصلے میں تمیز کی جائے۔''

علامہ اس اصول کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

''اول الذکر معاملے (امر واقعی) میں مثلاً جب یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کیا ''معوذتین'' نام کی دو چھوٹی سورتیں قرآن کا حصہ ہیں یا نہیں اور صحابہ نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ وہ قرآن کا حصہ ہیں تو ہم ان کے فیصلے کے پابند ہیں۔ بدیہی طور پر، کیونکہ اس معاملے میں صرف صحابہ اس حیثیت میں تھے کہ انہیں اس کا علم ہوتا۔''

اس کے بعد علامہ دوسرے معاملے ''امر قانونی'' کے بارے میں اپنا اصول اس طرح بیان کرتے ہیں:

''مؤخر الذکر معاملے (امر قانونی) کی صورت میں یہ مسئلہ محض تعبیر اور اجتہاد کا ہے، لہٰذا میں کرخی کی سند پر یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ بعد کے مسلمان، صحابہ کے فیصلے کے پابند نہیں۔ کرخی کا قول ہے کہ صحابہ کی سنت ان معاملات میں لازم ہے جن میں قیاس سے کام نہیں لیا جا سکتا، مگر جن معاملات میں قیاس سے کام لیا جا سکتا ہے ان کی پابندی لازم نہیں۔''(۲۷)

اسی طرح گورایا صاحب نے پارلیمنٹ کو صحابہ کرامؓ کے قانونی امور میں کیے گئے اجتہادات کو منسوخ کرنے کا بھی حق دیا ہے۔

۸۔ کیا اسمبلی اجتہاد مطلق کا اختیار رکھتی ہے؟

بعد ازاں گورایا صاحب نے اسمبلی کو ''اجتہاد مطلق'' کا حق دیتے ہوئے مزید لکھا ہے:

---

۲۶) ایضاً، ص ۲۵-۲۶

۲۷) ایضاً، ص ۲۷-۲۸

''علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے کہ میں اس خطبے میں صرف اجتہاد کے درجہ اول کو زیر بحث لاؤں گا یعنی قانون سازی میں اجتہاد مطلق کے اختیارات سے۔'' فقہ میں اجتہاد مطلق درجہ اول کا اجتہاد ہے اور جو شخص یہ اجتہاد کرے وہ مجتہد مطلق کہلاتا ہے۔ جو اجتہاد کے اصول اور اس کے قواعد وضوابط خود وضع کرتا ہے۔ وہ دوسروں کے اصول وقواعد کا پابند نہیں ہوتا۔ جو دوسروں کے اصولوں کی پابندی کرے وہ مجتہد منتسب ہوتا ہے۔ وہ دوسرے درجے کا مجتہد کہلاتا ہے، اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ جس امام کو اس نے مجتہد مطلق تسلیم کیا ہو، اس کے اصولوں کی پابندی میں اجتہاد کرے۔''

علامہ اقبال اجتہاد کے درجہ اول "First degree of Ijtihad" اجتہاد مطلق "Complete authority in Legislation" کے داعی ہیں۔ وہ خود مجتہد مطلق ہیں۔ ان دو اصطلاحوں کا استعمال وہ اپنے قلم سے خود کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اجتہاد کے اصول خود وضع کیے ہیں اور انہیں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے مآخذ شریعت: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس پر جو بحث کی ہے وہ نہایت بصیرت افروز ہے۔ جس سے ان کے اجتہاد کے وضع کردہ قواعد وضوابط واضح ہوتے ہیں۔ وہ انفرادی اجتہاد کے بھی قائل ہیں تاکہ جید علماء اور اصحاب فکر ونظر اپنے انفرادی اجتہادات سے قوم کے منتخب نمائندوں کی رہنمائی کریں۔ مگر ان کے نزدیک عہد حاضر میں ملکی قوانین کی تقنین اور تشکیل کے لیے اجتماعی اجتہاد وتعبیر نو قانون ساز اسمبلی کا اختیار ہے۔ لہٰذا ان کے رہنما اصولوں اور قواعد وضوابط کے مطابق معرضِ وجود میں آنے والا قانون ساز ادارہ اجتہاد مطلق کا اختیار رکھتا ہے۔'' (۲۸)

حالانکہ علامہ اقبالؒ نے اپنے پورے خطبے میں ایک لفظ بھی اس بارے میں نہیں لکھا کہ اسمبلی کو اجتہاد مطلق کا حق حاصل ہے یا خود علامہ اقبالؒ مجتہد مطلق ہیں...... مگر گورایا صاحب نے علامہ اقبالؒ کے خطبے کے آغاز میں آنے والے محض ایک لفظ سے ایسے اجتہاد کا مفہوم اخذ کیا ہے، جس کا اختیار صرف بانیان مذاہب کو حاصل رہا ہے اور جس کے متعلق...... خود علامہ اقبالؒ نے یا ان کے کسی شارح نے ان کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا۔

۲۔ مولانا امین احسن اصلاحی اور ان کا مکتب فکر:

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے مؤیدین میں مولانا امین احسن اصلاحی (۲۹) اور ان کا مکتب فکر بھی کسی حد تک شامل ہے۔

مولانا امین اصلاحی کا مکتب فکر خود کو مولانا حمید الدین فراہی کی طرف منسوب کرتا ہے جن کا تعلق مولانا شبلی نعمانی کے رفقا سے تھا...... اور جنہیں اپنی آزاد خیالی کے باعث علماء کی طرف سے ہدف تنقید بھی بنایا گیا۔

مولانا نے اپنی کتاب ''جدید اسلامی ریاست میں قانون سازی اور مسائل'' میں اس مسئلے پر مختلف پہلوؤں سے اظہار کیا ہے۔ اور اجتہاد کی اہلیت کے بغیر...... اجتہاد کرنے کی اجازت نہیں دی اور اس کے لیے انہوں نے کئی شرائط کا ذکر کیا

---

۲۸) ایضاً، ص ۲۸-۲۹

۲۹) مولانا امین احسن اصلاحی ۱۹۰۴ء میں یو-پی (بھارت) کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے ہی گاؤں میں حاصل کی۔ دس برس کی عمر میں دینی اور عصری تعلیم کے حصول کے لیے مدرسۃ الاصلاح میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۲ء میں اسی مدرسہ سے فراغت پائی...... یہاں انہیں مولانا حمید الدین فراہی کی شاگردی کا بھی موقع ملا اور انہوں نے قرآن فہمی کی خصوصی تعلیم انہی سے حاصل کی۔ (محمد رفیع مفتی، مقدمہ، جدید اسلامی ریاست میں قانون سازی اور مسائل، مطبوعہ دار التذکیر، ص ۵) مولانا اصلاحی کا سب سے اہم کام تدبر قرآن کی ترتیب وتدوین ہے جسے شروع سے ہی علماء کی طرف سے شدید تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔

ہے۔(۳۰) تاہم انہوں نے ''مجلس شوریٰ'' کے انتخاب اور اس کی رکنیت کے لیے انتخابات کو بنیاد بنانے کی اصولی طور پر منظوری دی ہے...... مولانا مجلس شوریٰ کی تشکیل کے تحت جسے ان کے بقول اجتہاد کرنے یا قانونی فیصلے کے لیے...... عہد عمر کی مجلس شوریٰ کا قائم مقام کہا جاسکتا ہے، لکھتے ہیں:

''اب دوسرا سوال ان ارباب حل وعقد کے متعلق یہ ہے کہ وہ کیسے چنے جائیں گے اور ان کو کون چنے گا۔ سرسری مطالعے کی بنا پر لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ اسلام میں سرے سے مشورہ کا کوئی قاعدہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ بات بالکل خلیفہ وقت کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ جس سے چاہے مشورہ لے، لیکن یہ گمان دراصل اس زمانے کی باتوں کو اس زمانے کے ماحول میں رکھ کر دیکھنے سے پیدا ہوا ہے، حالانکہ ان کو اسی وقت کے ماحول میں رکھ کر دیکھنا چاہیے اور عملی تفصیلات کے اندر وہ اصول سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے جو ان میں ملحوظ رکھے گئے تھے۔''(۳۱)

مولانا کا موقف ہے کہ اسلام مکہ معظمہ میں ایک تحریک کی حیثیت سے اٹھا تھا۔ تحریکوں کے مزاج کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ جو لوگ سب سے پہلے آگے بڑھ کر ان کو لبیک کہتے ہیں وہی لیڈر کے رفیق، دست و بازو اور مشیر ہوا کرتے ہیں، چنانچہ اسلام میں بھی جو سابقین اولین تھے وہ بالکل ایک فطری طریقے پر نبی اکرم ﷺ کے رفیق اور مشیر قرار پائے، جن سے آپ ہر ایسے معاملے میں مشورہ کرتے تھے جس میں خدا کی طرف سے کوئی صریح حکم آیا ہوا نہ ہوتا تھا۔ پھر جب اس تحریک میں نئے نئے آدمیوں کا اضافہ ہونے لگا اور مخالف طاقتوں سے اس کی کشمکش بڑھتی گئی تو ایسے لوگ خود بخود نمایاں ہوتے چلے گئے جو اپنی خدمات، قربانیوں اور بصیرت و فراست کی بنا پر جماعت میں ممتاز تھے۔ ان کا انتخاب ووٹوں سے نہیں، بلکہ تجربات اور آزمائشوں سے ہوا تھا جو الیکشن کی بہ نسبت زیادہ صحیح اور فطری طریق انتخاب ہے۔ اس طرح مکہ چھوڑنے سے پہلے ہی دو قسم کے لوگ نبی اکرم ﷺ کی مجلس شوریٰ کے رکن بن چکے تھے۔ ایک سابقین اولین، دوسرے وہ آزمودہ کار اصحاب جو بعد میں جماعت کے اندر نمایاں ہوئے۔ یہ دونوں گروہ ایسے تھے جن کو نبی اکرم ﷺ کی طرح تمام مسلمانوں کا اعتماد بھی حاصل تھا۔

پھر مدنی معاشرے میں دو قسم کے لوگ اور ابھرنے شروع ہوئے۔ ایک وہ جنہوں نے آٹھ دس برس کی سیاسی، فوجی اور تبلیغی مہمات میں کارہائے نمایاں انجام دیے، حتیٰ ہر اہم معاملے میں انہی کی طرف لوگوں کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ دوسرے وہ لوگ جنہوں نے قرآن مجید کے علم و فہم اور دین میں فقاہت کے اعتبار سے ناموری حاصل کی حتیٰ کہ عوام نبی کریم ﷺ کے بعد علم دین میں انہی کو سب سے زیادہ معتبر سمجھنے لگے اور خود آنحضور ﷺ نے بھی یہ فرما کر ان کو سند اعتبار عطا کی کہ قرآن فلاں شخص سے سیکھو اور فلاں نوعیت کے مسائل میں فلاں شخص کی طرف رجوع کرو۔ یہ دونوں عناصر بھی مجلس شوریٰ میں بالکل ایک فطری انتخاب سے شامل ہوتے چلے گئے اور ان میں بھی کسی کے لیے ووٹ لینے کی حاجت پیش نہ آئی۔ ووٹ اگر لیے بھی جاتے تو اس معاشرے میں ان کے سوا کوئی ایسا نہ تھا جس پر مسلمانوں کی نگاہِ انتخاب پڑتی۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کے زمانے میں وہ مجلس شوریٰ بن چکی تھی جو بعد کو خلفائے راشدین کی مشیر قرار پائی اور وہ دستوری روایات بھی مستحکم ہو چکی تھیں جن کے مطابق آگے چل کر ایسے نئے لوگ اس مجلس میں شامل ہوتے گئے۔ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد چند اصحاب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہو کر خلافت قبول کرنے کی درخواست کی تو آپ

---

۳۰) جدید اسلامی ریاست میں قانون سازی اور مسائل، ترتیب محمد رفیع مفتی، مطبوعہ دار التذکیر، تاریخ، ص ۶

۳۱) الامامة والسیاسة لابن قتیبہ، مطبعة الفتوح، مصر، ص ۴۱

نے فرمایا:

’’یہ معاملہ تمہارے فیصلے کرنے کا نہیں ہے۔ یہ تو اہل شوریٰ اور اہل بدر کا کام ہے۔ جس کو اہل شوریٰ اور اہل بدر پسند کریں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ اور اس معاملے پر غور کریں گے۔‘‘

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل الحل والعقد اس وقت کچھ متعین لوگ تھے جو پہلے سے اس پوزیشن پر فائز چلے آرہے تھے اور وہی ملت کے اہم معاملات کا فیصلہ کرنے کے مجاز تھے۔ لہٰذا یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ خلیفہ وقت من مانے طریقے پر جس وقت جس کو چاہتا تھا مشورے کے لیے بلا لیتا تھا اور کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ مستقل اہل شوریٰ یا اہل حل وعقد کون ہیں۔

خلافت راشدہ کے اس تعامل، بلکہ خود اسوۂ نبی سے جو قاعدۂ کلیہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ امیر کو مشورہ ہر کس وناکس سے یا اپنی مرضی کے چنے ہوئے لوگوں سے نہیں، بلکہ ان لوگوں سے کرنا چاہیے جو عامۂ مسلمین کے معتمد ہوں۔

رہا یہ سوال کہ عوام کے معتمد لوگ کیسے معلوم کیے جائیں تو ظاہر ہے کہ اس چیز کے معلوم ہونے کی جو صورت آغاز اسلام کے مخصوص حالات میں تھی آج وہ صورت نہیں ہے اور اس زمانے کے تمدنی حالات میں جو موانع موجود تھے وہ بھی آج موجود نہیں ہیں۔ اس لیے ہم آج کے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے وہ تمام ممکن اور مباح طریقے اختیار کر سکتے ہیں، جن سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ جمہور قوم کا اعتماد کن لوگوں کو حاصل ہے۔ آج کل کے انتخابات بھی اس کے جائز طریقوں میں سے ایک ہیں۔ بشرطیکہ ان میں وہ ذلیل ہتھکنڈے استعمال نہ ہوں، جنہوں نے جمہوریت کو ایک مذاق بنا کر رکھ دیا ہے۔ (۳۲)

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا اصلاحی، جس جدیدیت کے علمبردار تھے، اور جس کے تحت انہوں نے قرآن حکیم کی اپنی تفسیر میں فنی فقہی مسائل ومعاملات کے متعلق قدیم علماء کے موقف ومسلک پر کھل کر تنقید کی ہے، جس میں طلاق ثلاثہ اور رجم کے مسائل شامل ہیں، اس کی بنا پر وہ اور ان کا مکتب فکر پارلیمنٹ کے ذریعے جدید اجتہاد کے مخالف نہ تھے، اگرچہ اس حوالے سے انہوں نے کسی جگہ کھل کر اظہار نہیں کیا۔

۳- علامہ جاوید احمد غامدی کا مؤقف ومسلک:

مولانا اصلاحی کے بعض شاگردوں نے یا ایسے لوگوں نے جو خود کو ان کی طرف منسوب کرتے ہیں..... بعض بنیادی باتوں میں دوسرے لوگوں سے الگ راہ اختیار کی ہے، جس سے پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے موقف کو تقویت پہنچتی ہے۔ جو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتی ہے۔ جن میں سے علامہ جاوید احمد غامدی کا نام بطور مثال لیا جا سکتا ہے۔ علامہ جاوید احمد غامدی بہت سی باتوں میں جمہور علماء سے مخالف رائے رکھتے ہیں، جن میں ’’سنت‘‘ اور شریعت کے بارے میں ان کا موقف خصوصاً تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

ایک وہ امور جن میں شریعت کی طرف سے قانون سازی موجود ہے اور دوسرے وہ امور جن میں شریعت خاموش ہے، پہلی نوعیت کے امور میں ہم شریعت پر غور وتدبر کر کے اس کا مدعا اور منشا کو متعین کرتے ہیں اور دوسری نوعیت کے امور میں ہم شریعت کے منشا تک پہنچنے کے لیے اجتہاد کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ (۳۳)

---

۳۲) مجلس شوریٰ کی تشکیل سے متعلق یہ ساری عبارت ’’اسلامی دستور کی تدوین‘‘ از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے نقل کی ہے۔ ’’جدید اسلامی ریاست‘‘ ص ۱۳۲-۱۳۷

۳۳) ایضاً، ص ۲۴-۲۶۔

۳(۳) اجتہاد کا مفہوم

اجتہاد کا لغوی مفہوم کسی کام کو پوری سعی و جہد کے ساتھ انجام دینا ہے۔ اس کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ جس معاملے میں قرآن وسنت خاموش ہیں، اس میں نہایت غور وخوض کر کے دین کے منشا کو پانے کی جدوجہد کی جائے۔ یہ اصطلاح جس ماخذ سے وجود پذیر ہوئی ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ایک روایت ہے۔ اس روایت کے الفاظ ''اجتھد برائی'' سے ''اجتہاد'' کا لفظ ہمارے ہاں فقہ و قانون میں بطور اصطلاح استعمال ہونے لگا ہے۔

اس اصطلاح کو اگر مذکورہ روایت کی روشنی میں سمجھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اجتہاد سے مراد اپنی عقل و بصیرت سے ان امور کے بارے میں رائے قائم کرنا ہے، جن میں قرآن وسنت خاموش ہیں یا انہوں نے کوئی متعین ضابطہ بیان نہیں کیا۔

یہاں یہ واضح رہے کہ مذکورہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ اس کے مضمون سے، البتہ یہ تاثر ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی کوئی بات ضرور ارشاد فرمائی ہوگی۔ (۳۴)

۳ (۴): اجتہاد کا طریق کار:

اگر کسی معاملے میں شریعت نے قانون سازی نہیں کی تو اس معاملے میں اجتہاد کے لیے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ اس سے ملتے جلتے کسی دوسرے معاملے میں کوئی قانون موجود ہے۔ اگر کوئی قانون موجود ہے تو اس پر قیاس کر کے قانون وضع کر لیا جائے گا۔ اگر کسی مشابہ معاملے میں قانون موجود نہیں ہے تو پھر یہ معلوم کیا جائے گا کہ شریعت میں کیا کوئی ایسا اصول موجود ہے، جس سے اس معاملے کے ضمن میں رہنمائی مل سکے۔ اگر کوئی اصولی ہدایت موجود ہے تو اس سے استنباط کر کے قانون بنا لیا جائے گا۔ اگر کوئی مشابہ معاملہ بھی موجود نہ ہو اور نہ اصولی ہدایت میسر ہو تو اپنی عقل سے کوئی رائے قائم کر کے اس کے مطابق قانون سازی کر لی جائے گی، مگر اس موقع پر اس بات کا ہر حال میں لحاظ رکھا جائے گا کہ کوئی بات شریعت کے منشا کے خلاف یا اس کے حدود سے متجاوز نہ ہو۔

اجتہاد کا دائرۂ کار

مندرجہ بالا روایت کی روشنی میں اجتہاد کے دائرۂ کار کو حسب ذیل نکات کی صورت میں متعین کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اجتہاد کا تعلق انہی معاملات سے ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے دین و شریعت سے متعلق ہیں۔

۲۔ انسانوں کو انفرادی یا اجتماعی حوالے سے جب بھی قانون سازی کی ضرورت پیش آئے تو انہیں چاہیے کہ وہ سب سے پہلے قرآن وسنت سے رجوع کریں۔

۳۔ جن معاملات میں قرآن وسنت کی رہنمائی موجود ہے، ان میں قرآن وسنت کی پیروی لازم ہے۔

۴۔ جن معاملات میں قرآن وسنت خاموش ہیں، ان میں انسانوں کو چاہیے کہ اپنی عقل و بصیرت کو استعمال کرتے ہوئے آرا قائم کریں۔

ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد کی ہدایت فرماتے ہوئے یا کسی دوسرے موقع پر، اس نوعیت کی شرائط کو متعین نہیں فرمایا۔ چنانچہ دین کے جس معاملے میں آپ نے تحدید نہیں فرمائی، اس میں بغیر کسی ضرورت کے ہمیں کوئی حد بندی نہیں کرنی چاہیے۔

---

۳۴) ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۰۱، ص ۲۷-۲۸۔

دوسرے یہ کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرائط کی بحث بالکل بے معنی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی اجتہادی رائے کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ علم وتقویٰ کی بنیاد پر نہیں، بلکہ دلیل واستدلال کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ دلیل اگر قوی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بعض مفروضہ شرائط کے پورا نہ ہونے کی بنا پر کسی اجتہاد کو رد کر دیا جائے اور اگر دلیل کمزور ہے تو اجتہاد خواہ کیسی ہی جامع الشرائط شخصیت نے کیا ہو، اسے بہر حال ناقابل قبول قرار پانا چاہیے۔

تیسرے یہ کہ یہ عین ممکن ہے کہ کسی معاملے میں متعلقہ شعبے کے ماہر کی رائے مذکور شرائط پر پورا اترنے والے کی رائے سے زیادہ وقیع ہو۔ مثال کے طور پر یہ ہوسکتا ہے کہ طب کے کسی معاملے میں ایک ڈاکٹر کا اجتہاد عربی زبان وادب کے کسی فاضل کے اجتہاد کے مقابلے میں زیادہ قرینِ حقیقت ہو۔ اسی طرح شریعت میں سود کی تعریف متعین ہو جانے کے بعد اس کے اطلاق کے معاملے میں کسی ماہرِ معیشت کی رائے کسی عالمِ دین کی رائے سے زیادہ صائب ہوسکتی ہے۔

اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اجتہاد کے لیے کسی طرح کی کوئی قدغن نہیں ہے۔ یہ دروازہ ہر مسلمان کے لیے اس کی انفرادی یا اجتماعی حیثیت میں پوری طرح کھلا ہے۔

ماضی کے اجتہادی کام کی حیثیت

قانون وشریعت کے دائرے میں ہمارے جلیل القدر ائمہ نے بہت وقیع کام کیا ہے۔ انہوں نے اپنے فہم کے مطابق، شریعت کے مفہوم ومدعا کی تعیین، اس کی شرح ووضاحت اور مختلف معاملات پر اس کے اطلاق کا کام بھی کیا ہے اور فقہی معاملات میں اپنے حالات کے تقاضوں کے لحاظ سے اجتہادات بھی کیے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اگر کوئی شخص اجتہادی کام کرنا چاہے تو وہ ان کے کام سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ لیکن، بہر حال یہ انسانی کام ہے۔ انسانی کام، ظاہر ہے کہ غلطی کے امکان اور اختلافِ رائے سے مبرا نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا، ان کی آرا سے اتفاق بھی ہوسکتا ہے اور اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی تاریخ ان علمی اختلافات سے بھری پڑی ہے جو بعد میں آنے والوں نے ان کی آرا کے بارے میں کیے ہیں۔ ہمارے جید علما نے دین وشریعت کے معاملے میں بھی اور فقہ واجتہاد کے معاملے میں بھی اس علمی کام میں کوئی انقطاع نہیں آنے دیا۔ (۳۵)

اس حوالے سے غامدی صاحب کے ایک شاگرد طالب محسن نے اجتہاد پر ایک خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

اصل میں اجتہاد کی دو نوعیتیں ہیں، ایک اجتہاد مملکت میں رائج نظام کے امور سے متعلق ہے اور دوسرے کا تعلق روزمرہ کی زندگی میں دین پر عمل کرنے کے انفرادی معاملات سے ہے۔ یہ دوسرا اجتہاد ہر آدمی کو کرنا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دین کا عالم یہ اجتہاد براہ راست مطالعے کی بنیاد پر کرتا ہے اور عام آدمی اپنی معلومات اور علما کے دلائل سن کر اس دائرے میں لوگوں کی آرا اگر مختلف ہوں اور وہ ان پر عمل کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہر آدمی اور گروہ اس معاملے میں وسعت قلبی کا مظاہرہ کرے۔ دوسرے کے اختلاف کو دین وایمان کا مسئلہ نہ بنائے اور تفرقہ بازی یعنی صرف اپنے آپ کو حق پر سمجھنا اور دوسرے کو زبردستی اپنا ہم نوا بنانا یا اسے اپنی مرضی سے زندگی نہ گزارنے دینا، ان رویوں سے گریز کرے۔

دوسرے دائرے کا اجتہاد ریاست کی سطح پر ہوگا۔ حکومت کی پارلیمنٹ یا اس کا تشکیل کردہ کوئی ادارہ یہ کام انجام دے گا۔ پارلیمنٹ اسے قانون کی صورت دے گی اور یہ ملک میں نافذ ہو جائے گا۔ ملک کے تمام لوگ اس قانون کی پابندی کریں گے۔

---

۳۵) ایضاً، ص ۲۸-۳۲۔

جنھیں اس قانون سے اختلاف ہو وہ جمہوری طریقوں سے اس قانون کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں لیکن جب تک قانون نافذ ہے وہ بھی اس کی پابندی کریں۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ ان اجتہادی امور میں کسی رائے کا نفاذ اور اس سے اختلاف حق و باطل کا معاملہ نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی معلوم رہنی چاہیے کہ حکومت کی قانون سازی کا دائرہ سارے دین سے متعلق نہیں ہے۔ وہ صرف انہی معاملات میں اجتہاد کرے گی جو اسلام کے اجتماعی امور کے نفاذ سے متعلق ہیں اس معاملے میں مختلف پارلیمان مختلف آرا قائم کر سکتی ہیں۔(۳۶)

ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کا موقف:

ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کے صاحبزادے......ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کا بھی یہی موقف ہے کہ منتخب پارلیمنٹ ہی......اجتہاد کرنے کی اہل ہے......لیکن موجودہ پارلیمنٹ اس کی اہل نہیں ہے، ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال نے عصر حاضر میں اجتہاد پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک مضمون میں تحریر کیا ہے:

علامہ اقبال نے اجتہاد کے بارے میں ایک کتاب Reconstruction Lecturers کے نام سے لکھی ہے، جس کے بارے میں بڑے بڑے علماء حضرات نے کہا کہ یہ کتاب نہیں لکھی جانی چاہیے تھی۔ علامہ کہتے تھے کہ اجتہاد انفرادی مجتہدین کے بجائے، پارلیمنٹ کرے، اس طرح اجتہاد عدلیہ اور پارلیمنٹ دونوں طرف سے ہو سکتا ہے، جیسے ایران میں انہوں نے ولایت فقیہ (ایوان بالا) بنائی ہے اور تمام قانون اس پارلیمنٹ کی مرضی سے پاس ہوتے ہیں، لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ اراکین پارلیمنٹ کو قانون سازی کے ساتھ ساتھ اسلامی فقہ کا بھی مکمل علم اس کے علاوہ متعلقہ ماہرین کو ضرور اس میں شامل کیا جائے، کیوں کہ ہمارے علماء، دنیاوی علوم کی مکمل وسعت سے واقف نہیں۔ قانون سازی کی تعلیم دینے والے اداروں میں اسلامی فقہ کو اس کا لازمی حصہ بنایا جائے اور comparative jurisprodence کا ایک موضوع شامل کیا جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے چوری کی سزا (ہاتھ کاٹنے کی) قحط پڑنے پر معطل کر دی تھی، حالانکہ اس کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (صحیح قرآن حکیم) کا واضح حکم موجود تھا۔ میں کہتا ہوں کہ جب ملک میں عوام کو بنیادی ضروریات زندگی ہی میسر نہیں، تو سزائیں کیسے لاگو ہو سکتی ہیں اسلامی قانون بھی یہ کہتا ہے۔ بعض حالات میں قرآن پاک میں مقرر کیے گئے وراثت کے حصص میں رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر میں چاہتا ہوں کہ میری جائیداد ساری کی ساری میری بیٹی کو ملے، تو میں کیوں ایسا نہیں کر سکتا۔ بیٹی یا بہن سارا گھر چلاتی ہے، لیکن جائیداد کی تقسیم کے وقت اُسے آدھا حصہ ملتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن، حدیث یا اسلامی فقہ میں جو وراثت کے قوانین ہیں۔ کیا ان میں ردّ و بدل ہو سکتا ہے، پچھلے دنوں ہماری عدالت نے فیصلہ دیا ہے(۳۷) کہ مسلم شادی کے لیے تحریر، گواہ اور نکاح خواں کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایجاب و قبول کرنے سے شادی ہو جاتی ہے......میرا موقف یہ ہے کہ ایک نئی فقہ پارلیمنٹ کے ذریعے بنائی جائے، جس میں امامیہ حنفی مالکی وغیرہ سب مکاتب فکر شامل ہوں، جس میں سے ہر کوئی اپنی پسند کے مطابق اپنے مسئلے کا حل نکال لے۔

---

۳۶) ماہنامہ اشراق بابت دسمبر ۱۹۹۹ء، ص ۵۷۔

۳۷) یہ فیصلہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی بیوی ڈاکٹر ناصرہ اقبال نے دیا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا جدید اجتہاد ہے، جو قرآن کریم اور سنت نبویہ سے متصادم ہے۔

اجتہاد کرتے وقت اگر متعلقہ ماہرین کو بھی شامل کرلیا جائے تو جدید دور کے تمام مسائل سائنسی بنیادوں پر حل ہو سکتے ہیں...... چاند دیکھنے کا مسئلہ ہو، یا فیملی پلاننگ کا سود کا معاملہ ہو یا نظام حکومت کا سب کا متفقہ حل نکالا جا سکتا ہے۔ حدود آرڈیننس کو ختم کر دینا چاہیے، کیونکہ اس کے لیے فلاحی اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہیے۔ (۳۸)

ایک دوسرے موقع پر ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال نے تقریر کے دوران کہا: اگر چہ فورم ہی اجتماعی اجتہاد کا حق رکھتا ہے لیکن فی زمانہ پارلیمنٹ میں یہ صلاحیت مفقود ہے کہ وہ مذہبی معاملات پر اجتہاد کر سکے۔ انہوں نے کہا کہ اس سلسلے میں جدید علوم کے ماہرین بالخصوص وکلاء کو بھی آگے آنا چاہیے۔ (۳۹)

۴۔ پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے مؤیدین کا موقف اور مختصر دلائل:

اس تفصیل سے درج ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

۱۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے حق میں آوازیں اٹھنا شروع ہوگئی تھیں۔ اس فہرست میں سب سے پیش پیش تو...... جدید قانون دان طبقہ ہے، جن کا خیال یہ ہے کہ پاکستان ایک جمہوری ملک ہے، اور دوسرے جمہوری ملکوں کی طرح پاکستان کی پارلیمنٹ بھی ایک اعلیٰ ترین قانون ساز ادارہ ہے، اور اسے ہر طرح کی قانون سازی اور اجتہاد کا حق حاصل ہے۔

قیام پاکستان سے قبل علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں مدراس کے مقام پر جو خطبات دیئے اس میں سے ایک خطبہ فقہ اور مسائل فقہ سے متعلق ہے۔ جن میں علامہ اقبالؒ نے "پارلیمنٹ کے حق اجتہاد" کے حوالے سے آواز اٹھائی۔ جس میں انہوں نے ایران کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے پارلیمنٹ کے ساتھ "علماء کی کونسل" کی مخالفت کی، تاہم اسے کچھ عرصے تک یعنی اس وقت تک جب تک ایسا نصاب تعلیم رائج نہ ہو جائے جس کی بنیاد پر تمام لوگ فقہ اور مسائل فقہ سے واقف ہوں، ایسی مجلس کے قیام کی اجازت دی، اور تجویز کیا کہ علماء کی یہ کونسل پارلیمنٹ کی مسائل فقہ میں رہنمائی کرے۔

۲۔ علامہ اقبالؒ کے شارحین، خصوصاً ڈاکٹر محمد یوسف گورایا اور دوسرے کئی حضرات نے بلا کسی شرط اور بلا کسی قید کے، یہ رائے دی کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک پارلیمنٹ ایک بالاتر قانون ساز ادارہ ہے، اور اسے ہر طرح کی قانون سازی کا حق حاصل ہے...... حتیٰ کہ...... پارلیمنٹ...... قرآن کریم کے کسی حکم اور صحابہ کرامؓ کے اجماع سے کیے ہوئے فیصلے کو بھی منسوخ یا تبدیل کرنے کا حق رکھتی ہے۔ (والعیاذ باللہ) تاہم ان کے دوسرے شارحین نے اس بارے میں محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر محمد یوسف گورایا کا موقف اور ان کی دلیل یہ ہے کہ علماء اور ان کی کونسلیں...... غیر منتخب اور غیر جمہوری ادارے ہیں، جبکہ پارلیمنٹ...... ایک منتخب اور برتر ادارہ ہے۔ اس لیے علماء کو تو اجتہاد کا حق نہیں دیا جا سکتا، البتہ منتخب پارلیمنٹ ضرور اس کا حق رکھتی ہے۔ جہاں تک دینی اور مذہبی مسائل کے متعلق علم یا معلومات کا تعلق ہے، تو عصر حاضر میں، ہر موضوع پر اتنا علم کتابی صورت میں...... موجود ہے کہ جو سابقہ "دور" میں...... لوگوں کو میسر نہ تھا۔ اس لیے اس حوالے سے علماء کا یہ کہنا...... کہ اجتہاد کے لیے، فلاں فلاں علم میں مہارت ضروری ہے، درست نہیں ہے، اس لیے...... پارلیمنٹ کے منتخب اراکین پوری طرح اجتہاد کرنے کے اہل ہیں۔

۴۔ منکرین حدیث...... یعنی غلام احمد پرویز اور ان کے ہم مسلک لوگوں کا بھی قریب قریب یہی موقف رہا ہے کہ منتخب پارلیمنٹ ہی اجتہاد اور قانون سازی کا حق رکھتی ہے۔ ان سب حضرات کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ پارلیمنٹ میں علماء

(۳۸) ڈاکٹر جاوید اقبال، مضمون "اجتہاد کیا ہے، کیوں کیا جاتا ہے، کون کرسکتا ہے" مطبوعہ سہ ماہی اجتہاد، مطبوعہ اسلامی نظریاتی کونسل ۲۰۰۱، ص ۸۴-۸۵۔

(۳۹) جدید مسائل اجتہاد اور نوجوان، ایک مذاکرے کی روداد، در مجلہ مذکور، ص ۹۶۔

کی کونسل کی نامزدگی کے سخت خلاف تھے۔

۵۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کے صاحبزادے ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کا بھی یہی موقف ہے کہ منتخب پارلیمنٹ اور عدالتیں...... اجتہاد کرنے کا حق رکھتی ہیں، ان کا موقف ہے کہ بہت سے اسلامی احکام مثلاً قانون وراثت میں تبدیلی ہونی چاہیے......تاہم وہ اگرچہ اصولی طور پر پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے حق میں ہیں، مگر پاکستان کی موجودہ پارلیمنٹ کو یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

۶۔ ڈاکٹر جسٹس اقبال نے اپنی بیوی اور علامہ اقبال کی بہو جسٹس ناصرہ جاوید اقبال کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا، جس کی رُو سے نکاح کے لیے تحریر گواہان اور نکاح خواں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۷۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے جمہور کے نمائندوں کو حضرت عمر فاروق کی مجلس شوریٰ کے قائم مقام ہونے کا موقف اختیار کیا ہے، تاہم موجودہ پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے حوالے سے خاموشی اختیار کی ہے۔

۸۔ علامہ جاوید احمد غامدی اور ان کے ہم خیال لوگوں کا موقف یہ ہے کہ:

(الف) اجتہاد کرنے کے لیے مختلف علوم وفنون میں مہارت کی شرط درست نہیں ہے۔

(ب) ہر شخص انفرادی اجتہاد کرسکتا ہے۔

ج) جہاں تک اجتماعی اجتہاد کا تعلق ہے، تو اس کا حق صرف حکومت کو حاصل ہے۔ حکومت یہ اجتہاد پارلیمنٹ کے ذریعے کرائے یا کسی ادارے یا مجلس کے ذریعے سے کرائے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ جاوید احمد غامدی جنرل مشرف کے دور حکومت میں جنوری ۲۰۰۶ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بنائے گئے لیکن انہوں نے حکومت کی طرف سے مقرر کردہ علماء کی کمیٹی کی سفارشات منظور کرنے اور اسلامی نظریاتی کونسل کو اہمیت نہ دینے کی بنا پر ۲۷ ستمبر ۲۰۰۶ء کو صدر مملکت کو اپنا استعفیٰ دے دیا۔

❀❀❀

فصل دوم:

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے مخالفین کا نقطۂ نظر

۱۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان کا موقف:

اسلام میں چونکہ اجتہاد کے لیے مخصوص طریقہ کار اور اس کے لیے مخصوص شرائط کی موجودگی ضروری ہے جو کہ عام طور پر اسمبلی کے اراکین میں نہیں پائی جاتی...... اس لیے علماء کی طرف سے ہمیشہ علامہ اقبالؒ سمیت پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے حامی لوگوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

یہ سلسلہ علامہ اقبال کی زندگی سے ہی شروع ہو گیا تھا، لیکن چونکہ اس وقت مسلمان اپنی مؤثر نمائندگی کے حق سے محروم تھے اور اس وقت پوری مسلم قوم آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھی، اس لیے یہ مسئلہ قوم کی توجہ حاصل نہ کر سکا۔

لیکن قیام پاکستان کے بعد جب منتخب اسمبلیاں معرض وجود میں آئیں تو صورت حال بدل گئی اور مختلف ادوار میں جو اسمبلیاں معرض وجود میں آئیں، ان کے علمی اور فکری معیار کو دیکھ کر یہ بات اور بھی ضروری ہو گئی ہے کہ ''اجتہاد'' جیسی اہم شے کو ''بازیچۂ اطفال'' نہ بنایا جائے۔ اسی بنا پر ''جمہور علماء'' نے ابھی تک پارلیمنٹ کے ''حق اجتہاد'' کو قبول نہیں کیا۔ جن علماء نے اس حق کی مخالفت کی ہے۔ ان کے خیالات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

عصر حاضر کے جن جید علماء اور اہل علم نے پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کی مخالفت کی ہے، ان میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام سرفہرست طور پر شامل ہے۔ مولانا اگرچہ موجودہ سیاسی نظام کے حامی تھے اور اس کے ذریعے ملک میں تبدیلی کے خواہاں تھے، لیکن اس کے باوجود وہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کے مخالف تھے، ان کی رائے تفصیل کے ساتھ سابقہ باب میں درج کی جا چکی ہے۔(۱)

۲۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ:

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نہ صرف یہ کہ پارلیمنٹ کے تحت ہونے والے اجتہاد کے مخالف ہیں، بلکہ ان کی رائے میں سرکاری سرپرستی میں ہونے والا ہر اجتہاد ہی درست نہیں ہے، وہ اپنے خطبات میں ''اصول فقہ واجتہاد'' کے تحت فرماتے ہیں:

اسلام میں ایک روایت (Tradition) عجیب وغریب رہی ہے جو کسی اور قوم میں ہمیں نظر نہیں آتی یعنی اور ممالک میں قانون سازی حکومت کا اجارہ ہوتی ہے۔ جبکہ اسلام میں رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ چیز کبھی یوں نہیں رہی، اسلامی قانون کا یہ اصول ہے کہ عدالت کو حکومت سے آزاد رہنا چاہیے۔ یہ اصول مغرب میں بھی قبول کر لیا گیا ہے اور ہمارے ہاں بھی برقرار و جاری ہے اور عہد نبوی سے آج تک اسی طرح اسلام میں قانون سازی پرائیویٹ شے رہی ہے، کبھی حکومت کا اجارہ (Monopoly) نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان فقہاء پوری آزادی کے ساتھ قانون کی ترقی میں مشغول رہے۔

قانون سازی صرف حکومت کی پارلیمنٹ تک محدود نہیں رہی۔ ورنہ اسلامی قانون کی ترقی اس طرح نہیں ہو سکتی تھی، جس

---

۱) دیکھیے ---- باب سوم ----

طرح عمل میں، یہ نہیں کہتا کہ اسلام کا یہ اصول قانون اور حکم ہے، بلکہ اسلامی روایت (Tradition) یہ ہے کہ قانون سازی حکومت کا اجارہ نہیں ورنہ حکومت کی سیاسی ضرورتوں کی وجہ سے قانون متاثر ہوگا۔ اگر میں وزیر قانون ہوں تو صدر مملکت کی ضرورت اور بعض وقت اس کی منشا کا لحاظ کر کے مسودۂ قانون پارلیمنٹ میں پیش کروں گا اور اپنے اثرات ڈال کر اس مسودۂ قانون کے خلاف رائے نہ دو۔ اس صورت میں اکثریت کی رائے سے جو قانون بنے گا وہ سیاسی ضروریات سے متاثر ہوگا، اس کے برخلاف اگر مسلمان فقہاء کو حسب سابق آزادی رہے کہ قانون سازی وہ خود کریں یعنی احکام کے متعلق اپنے قیاس اور اجتہاد کے ذریعے رائے دیں تو حکومت کے احکام کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، ایک رائے دے گا، دوسرا شخص اس کے برعکس رائے دے گا۔ تیسرا شخص شاید دونوں بین بین رائے دے گا۔ اس طرح ایک عام بحث مباحثے کے بعد ہم کسی بہتر نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔ جو ملت کے لیے حکومت کے لیے اور ساری انسانیت کے لیے کارآمد ہوسکتا ہے۔''(۲)

علامہ اقبالؒ اور ان کے شارحین کے اس مؤقف سے جس کا ذکر سطور بالا میں آیا چونکہ ''فقہ اسلامی'' کی دنیا میں ''آزادانہ اجتہاد'' اجتہاد کا دروازہ کھلتا ہے اور شریعت کے اصول ہائے اجتہاد کی نفی ہوتی ہے۔ اسی لیے شروع سے ہی علامہ اقبالؒ اور ان کے ہم نواؤں کو ''علمی حلقوں'' میں کچھ زیادہ پذیرائی نہیں مل سکی اور ان کے مؤقف سے علما کے حلقوں میں شدید اختلاف کیا جاتا رہا ہے۔ خصوصاً قیام پاکستان کے بعد جب ''اسمبلی'' اور پارلیمنٹ عملی صورت میں سامنے آئی اور اسمبلی کے اراکین کے علمی پائے اور قانون سازی کے طریق کار سے عوام کو آگہی ہوئی تو یہ اعتراضات اور بھی شدید ہوگئے...... اسی لیے علمی حلقے اسمبلی یا پارلیمنٹ کو کسی صورت بھی محض عہدوں کی بنیاد پر یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی کا (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے سابق پریذیڈنٹ اور سابق وفاقی وزیر برائے امور مذہبیہ اور معروف اسلامی اسکالر......) موقف ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے موقف کے مطابق ہے۔ انہوں نے بھی یہ لکھا ہے کہ اسلام میں ہمیشہ ہر دور میں قانون سازی...... حکومتی مداخلت سے آزاد ماحول میں ہوئی ہے۔

اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ:

(الف) ڈاکٹر محمد حمید اللہ...... پارلیمنٹ کے لیے حق اجتہاد کے سخت مخالف تھے، بلکہ ان کا موقف یہ تھا کہ اجتہاد کبھی بھی سرکاری سرپرستی میں نہیں رہا اور نہ ہی رہنا چاہیے۔

(ب) ان کی دلیل یہ ہے کہ حکومت پارلیمنٹ کے ذریعے جو فیصلے کرتی ہے، وہ زیادہ تر سیاسی مصلحتوں اور سیاسی مجبوریوں کے تابع ہوتے ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی منشاء جاننے اور اس پر احکام کا مدار رکھنے کی بجائے ہمیشہ عوام الناس کو خوش کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہے اور ان کی اس دلیل میں وزن ہے۔

۳۔ مکتب اہلحدیث کا موقف و مسلک:

پاکستان میں جو بڑے بڑے مسالک ہیں۔ ان میں ایک مسلک اہلحدیث علماء پر مشتمل ہے۔ مسلک اہل حدیث چونکہ ہر معاملے میں حدیث اور سنّت کی تقدیم کا قائل ہے، اسی لیے بعض علمائے کرام تو قیاس اور اجتہاد کے بھی سخت خلاف ہیں...... بہر حال اس مسلک کے ایک معتبر اور ثقہ عالم دین...... حافظ صلاح الدین یوسف نے قدیم علماء کا نقطۂ نگاہ یوں بیان کیا ہے:

---

۲) خطبات بہاولپور مطبوعہ اسلامی یونیورسٹی، بہاولپور، ص ۲۳۰۔

انہوں نے علامہ اقبالؒ اور ان کے حامی علماء اور ان کے موقف پر سخت ترین الفاظ میں تنقید کی ہے، ان کے مؤقف کے اہم نکات درج ذیل ہیں۔(۳)

۱۔ علامہ اقبالؒ ایک نابغۂ عصر شاعر ضرور تھے، لیکن مسلمہ اسلامی مفکر انہیں مشکل سے ہی قرار دیا جا سکتا ہے اور اب تو اس سے بھی بڑھ کر انہیں امام معصوم بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، جیسا کہ مذکورۃ الصدر حضرات کی تحریریں اور کتابیں اس پر شاہد ہیں۔ یہ حضرات علامہ اقبالؒ کے وہ خیالات جن سے ان میں مضمر خطرات کی بنا پر اہل علم و فکر نے خاص اعتنا نہیں کیا، انہیں نہایت غیر آہنگی سے پیش کر رہے ہیں۔(۴)

۲۔ علامہ اقبال کے افکار اور کلام میں اسلام سے والہانہ وابستگی اور اسلامی تہذیب کے بہتر اور برتر ہونے کا تصور تو قدم قدم پر ملتا ہے، لیکن اسلامی نظام و تہذیب کی موجودہ دور میں صورت گری اور عملی تشکیل کس طرح سے ہو، اس سلسلے میں علامہ کے کلام و افکار سے واضح انداز میں رہنمائی نہیں ملتی، بلکہ ایک گونہ تضاد سا محسوس ہوتا ہے......راقم کے نزدیک......ان کے کلام میں مربوط فکری رہنمائی کا فقدان ہے، نہ وہ اس میدان کے آدمی تھے اور نہ انہوں نے متعین فکر ہی دی ہے۔

۳۔ مذکورہ اہل قلم علامہ کی جس کتاب کو بنیاد بناتے ہیں، وہ ہے ان کے خطبات کا مجموعہ جس میں ان کی بہت سی باتیں ان کے عمر بھر کے کلام و نظریات کے بالکل مخالف ہیں۔ جس کی وجہ سے علامہ سید سلیمان ندوی جیسا شخص بھی، جو علامہ کے نہایت قدر دان اور مزاج شناسا تھے، علامہ کے ان خطبات کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے کہ یہ لیکچر شائع نہ ہوئے ہوتے تو اچھا تھا(۵)۔ پھر ایسی کتاب کو بنیاد بنا کر اس میں پیش کردہ مبہم اور غیر واضح باتوں کو صحیفۂ آسمانی کی طرح پیش کرنا کیوں کر صحیح ہے۔

بعد ازاں حافظ صاحب نے علامہ اقبال کے اس خطبے میں موجود تمام امور کو ہدف تنقید بنایا ہے۔

۱۔ ترکی ریاست کا حوالہ:

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں جدید ترکی ریاست کا حوالہ دیا ہے(۶)۔ حافظ صلاح الدین نے اس پر شدید تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ ترکی کی ریاست مسلمانوں کے لیے نمونہ نہیں ہے۔ اور مصطفیٰ کمال پاشا کے اقدامات تو شریعت کے انہدام کی عکاسی کرتے ہیں(۷)۔

حافظ صاحب مزید لکھتے ہیں:

مصطفیٰ کمال کی مغرب زدگی پر خود علامہ اقبالؒ نے بھی جاوید نامہ (ص ۲۷) میں تنقید فرمائی تھی۔

حافظ صاحب کے خیال میں علامہ اقبال نے شروع میں تو جدید ترکی کے اقدامات کی تعریف کی (۸)۔ مگر بعد ازاں انہوں نے حتیٰ

---

۳) حافظ صلاح الدین یوسف مدیر شعبہ تحقیق و تالیف و ترجمہ، مکتبہ دار السلام، لاہور۔ مکتب سلفیہ سے تعلق رکھنے والے معروف عالم دین ہیں۔ متعدد کتابوں اور مقالات کے مؤلف ہیں اور پاکستان کے دینی اور علمی حلقوں میں کافی معروف ہیں۔ (اجتہاد اور تعبیر شریعت کے اختیار کا مسئلہ، پارلیمنٹ اس کی اہل ہے یا نہیں، در اجتماعی اجتہاد، مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ص ۱۳۹)۔

۴) ایضاً ص ۱۴۰-۱۴۱

۵) ایضاً ص ۱۴۱۔ بحوالہ ڈاکٹر وحید عشرت، ششماہی اقبالیات، اقبال نمبر جنوری تا جون ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۷-۱۷۸، مطبوعہ اقبال اکادمی، لاہور

۶) اجتہاد اور تعبیر شریعت کے اختیار کا مسئلہ، ص ۱۴۲

۷) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص ۶۴، مطبوعہ لکھنؤ

۸) ایضاً

کہ اپنی شاعری میں بھی اُسے تنقید کا نشانہ بنایا(۹)۔

علاوہ ازیں علامہ نے اس مغربی تہذیب اوراس کے دل دادگان پر بھی بڑی زوردار تنقیدیں کی ہیں، جس سے اہل علم باخبر ہیں، جوترکی اجتہاد کے نتیجے میں ترکی کا مقدر بنی۔

پھرانہوں نے خلیل حامدی صاحب کے حوالے سے شیخ الاسلام عمرنصوحی کے تاثرات نقل کیے ہیں۔جن میں شیخ صاحب نے مصطفیٰ کمال کے دور میں ہونے والے جوروستم کی تفصیل بیان کی ہے۔(۱۰)

ان مذکورہ تفصیلات سے ہر شخص بہ آسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں سے ترکی میں جو تبدیلی آئی وہ ''اجتہاد'' نہیں تھا بلکہ وہ اسلام سے انحراف وبغاوت کی منظم سازش اور جدوجہد تھی۔اس کے بعد یہ فیصلہ بھی آسانی سے ہوسکے گا کہ اسے ''اجتہاد'' کہا بھی جاسکتا ہے؟

علاوہ ازیں خود علامہ اقبالؒ بھی مصطفیٰ کمال کے بارے میں جوحسنِ ظن رکھتے تھے،اس کے بعد کے اقدامات سے اس میں فرق آ گیا تھااوراپنی رائے تبدیل کر لینے پر مجبور ہو گئے تھے(۱۱)۔

رہا یہ سوال کہ آیا ووٹ کے ذریعے منتخب ہونے والے ارکان پارلیمنٹ کوانفرادی یااجتماعی طور پر ''حق اجتہاد'' حاصل ہے یا نہیں اور یہ کہ یہ جمہوری طریقہ کاراسلام کے عین مطابق ہے،اس حوالے سے حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''یہ دعویٰ کہ جمہوری طرز حکومت روح اسلام کے عین مطابق ہے،اگراس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے نظام خلافت و سیاست میں جمہوری اقدار موجود ہیں،اس میں اظہارِ رائے پر پابندی نہیں ہے،خلفاء وعمال حکومت پر تنقید کی اجازت ہے،حکمران احتساب سے بالاتر نہیں ہیں،حکمران عوام کے جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کے ذمے دار ہیں اور اہل صلاح افراد سے مشاورت کا اہتمام ان کے لیے ضروری ہے تو یہ ''جمہوریت'' بلاشبہ اسلام میں ہے۔

اور اگر دانش ورانِ عصر حاضر کے نزدیک اس سے مراد مغربی جمہوریت ہے تو راقم علی وجہ البصیرت کہتا ہے کہ اسے روحِ اسلام کے عین مطابق قرار دینا حقائق کے یکسر خلاف ہے۔بلاشبہ شاطرانِ مغرب نے ''جمہوریت'' کا ناد اس زور سے پھونکا ہے کہ بڑے بڑے اہل علم بھی اس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو گئے ہیں اور شاید جمہوریت کی عشوہ طرازیوں نے سب کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمہوریت کی جو عام تعریف کی جاتی ہے:

''عوام کی حکومت،عوام کے ذریعے سے،عوام کے لیے۔''(۱۲)

ہماری جمہوریت اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔

انہوں نے مزید لکھا ہے:

علاوہ ازیں اور بھی خرابیاں ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، ہوسکتا ہے بعض لوگ کہیں کہ یہ خرابیاں صرف ایشیائی

---

۹) علامہ اقبال، جاوید نامہ، ص۴۷

۱۰) حافظ صلاح الدین یوسف، کتاب مذکور، ص۱۳۵، بحوالہ ترجمان القرآن، لاہور، جلد۷۰، شمارہ۶۔بابت فروری ۱۹۶۹ء، نیز خلیل حامدی سفرنامہ ترکی قدیم وجدید، ص۴۰-۴۳، ۱۸۱-۱۹۱، بار دوم، لاہور

۱۱) اجتماعی اجتہاد، ص۱۴۸

۱۲) اجتماعی اجتہاد، ص۱۴۹

اور ترقی پذیر ملکوں ہی میں پائی جاتی ہیں جہاں ابھی تعلیم اور سیاسی شعور کی کمی ہے، جو تعلیم کی شرح میں اضافے اور سیاسی پختگی سے ختم ہو جائیں گی لیکن جن اہل نظر کو خود انگلینڈ اور یورپ جا کر ''جمہوریت'' کے مشاہدے کا موقع ملا ہے، انہوں نے وہاں بھی یہی کچھ دیکھا ہے(۱۳)۔

علامہ اقبالؒ بھی ذاتی طور پر اسی خیال کے حامی تھے کہ موجودہ جمہوریت کا روحِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کلام میں بھی اس پر خوب تنقید کی ہے(۱۴)۔ یہاں حافظ صاحب نے علامہ اقبال کے اس شعر سے کہ ''از مغز دوصد خر فکر انسانے نمی آید'' استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر دوسوان پڑھ لوگ منتخب ہو جائیں تو ان سے ایک ذہین شخص کا دماغ نہیں بن سکتا(۱۵)۔

اس حوالے سے علامہ اقبالؒ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال فرماتے ہیں:

''جمہوری طرزِ حکومت پر ایک مفکر کی حیثیت سے ان کا اعتراض خالصۃً اخلاقی اور اصولی تھا کیونکہ اس میں انتخاب کی بنیاد ووٹروں کی گنتی پر رکھی جاتی ہے اور اس گنتی میں ایک صحیح یا مناسب امیدوار محض ایک ووٹ کم پڑنے سے کسی غلط یا غیر مناسب امیدوار کے مقابلے میں شکست کھا سکتا ہے۔ جمہوری نظام کے اس سقم کا اعتراف ہر سیاسی مفکر نے کیا ہے۔ اسی طرح وہ برصغیر میں ایک جمہوری نظام کے انعقاد کے بھی خلاف تھے، جس سے مسلمان من حیث القوم ایک اقلیت میں منتقل کر دیئے جائیں، نیز انہیں یہ خدشہ تھا کہ کسی بھی پسماندہ ملک میں، جس کے عوام زیادہ تر ان پڑھ، غیر منظم اور فاقہ کش ہوں، وہاں جمہوریت کا تعارف سیاسی ابتری، معاشی تباہی، قومی انتشار اور ملک کے ٹوٹنے کا سبب بن سکتا ہے......اقبال نہ مغرب کے سیکولر جمہوری نظام کے حامی تھے، نہ آج کے دور میں اسلام کے روایتی تصور ریاست (یعنی خلافت) کو کوئی اہمیت دیتے تھے۔''(۱۶)

---

۱۳) یہاں حافظ صاحب نے سید سلیمان ندوی کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ انگلینڈ وغیرہ میں بھی جمہوری نظام میں بے شمار قباحتیں اور خرابیاں موجود ہیں...... دیکھیے شاہ معین الدین ندوی۔ حیات سلیمان، ص ۳، ۱۹۷۳ء، ص ۲۰۵

۱۴) بانگ درا، ص ۲۶۲، نیز دیکھیے: ارمغان حجاز، ص ۱۷...... بانگ درا، ص ۲۶۳۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

۱۵) حافظ صلاح الدین، اجتماعی اجتہاد، ص ۱۵۶۔

۱۶) ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، جلد ۳، ص ۶۶۷-۶۱۱

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ تعبیر شریعت کا کلی اختیار صرف ''پارلیمنٹ کو ہے، نامزد علماء کو نہیں''......اس حوالے سے حافظ صاحب لکھتے ہیں:

تیسری بات حضرت علامہ کے حوالے سے یہ بیان کی جاتی ہے کہ اجتہاد اور تعبیر شریعت کا حق منتخب نمائندگان کو ہے، نامزد علماء کو یہ حق نہیں دیا جانا چاہیے۔ ان حضرات کی اصل بنیادی نکتہ ہے اور یہ وہ نقطۂ نظر ہے جس میں علامہ اقبالؒ منفرد ہیں، ان کی اس رائے کو اہل علم وفکر کرنے میں پذیرائی نصیب نہیں ہوئی کیونکہ انتظامی، سماجی، سیاسی اور معاشرتی امور و معاملات میں منتخب نمائندگان کا حق قانون سازی تو سب تسلیم کرتے ہیں، ان کے اس حق کا کسی نے انکار نہیں کیا، لیکن اس سے بڑھ کر انہیں اجتہاد اور تعبیر شریعت کا بھی واحد اہل اور حق دار قرار دینا یکسر نا قابل قبول ہے۔ (۱۷)

اس کی وجہ یہ ہے کہ ''اجتہاد'' ایک شرعی اصطلاح ہے۔ جس کا مطلب ہے:

''شرعی مآخذ کی روشنی میں کسی پیش آمدہ شرعی مسئلے کے حل کرنے کی پوری دیانت داری اور خدا خوفی کے ساتھ، بھرپور کوشش کرنا اور غور وفکر میں تمام علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا۔''

اور اس کام کا اہل وہی ہوسکتا ہے۔ جس میں مخصوص قسم کی صلاحیت واستعداد ہوگی اور مخصوص اوصاف وشرائط کا وہ حامل ہو گا، محض سرمائے کے بل بوتے پر منتخب ہونے والے ارکان کے اندر یہ مخصوص استعداد اور مخصوص اوصاف پیدا نہیں ہو جائیں گے کہ انہیں ''مجتہد'' بھی اور شریعت کی تعبیر نو کا حق دار بھی تسلیم کرلیا جائے۔

زیر بحث نقطۂ نظر کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس میں ''اجتہاد'' کے اصطلاحی مفہوم کو نظر انداز کر کے اس کی خودساختہ تعریف کی گئی ہے کہ کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کی کوشش کا نام اجتہاد ہے۔

بہر حال ''اجتہاد'' کا یہ نظریہ ہر لحاظ سے غلط ہے، جس کے درج ذیل وجوہ ہیں:

منتخب نمائندگان کی اکثریت اس علمی اہلیت وصلاحیت سے عاری اور ان اوصاف وشرائط سے بے بہرہ ہوتی ہے جو شرعی اجتہاد کے لیے ضروری ہے۔ ان کی اکثریت قرآن کریم کے سادہ ترجمے تک سے ناآشنا ہوتی ہے۔ جب کہ اجتہاد کے لیے مذکورہ (کئی) علوم میں مہارت اور مجتہدانہ درک وبصیرت ضروری ہے۔

(ب) دوسری خرابی اس سے یہ پیدا ہوگی کہ ہر پانچ سال بعد شریعت کا نیا ایڈیشن تیار کرنا پڑے گا کیونکہ یہ بات عام تجربہ و مشاہدہ کا حصہ ہے کہ جو بھی نئی حکومت آتی ہے، اس کے مفادات ومصالح پچھلی حکومتوں سے مختلف ہوتے ہیں اور وہ اس کی روشنی میں قوانین میں ردوبدل اور ترامیم یا نئی قانون سازی کرتی ہے۔ اگر شریعت کو بھی موم کی ناک بنا کر اس کی تعبیر اور تدوین جدید کا حق اسمبلیوں کے نمائندگان کو دے دیا گیا تو یقیناً......

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

کے مطابق شریعت کے ایڈیشن بھی بدلتے رہیں گے اور اس اکھاڑ پچھاڑ میں شریعت کا جو حال ہوگا محتاجِ وضاحت نہیں۔ (۱۸)

(ج) علامہ کی اس تجویز کے یہ مضمرات خود ان کو بھی ناپسند ہیں، جس کی تصریح ان کے اشعار اور خیالات میں ملتی ہے۔ مثلاً مثنوی اسرار ورموز میں وہ ''راہِ آباء'' یعنی اسلاف کی روش پر چلنے کی تاکید کرتے ہیں اور ان کی پیروی کو ضبط ملت کے ہم معنی سمجھتے

۱۷) اجتماعی اجتہاد، ص ۱۵۶-۱۵۷

۱۸) ایضاً۔

ہیں۔ نیز زمانہ انحطاط میں ''عالمانِ کم نظر'' کے اجتہاد کے مقابلے میں اسلاف کی اقدار کو محفوظ تر اور اجتہاد کو ملت کے لیے نہایت خطرناک تصور کرتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

راہِ آباء رو کہ ایں جمعیت است — معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است
اجتہاد اندر زمانِ انحطاط — قوم را برہم ہمی پیچد بساط
زاجتہادِ عالمانِ کم نظر — اقتداء بررفتگاں محفوظ تر

حافظ صاحب کے مطابق علامہ اقبالؒ کے ان خیالات کی تائید وتوثیق علامہ اقبالؒ کے مکتوبات سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ مولانا شبلی نے ''الکلام'' میں شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے اسی انداز کی بات تحریر کی تھی کہ امام وقت کو حالات وضروریات کے تحت شعار، تعزیرات اور انتظامات وغیرہ میں تعبیر جدید کا حق حاصل ہے۔ علامہ اقبالؒ کو یہ عبارت بڑی کھٹکی اور اس میں مضمر خطرات سے وہ چونک پڑے، جس کا اظہار انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک مکتوب میں کیا، فرماتے ہیں:

''جناب کا ارشاد اس بارے میں کیا ہے؟ علی ہذا القیاس ارتفاقات میں شاہ (ولی اللہؒ) صاحب کی تشریح کے مطابق تمام تدابیر، جو سوشل اعتبار سے نافع ہوں، داخل ہیں۔ مثلاً نکاح وطلاق کے احکام وغیرہ۔ اگر شاہ صاحب کی عبارت کی یہ تشریح صحیح ہے تو حیرت انگیز ہے۔ اگر ان معاملات میں تھوڑی ڈھیل بھی دی جائے تو سوسائٹی کا کوئی نظام نہ رہے گا، ہر ایک ملک کے مسلمان اپنے اپنے دستور ومراسم کی پابندی کریں گے۔(۱۹)

غرض یہ کہ علامہ اقبال اسلام کی تعبیر سے ہٹ کر شریعت کی کسی ایسی تعبیر کو پسند نہیں کرتے تھے جس سے تجدد کو بال و پر مہیا ہوں اور یوں ملت اسلامیہ کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے اور ہر اسلامی ملک میں جدا جدا شریعتیں بن جائیں، جیسا کہ منتخب نمائندگان کو حقِ اجتہاد عطا کر دینے کے نتیجے میں اس کا غالب امکان ہے۔

وہ ''جدید'' کے مقابلے میں ''قدیم'' کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ان کا قلبی میلان اسی طرح تھا، جس کا مطلب بھی یہی ہے کہ شوقِ جدت میں وہ قدیم ورثے اور اسلامی روایات واقدار سے ہاتھ دھونا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ''جدید'' سے اس طرح استفادہ کے قائل تھے کہ جس سے ''قدیم'' سے کوئی تعلق نہ ٹوٹے، جیسا کہ علمائے کرام کا موقف ہے۔(۲۰)

۳۔ مسلمہ اسلامی تعبیرات کے خلاف نئی تعبیر کی کوشش:

علامہ اقبالؒ اور ان کے شارحین کے بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ مسلمہ تعبیرات کے خلاف نئی تعبیرات کی تلاش وجستجو کے حق میں تھے اس عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے حافظ صاحب نے لکھا ہے:

قرآن وحدیث کے احکام کی وہی تعبیر درست ہے جو دورِ خیر القرون سے مسلَّم چلی آ رہی ہے، اس تعبیر کے خلاف کسی دوسری تعبیر کی کوشش ''اجتہاد'' نہیں ''انتشار'' کہلائے گی۔ متجددین اور مغرب زدہ طبقہ اسی ''انتشار'' کو ''اجتہاد'' کے نام پر اسلامی معاشرے میں فروغ دینے کی مذموم سعی کر رہا ہے جس کا سدباب انتہائی ضروری ہے، ورنہ دین اسلام بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔''(۲۱)

---

۱۹) اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص ۱۹۸-۱۹۹

۲۰) اجتماعی اجتہاد، ص ۱۵۰-۱۶۰

۲۱) ایضاً، ص ۱۶۲-۱۶۳

۴۔ اجتہاد، فقہ اسلامی کی روح اور اس کے لئے سرچشمۂ حیات ہے:

حافظ صلاح الدین نے اجتہاد کے اصول کی آفاقیت اور ابدیت کے حوالے سے لکھا ہے:

''یہ بات یقیناً بالکل درست ہے۔ اجتہاد کی اہمیت ہر دور میں مسلم رہی ہے اور حالات و مقتضیات کے مطابق اجتہادی عمل بھی جاری رہا ہے اور آج بھی اس کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کا کوئی منکر نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر دور میں حالات وضروریات کے مطابق قانون سازی ناگزیر ہے اور غیر منصوص معاملات میں شارع کی مرضی ومنشا کے مطابق قانون سازی ہی کا نام قیاس و استنباط اور اجتہاد ہے، جس کی ضرورت عہد صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بلکہ عہد رسالت سے اب تک مسلم ہے''۔ (۲۲)

۵۔ اجتہاد کا دائرہ عمل کا محدود اور مشروط ہونا:

حافظ صاحب نے اس سوال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

یہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلامی ریاست میں قانون سازی کی گنجائش تو ضرور ہے، لیکن مغربی جمہوریتوں کی طرح اس میں قانون سازی کا یہ حق غیر محدود نہیں، محدود ہے، غیر مشروط نہیں مشروط ہے۔ مغرب کے جمہوری نظام میں قانون سازی کا یہ حق عوام کو حاصل ہے۔ ان کی اکثریت جس چیز کو پسند یا ناپسند کرے گی، اس کو قانون کی حیثیت حاصل ہو جائے گی، لیکن ایک اسلامی ریاست میں قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا گیا ہے، اس لیے وہاں کے مسلم عوام اللہ کی پسند و ناپسند کو نظرانداز کر کے اپنے طور پر کوئی قانون سازی نہیں کر سکتے۔ وہاں قانون سازی کا دائرہ عمل محدود و مشروط ہے۔ (۲۳)

۶۔ علماء کی کونسل کا قیام

حافظ نے اپنے مقالے کے آخر میں علامہ اقبال کی اس تجویز پر رائے دیتے ہوئے کہ علماء کی ایک کونسل قائم کی جائے لکھا ہے:

''اجتماعی اجتہاد کی صحیح صورت یہ ہے کہ عالم اسلام کے فاضل علماء کی ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی جائے جو اپنے اسلامی کردار اور زہد و ورع میں بھی ممتاز ہوں اور اس لحاظ سے مسلم عوام میں قابل اعتبار گردانے جاتے ہوں اور وہ قرآنی علوم اور احادیث رسول پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ چاروں مذاہب فقہ کی کتابوں پر بھی دسترس رکھتے ہوں۔ وہ ہر ہر فقہ کی دو دو اہم اور بنیادی کتابیں سامنے رکھیں۔ مثلاً فقہ حنفی سے المبسوط اور البدائع الصنائع۔ فقہ مالکی سے موطا امام مالک اور المدونۃ الکبریٰ۔ فقہ شافعی سے کتاب الام اور شرح مہذب، فقہ حنبلی سے المغنی لابن قدامہ اور کشاف القناع اور فقہ ظاہری سے المحلی لابن حزم اور فقہ الحدیث سے صحیح بخاری اور دوسری کتب صحاح ستہ اور ان کی شروح۔ ان کتابوں میں رد و بدل یا مزید کمی بیشی ممکن ہے، یہ ایک سرسری ساخاکہ ہے۔ جس میں مزید رنگ و روغن بھرا جاسکتا ہے۔''

ان تبحر علماء کی کمیٹی میں جدید علوم وفنون یعنی اقتصادیات واجتماعیات، قانون وتجارت وغیرہ جملہ علوم عصریہ کے ایسے ماہرین بھی شامل کیے جائیں، جو عقیدہ و عمل کے لحاظ سے سچے اور کھرے مسلمان ہوں۔ تعلیم جدید نے ان کی ایمانی بنیادوں کو متزلزل نہ کیا ہو۔ بلکہ وہ عصری مسائل کا ادراک وشعور رکھنے کے ساتھ ان کے شرعی حل کا احساس و جذبہ اور دلی تڑپ بھی رکھتے ہوں

---

۲۲) ایضاً، ص ۱۶۳۔۱۶۴۔

۲۳) ایضاً، ص ۱۶۳۔۱۶۴

تا کہ علمائے شریعت جدید عصری معاملات اور فنی (ٹیکنیکل) مسائل میں ان کی رائے اور تفصیلات پر اعتماد کرتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھا سکیں اور جدید مسائل کی تہ تک پہنچنے میں علماء کو آسانی ہو۔

مذکورہ فقہی کاوشوں سے استفادہ کرتے ہوئے اور علم جدید سے بہرہ ور دیانت دار لوگوں کی رائے اور معلومات کو سامنے رکھ کر کھلے دل و دماغ سے اجتہادی مسائل کا حل اجتماعی طریقے سے نکالا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم عصری مسائل کو شرعی احکام کے ساتھ تطبیق نہ دے سکیں اور ان کا مناسب حل تلاش نہ کر سکیں۔ (۲۴)

۷۔ کیا صحابۂ کرام کا اجماع حجت شرعیہ ہے؟

اس حوالے سے حافظ صاحب نے لکھا ہے:

سا تویں بات یہ کہی جاتی ہے کہ کسی امر واقعی کے بارے میں تو صحابۂ کرام کا اجماع حجت ہے جیسے معوذتین کے بارے میں جب اختلاف ہوا کہ یہ قرآن کا حصہ ہیں یا نہیں؟ تو صحابہ نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ یہ قرآن کا حصہ ہیں، لیکن کسی امر قانونی کے بارے میں صحابۂ کرام کا اجماع حجت نہیں، اس صورت میں یہ مسئلہ محض تعبیر واجتہاد کا ہے، جس میں ان سے مختلف اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔

لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اجماعی مسائل میں امر واقعی اور امر قانونی کے درمیان تفریق کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔ دلائل شرعیہ مطلقاً ہر معاملے میں صحابہ کرامؓ کے اجماع کو حجت گردانتے ہیں اور اس سے انحراف کی اجازت نہیں دیتے۔ صحابہ کرامؓ کے بعد منعقد ہونے والے اجماع کی حجیت پر تو پھر بھی اختلاف ہے، لیکن صحابہ کرام کے اجماع پر تحقیقی طور پر اہل سنت کے کسی بھی مکتب فکر اور کسی بھی مجتہد کا اختلاف نہیں۔ بنابریں صحابہ کرام کے اجماع سے گریز کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ جس طرح شریعت کی تعبیر میں ان کی رائے اور تعبیر سب سے زیادہ اہم ہے جس کی موجودگی میں دوسری تعبیر صحیح نہیں، اسی طرح کسی بھی مسئلے میں صحابہ کی اجماعی رائے سے گریز غیر صحیح اور ناقابل قبول ہے۔ (۲۵)

۸۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے ''نظریۂ اجتہاد'' سے رجوع کر لیا تھا؟

حافظ صلاح الدین صاحب نے اپنے مقالے کے آخر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبالؒ نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ''اپنے مخصوص نظریۂ اجتہاد'' سے رجوع کر لیا تھا (۲۶)...... حافظ صلاح الدین کے مطابق:

''مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کے یہ ''خطبات'' ۱۹۲۲ء میں انگلستان میں زیر طبع تھے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں، یہ خطبات ۱۹۲۲ء سے بھی کئی سال قبل تحریر کیے گئے تھے اور یہ دور وہ تھا جب ترکی میں انجمن اصلاح وترقی اور اس کے سرکردہ رہنما مصطفیٰ کمال اور دیگر ان کے ہمنوا ایک طرف ترکی کی اصلاح وترقی کے لیے مختلف کوششوں میں سرگرم تھے اور دوسری طرف ترکی کی بعض ریاستوں (بلقان و یونان وسمرنا وغیرہ) پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا، ان کے خلاف حرب وضرب میں مصروف تھے اور اس میں انہوں نے خاصی کامیابی حاصل کی اور اتحادی فوجوں کو مار بھگایا۔ مصطفیٰ کمال کی یہی شہامت وشجاعت تھی، جس نے اسے ترکی کی بازیافتہ ریاستوں میں ہیرو کا مقام عطا کر دیا تھا (۲۷)۔''

---

۲۴) ایضاً، ص ۱۶۵-۱۶۶

۲۵) ایضاً، ص ۱۶۸-۱۶۹

۲۶) زندہ رود، ۳/۵۸

۲۷) دیکھیے اجتماعی اجتہاد، ص ۱۶۵، نیز دیکھیے: اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص ۱۱۲-۱۱۳

لیکن جب ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال نے خلافت اسلامیہ کا خاتمہ کر کے اور ترکی کی اسلامی حیثیت ختم کر کے اسے سیکولرازم اور مغربیت کے راستے پر ڈال دیا (جس کی کچھ تفصیل پہلے گزر چکی ہے) تو علامہ نے مصطفیٰ کمال سے بھی مایوسی کا اظہار کیا اور اس پر تنقید کی، جیسا کہ علامہ کے یہ اشعار و خیالات پہلے نقل کیے جا چکے ہیں۔اسی ضمن میں ان کا یہ شعر بھی ہے۔

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ نے پہلے ترکی اجتہاد کی جو تعریف کی تھی، بعد میں مصطفیٰ کمال کے اقدامات دیکھ کر اس پر انہوں نے نظر ثانی کر لی تھی، اس کی تائید ان خطوط سے بھی ہوتی ہے، جو مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ہیں، جن کے بعض اقتباسات گزر چکے ہیں، جن سے ان کے اس نظریے کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ایسی تعبیر و تشریح جدید کے قائل نہیں رہے تھے، جس کے نتیجے میں ہر اسلامی ملک میں الگ الگ احکامِ شرعی مرتب ہو جائیں اور یوں ملت اسلامیہ کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے، جیسا کہ ان کے ان نظریۂ اجتہاد سے مستفاد ہوتا ہے جسے اب بعض حلقے ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں۔

بہر حال اس توجیہ و تطبیق سے اگر کوئی حلقہ مطمئن نہیں ہوتا اور اس کا اصرار ہے کہ علامہ اپنے نظریۂ اجتہاد ہی پر قائم رہے تو ہم پھر یہی عرض کریں گے کہ علامہ کا یہ نظریہ اپنے اندر نہایت خطرناک مضمرات رکھنے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہے۔اس سے اس تجدد اور مغربیت ہی کی حوصلہ افزائی ہو گی جس کو وہ خود بھی سخت ناپسند کرتے تھے اور اپنے اشعار میں ان پر زوردار تنقید کی ہے اور مسلمانوں کی نئی نسل کو اس سے بچانے کی بھرپور سعی کی ہے۔'' (۲۸)

خلاصہ مباحث:

اس تفصیل سے درج ذیل امور کا اظہار ہوتا ہے:

(۱) حافظ صلاح الدین یوسف کے نزدیک علامہ اقبال اور ان کے شارحین کی یہ دلیل درست نہیں ہے کہ پارلیمنٹ ملک کے تمام عوام کی نمائندہ ہونے کی بنا پر اجتہاد کرنے کی حقدار ہے، اس لیے کہ اسلام میں اجتہاد کا حق صرف انہی لوگوں کو دیا گیا ہے، جو اس کے اہل ہیں۔

(۲) خود جمہوریت ایک متنازع مسئلہ ہے اور علامہ اقبال نے اپنے کلام میں اس پر سخت ترین الفاظ میں تنقید کی ہے۔

(۳) علامہ اقبال نے جدید ترکی اور اس کے نظام کا حوالہ دیا ہے۔حافظ صاحب کے نزدیک مصطفیٰ کمال پاشا ایک بے دین شخص تھا اور اس کا لایا ہوا نظام دوسرے اسلامی ملکوں کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

(۴) یہ کہنا کہ پارلیمنٹ قرآنی حکم یا اجماع سے ثابت شدہ حکم کو منسوخ یا تبدیل کر سکتی ہے، درست نہیں ہے۔پارلیمنٹ کو ایسا کوئی حق حاصل نہیں اور خود علامہ نے بھی یہ بات کہیں نہیں لکھی۔

(۵) علامہ اقبال نے علماء کی جس مجلس کی بات کی ہے، وہ درست ہے ایسی مجلس ہی شرعی طور پر اجتہاد کی حقدار ہے اور یہ اجتہاد محدود اور مشروط طریقے پر ہونا چاہیے۔صرف اسی جگہ جہاں ضرورت ہو، نئے سرے سے، فقہ اسلامی کی تدوین کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں۔

(۶) علامہ اقبال نے بعد میں اپنے ان سابقہ بیانات سے رجوع کر لیا تھا (۲۹)۔

---

۲۸) اجتماعی اجتہاد، ص ۱۶۹-۱۷۰

۲۹) ایضاً۔

۳۔ ڈاکٹر محمد امین کا تجزیہ:

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے مخالفین میں......ڈاکٹر محمد امین کا نام بھی شامل ہے، جو ایک معروف دینی دانشور ہیں (۳۰) انہوں نے اس عنوان پر اپنی ایک کتاب میں مفصل بحث کی ہے۔ اس حوالے سے پہلا سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ عوام کی نمائندہ ہے لہٰذا اسے قانون سازی کا حق حاصل ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

مغرب کے سیاسی اور قانونی نظام کا یہ تصور ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) دراصل عوام کا حق ہے، معاشرے اور ریاست میں عوام ہی بالاتر قوت ہیں، حکومت انہیں کی رائے سے بنتی ہے، انہیں کی رائے سے ٹوٹتی ہے، اپنے لیے قانون بنانے کے مجاز بھی وہ خود ہی ہیں۔ مغرب کی سیاست اور قانون کی دنیا میں یہ تصورات اتنے معروف اور بنیادی اہمیت کے حامل ہیں کہ اس کے لیے دلیل اور حوالے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ قانون آزادیٔ ہند کے ذریعے جس اسمبلی کو سیاسی اقتدار منتقل کیا گیا اسے قانونی اختیارات بھی منتقل کیے گئے اور حکومت پاکستان نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں بعض ترامیم کے بعد اسے نئی اسلامی مملکت کا عارضی دستور قرار دے دیا۔

مغرب میں چونکہ اقتدار و اختیار کا منبع عوام ہیں، اس لیے وہاں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سیاسی اور قانونی اقتدار انہیں کی (یا ان کے منتخب کردہ نمائندوں کی) ملکیت ہونا چاہیے، لیکن چونکہ اسلام میں یہ صورت حال نہیں اس لیے ان چیزوں کا اطلاق ایک مسلم معاشرے اور حکومت پر نہیں ہوسکتا۔ (۳۱)

آج کل قانون سازی کے حوالے سے یہ کہا جارہا ہے کہ قانون سازی انسان کا حق ہے۔ جو وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ اس حوالے سے اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے:

اس کے برعکس قانونی معاملات کا رُخ دوسرا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ انسان کو کوئی اختیار نہیں دیا، بلکہ صاف صاف وضاحت کردی ہے کہ بنیادی طور پر اس کام میں اس کا کوئی دخل نہیں، ہاں نبی چونکہ زمین پر خدا کا نمائندہ ہوتا ہے، اس لیے اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ خدا کی مرضی کی وضاحت کرے اور جہاں اس کا حکم موجود نہ ہو وہ اس خصوصیت کا حامل ہونے کی بنیاد پر کہ وہ اس کا نمائندہ ہے، اس کی مرضی کو جانتا ہے، اس کی طرف سے خصوصی علم و فہم اور نورِ بصیرت اسے میسر ہے وہ خدائی احکام کی روشنی میں قانون بنا سکتا ہے اور وہ دوسرے انسانوں پر اسی طرح واجب العمل ہوں گے جس طرح کہ وہ خدا کے احکام پر عمل کرتے ہیں کیونکہ اس حالت میں وہ اپنی ذات کی اطاعت نہیں کرواتا، بلکہ اپنی اس خصوصی حیثیت کی وجہ سے اطاعت کرواتا ہے کہ اس کی اطاعت دراصل خدا کی اطاعت ہے۔ قانونی امور میں خدا اور رسول کی اس غیر مشروط اطاعت کے بعد کسی انسان کو دوسرے انسان پر کوئی مطلق قانونی اقتدار حاصل نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ اقتدار خدا کی اطاعت میں ہو، جیسے حاکم کو رعیت پر، یا باپ کو اولاد پر، اس میدان میں اس کا کام مجرد اطاعت کرنا ہے۔'' (۳۲)

موجودہ جمہوری نظام میں عوام اپنے ووٹوں کا استعمال کرکے ایک پارلیمنٹ کی تشکیل کرتے ہیں۔ عوام کی اس منتخب کردہ

---

۳۰) ڈاکٹر صاحب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں، پھر جامعہ پنجاب کے شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں بطور سینئر مدیر تحقیقی مناصب پر فائز رہے ہیں۔ آپ معروف عالم دین اور دینی سکالر ہیں۔

۳۱) عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون، ادارہ ترجمان القرآن، (پرائیویٹ لمیٹڈ) اردو بازار، لاہور، نومبر ۱۹۸۹ء، ص ۷۹۔

۳۲) ایضاً، ص ۸۰-۸۱

اسمبلی یا پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ کی کیا حیثیت ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب رقمطراز ہیں:

چونکہ آبادی کی کثرت کی بناء پر یہ عملاً ممکن نہیں ہے کہ عوام اپنے سیاسی اور قانونی حقوق براہِ راست استعمال کرسکیں اس لیے نیابتی جمہوریت کے تصور نے فروغ پایا ہے۔یعنی عوام اپنے ووٹوں سے نمائندے چنتے ہیں اور پھر یہ نمائندے پارلیمنٹ کے اندر عوام کی نمائندگی کرتے ہیں، پارلیمنٹ میں اکثریت رکھنے والی پارٹی حکومت بناتی ہے اور اقلیتی ممبران اپوزیشن تشکیل دیتے ہیں، عصرِ حاضر کی پارلیمنٹیں ریاست کا مقتدر ترین ادارہ سمجھی جاتی ہیں اور قانون سازی اور حکومت کے انتظامی اور مالی امور کی نگرانی اس کے اہم فرائض سمجھے جاتے ہیں۔(۳۳)

جہاں تک اسلام کے سیاسی نظام کا تعلق ہے،ہم ابھی واضح کر چکے ہیں کہ اس میں عوام کی صحیح پوزیشن کیا ہے،اب جہاں تک عوام کے نمائندہ اداروں کا تعلق ہے تو اسلام کے سیاسی نظام میں مجلس شوریٰ کا تصور موجود ہے، کیونکہ مسلمانوں کو مشاورت کا حکم دیا گیا ہے اور اس حکم کی تعمیل میں خود آنحضورﷺ نے مشاورت کا باقاعدہ اہتمام کیا ہے اور آپﷺ کے بعد خلفاء راشدین خصوصاً حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانے میں اس کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔اس میں تو ظاہر ہے کوئی کلام نہیں کہ جہاں تک شوریٰ کی ہیئت (Form) کا تعلق ہے وہ اس زمانے کے خصوصی حالات کے مطابق تھی۔یعنی شوریٰ کے ممبروں کا باقاعدہ انتخاب نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ صاحبِ علم صحابہ کرام اور قبیلوں کے شیوخ وسرکردہ افراد پر مشتمل تھی،خلیفہ بوقت ضرورت ان کو بلاتا تھا اور وہی صدارت کرتا تھا۔

چونکہ پاکستان میں سیاسی اور قانونی نظام مغربی جمہوریت کی طرز پر وجود میں آیا اور اسی طریقے پر اس کی نشو ونما ہوئی، لہٰذا اسلام کے سیاسی اور قانونی نظام کا تصور لوگوں کو اجنبی اور نامانوس لگتا ہے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام اقتدار ہے چونکہ وہ مغربی تعلیم وتمدن کے تربیت یافتہ ہیں، لہٰذا وہ اس خول کو توڑ کر باہر نہیں نکل سکتے۔ ہمارے ہاں اس وقت جو بعض اسلامی شقیں دستور میں نظر آتی ہیں وہ حکمران طبقوں کو مجبوراً رکھنی پڑی ہیں اور اسلامی عناصر کی مزاحمت اور جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔اسلام کے سیاسی اور قانونی نظام کے حوالے سے دیکھیں تو ہمارے موجودہ نظام میں کوئی بات اسلامی نظر نہیں آتی اور جیسا کہ ہم پچھلے باب میں اشارہ کر چکے ہیں کہ خلفاء راشدین کے زمانے میں سیاسی نظام اپنی مطلوبہ شکل میں نافذ تھا لہٰذا مثال دینے کے لیے ہمیشہ اس شوریٰ میں دو حلقہ ہائے کار تھے، خالص علمی اور فقہی بحثوں کے لیے فقہاء صحابہ (جو مجتہدین تھے) اور عمومی امور میں غور و بحث کے لیے وہ صحابہ جو علم میں اتنی گہری دسترس تو نہ رکھتے تھے،لیکن ضروری عمومی علم رکھنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے معززین اور قبیلوں کے سربرآوردہ لوگ تھے، بارسوخ، تجربہ کار، جہاں دیدہ، متقی اور پرہیزگار تھے، لہٰذا اس سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اہل شوریٰ میں تین خوبیاں ہونی چاہئیں۔(۳۴)

۱۔ علم۔

۲۔ تقویٰ۔

۳۔ عوامی اعتماد کا حامل ہونا۔

لیکن مغرب کا سیاسی نظام پہلی دو شرطوں کو سرے سے مانتا ہی نہیں اور تیسری شق کو وہ مانتا تو ہے، لیکن ہمارے سیاسی

---

۳۳) ایضاً۔

۳۴) ایضاً، ص۸۳-۸۶

بزرجمہروں نے اپنے مفادات کی خاطر اس کی بھی مٹی پلید کر دی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا سیاسی نظام دین اور دنیا دونوں کے نقطہ نظر سے بانجھ ہے۔

تقویٰ کی شرط اگر آپ امیدواران اسمبلی کے لیے رکھنا چاہیں، تو لوگ مذاق اڑاتے ہیں کہ کیا ہم نماز اور روزے کے سرٹیفکیٹ پیش کریں بلکہ ہمیں حیرت ہے کہ ملک کی دینی جماعتیں بھی اس کی مخالفت کرتی ہیں آج سے پیشتر تو کسی حکمران نے آج تک اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے یہ عندیہ ظاہر ضرور کیا تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ کریں گے، لیکن عملاً انہوں نے بھی کچھ نہیں کیا اور مغربی جمہوریت کے مطابق یہ بات ووٹروں کی پسند پر چھوڑ دی۔" (۳۵)

جہاں تک علم کی شرط کا تعلق ہے یہ ایک بنیادی اور انتہائی اہم شرط ہے اور قرآن وسنت کی رو سے یہ عین مطلوب ہے۔ چونکہ شوریٰ میں عام سیاسی اور انتظامی امور کے علاوہ فقہی اور دقیق علمی مسائل بھی پیش ہوتے ہیں، اس لیے اس امر کا انتظام انتہائی ضروری ہے کہ شوریٰ میں اگر سب نہیں تو ارکان کی کچھ تعداد ایسی ضرور ہونی چاہیے جو اجتہاد کی اہل ہو، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب قریش کے بزرگوں نے اعتراض کیا کہ شوریٰ کی مجالس میں معززین و مدبرین کے ساتھ ایک نوعمر "لڑکا" (حضرت ابن عباسؓ) کیوں شریک ہوتا ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان بزرگوں کو بھی بلایا اور اس "لڑکے" کو بھی بلایا اور امتحاناً دونوں سے ایک سوال پوچھا۔ "بزرگ" نہ بتا سکے اور لڑکے نے صحیح جواب دے دیا تو آپ نے ان بزرگوں کو بتایا کہ میں اس "لڑکے" کو اس کے علم کی وجہ سے بلاتا ہوں، چنانچہ وہ خاموش ہو گئے۔

جہاں تک تیسری شرط کا تعلق ہے مغرب کے سیاسی نظام میں یہ موجود ہے اور مغرب میں جو لوگ پارلیمنٹ میں پہنچتے ہیں وہ عموماً عوام کے صحیح نمائندے ہوتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں یہ شرط بھی عملاً مفقود ہے کیونکہ ہمارے ہاں انتخاب اور نمائندگی کا ایسا نظام وضع کیا گیا ہے اور اس پر اس طریقے سے عمل درآمد ہوتا ہے کہ صحیح رائے عامہ کبھی اوپر نہیں آ سکتی، مفاد پرست لوگ انتخابی حلقے اپنی مرضی سے بنواتے ہیں، انتخابی فہرستوں میں گڑبڑ کرتے ہیں، الیکشن میں جن کی ڈیوٹیاں لگی ہوتی ہیں ان کو خریدا جاتا ہے یا ڈرا دھمکا کر خاموش کروایا جاتا ہے، پھر سرمائے کے زور پر ووٹ خریدے جاتے ہیں، بوگس اور جعلی ووٹ بھگتائے جاتے ہیں، سرمایہ دار مزدوروں پر اور جاگیردار مزارعوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، برادریوں، قبیلوں اور مذہبی فرقوں کے نام پر ووٹ لیے جاتے ہیں اور عوام کی حقیقی رائے عامہ ان مصیبتوں کے نیچے دب جاتی ہے اور عوام کے حقیقی نمائندوں کی بجائے ہماری اسمبلیوں پر ہمیشہ جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور بیوروکریٹس کا قبضہ رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب اسمبلی میں اکثریت ان کی ہوتی ہے تو قانون سازی بھی انہیں کی مرضی سے ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ آج تک اسمبلیوں کے ذریعے کبھی کوئی اسلامی قانون نہیں بنا اور نہ ہی اسلام کے حق میں کبھی کوئی فضا بنی۔ بلکہ ہماری اسمبلیوں نے ہمیشہ اسلامی قوانین کی مخالفت ہی کی ہے اور اگر کبھی کوئی کام اسلام کے حق میں ہوا بھی ہے تو بدرجہ مجبوری، اسلامی عناصر کے دباؤ کے تحت یا ان کے ساتھ کچھ لو اور کچھ دو کی صورت میں سیاسی سمجھوتہ کرتے ہوئے یا کبھی مشکل وقت میں عوام کو خوش کرنے کے لئے سیاسی چال کے طور پر۔ (۳۶)

ان حالات میں یہ کہنا کہ ہماری اسمبلیوں کو ان کی موجودہ ہیئت میں حق اجتہاد (یعنی حق قانون سازی) ہونا چاہیے، انتہائی کمزور اور بے وزن بات ہے۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اجتہاد (قانون سازی) کر سکیں اگرچہ اصولی طور پر شوریٰ (یا

---

۳۵) ایضاً۔

۳۶) ایضاً۔

پارلیمنٹ) ہی وہ ادارہ ہے جسے اسلامی ریاست میں اجتماعی حق اجتہاد حاصل ہوتا ہے۔(۳۷)

۴۔ حنفی مکتبِ فکر کا نقطۂ نگاہ:

مکتب اہل حدیث ہی کی طرح برعظیم پاک و ہند میں سب سے زیادہ اشاعت پذیر مسلک ...... یعنی حنفی مسلک (یعنی دیوبندی و بریلوی) سے متعلق علماء کی اکثریت بھی ...... پارلیمنٹ کو حق اجتھاد دینے کی مخالف ہے۔ اس حوالے سے، ان کا موقف و مسلک ان کے مختلف مدارس کے علماء کے خیالات سے واضح ہوتا ہے، جو کہ ...... اس مقالے کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہیں ...... (۳۸)

ذیل میں اسی مسلک سے تعلق رکھنے والے ایک معتبر شخصیت ڈاکٹر محمود الحسن عارف کی تفصیلی رائے پیش کی جارہی ہے۔

ڈاکٹر محمود الحسن عارف کا نقطۂ نظر:

پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے حوالے سے ڈاکٹر محمود الحسن عارف (۳۹) نے ''پارلیمنٹ اور اجتھاد'' کے عنوان پر مقالہ تحریر کیا جس میں انہوں نے اس موضوع کا تفصیلی جائزہ اور محاکمہ کیا ہے، انہوں نے بھی ''حق اجتہاد'' کے لیے اہلیت اور معیار پر زور دیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

(ا) اجتہاد کی اہلیت کا معیار کیا ہے؟

(ب) بطور مقننہ مجلس شوریٰ (قومی اسمبلی اور سینٹ) کس طرح اپنا قومی اور ملکی کردار ادا کرسکتی ہے؟ (۴۰)

بعدازاں انہوں نے دونوں امور پر الگ الگ گفتگو کی ہے ...... چنانچہ اجتہاد کی اہلیت کے حوالے سے لکھا ہے:

''ہمارے ملک میں خصوصاً اور دوسرے اسلامی ممالک میں عموماً عرصہ دراز سے جو سوال زیر بحث ہے اور موجودہ حالات کے تناظر میں جسے اہم ترین مسئلہ (Burning Question) کہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ پورے ملک کے لیے قابل قبول فقہ (قانون) تیار کرنے میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے ''مجلس شوریٰ'' (Parliament) کا کیا کردار ہے اور یہ کہ آیا اسے اجتہاد کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ اس ایک سوال میں درحقیقت دو سوال پوشیدہ ہیں:

ا۔ اجتہاد کی اہلیت کا معیار:

اجتہاد کے ضمن میں پہلی لازمی شرط مجتہد میں مطلوبہ اہلیت اور صلاحیت کی موجودگی ہے، اسی لیے اگر کسی مسئلے کا قیاس کسی نااہل شخص نے کیا اور اس نے مطلوبہ شرائط پوری نہ کی ہوں تو اس کا اجتہاد بجائے شرعی ہونے کے غیر شرعی ہوگا اور فائدہ مند ہونے کے برعکس نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اسی لیے قریباً قریباً اجتہاد کی ضرورت و اہمیت پر لکھنے والے تمام متقدر علماء نے اس کی اہلیت وغیر

---

۳۷) ایضاً۔

۳۸) دیکھیے ...... ۱۴۸-۱۵۸۔

۳۹) ڈاکٹر صاحب، صدر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے سربراہ، معروف اسلامی اسکالر، بادشاہی مسجد کے سابق اعزازی خطیب اور متعدد کتب کے مؤلف ہیں۔ اس حوالے سے ان کا مضمون جو منہاج رسالے میں چھپا بہت پسند کیا گیا، اور بعدازاں اسے مولانا مجیب اللہ ندوی نے اعظم گڑھ (انڈیا) سے شائع ہونے والے اپنے رسالے ...... الرشاد میں نقل کیا۔ اسی طرح جامعہ اشرفیہ کے ''الحسن'' میں بھی یہ مضمون کئی قسطوں میں چھپا ......

۴۰) ڈاکٹر محمود الحسن عارف، پارلیمنٹ اور اجتہاد، در سہ ماہی منہاج، دیال سنگھ ٹرسٹ، لاہور ۱۹۹۱ء، شمارہ بابت ماہ جنوری۔ اپریل، ص ۱۱۶-۱۱۷

اہلیت کے مسئلے پر خصوصی توجہ مبذول کی ہے۔

متجددین کا خیال ہے کہ یہ شرائط بہت سخت اور کڑی ہیں اور یہ کہ اجتہاد کی ہر شخص کو اجازت ہونی چاہیے۔ لیکن شریعت اور احکام شریعت کی حفاظت نیز مجتہد کے اجتہاد کردہ احکام کی کماحقہ قبولیت کے لیے ان کی شرائط پابندی ضروری ہے۔ ورنہ تو ہر شخص جو اس کے منہ میں آئے گا کہے گا، اور کوئی کسی کو روکنے ٹوکنے والا نہ ہوگا۔

ان کی پابندی اس لیے بھی لازمی ہے کہ اسلام میں ''قانون سازی'' کا حق فقط اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق ﷺ کے ساتھ مختص ہے۔ کوئی اور شخص، خواہ وہ خلیفۂ وقت یا اسلامی دنیا کا سب سے بڑا عالم اور مفتی کیوں نہ ہو، علی الاطلاق اجتہاد نہیں کرسکتا اور اس کی من پسند باتیں قانون شریعت کا درجہ حاصل نہیں کرسکتیں۔ اس کے بجائے، ہر مجتہد کو ایک خاص حد میں رہتے ہوئے اجتہاد کرنے کا حق عطا کیا گیا ہے اور وہ خصوصی حد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات عالیہ ہیں۔ مجتہد جب بھی اجتہاد کے ذریعے قانون سازی کرے گا، تو اسے ناگزیر طور پر ان منابع شریعت سے استفادہ کرنا ہوگا اور یہ استفادہ اس وقت تک ممکن اور سہل الحصول نہ ہوگا، جب تک کہ اسے مذکورہ بالا امور میں درک حاصل نہ ہو اور وہ اس طریقے اور اس کے علمی تقاضوں سے واقف نہ ہو، جن کے ذریعے اجتہاد کی شرعاً اجازت دی گئی ہے۔ (۴۱)

بعد ازاں ڈاکٹر عارف صاحب نے پھر مجتہدین کے کئی مراتب اور کئی طبقات کا ذکر کیا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

پھر اجتہاد کی اہمیت کے پیش نظر مجتہدین کی حسب ذیل درجہ بندی کی گئی ہے:

ا۔ مجتہد مطلق:

مجتہد مطلق سے مراد ایسا فقیہ ہے، جو قرآن و سنہ سے استفادے اور اخذ احکام کے لیے نہ صرف آزادانہ اجتہاد کرے، بلکہ اپنے اجتہاد و استنباط کے لیے بھی اپنے اصول و ضوابط کا خود ہی تعین کرے۔ یہ لوگ اس بارے میں کسی امام یا فقیہ کے پابند نہیں ہوتے۔ اس گروہ میں ائمہ اربعہ اور پہلی اور دوسری صدی ہجری کے اکابر مجتہدین شامل ہیں۔ (۴۲)

ب۔ مجتہد منتسب:

مجتہد منتسب سے مراد ایسے ائمہ کرام ہیں، جو اپنے امام کے اکثر و بیشتر دلائل کو برقرار رکھتے ہوئے ان کی روشنی میں آزادانہ اجتہاد کریں۔ اس نوع کے تحت ائمہ اربعہ کے قریبی شاگرد اور نامور مجتہدین شامل ہیں۔ (۴۳)

ج۔ مجتہد فی المذہب:

یہ لوگ عمومی احکام و مسائل میں تو اپنے امام کی تقلید کرتے ہیں لیکن جب کوئی نیا واقعہ یا مسئلہ پیش آجائے تو اپنے امام کے اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کر کے، اس کا حکم تلاش کرتے ہیں۔ جیسے حنفی فقہاء میں سے امام طحاوی، امام السرخسی، الجصاص رازی وغیرہ۔ (۴۴)

(۴۱ ایضاً ص ۱۱۷–۱۱۸، بحوالہ شاہ ولی اللہ، عقد الجید، فی احکام الاجتہاد، ص ۱۵

(۴۲ عقد الجید، ص ۱۵ تا ۱۷؛ ڈاکٹر محمود الحسن عارف، پارلیمنٹ اور اجتہاد (مطبوعہ سہ ماہی منہاج، نفاذ شریعت نمبر، شمارہ ۱-۲، جنوری، اپریل ص ۸۶-۹۱۔

(۴۳ بحوالہ عقد الجید، ص ۱۵ تا ۱۷

(۴۴ پارلیمنٹ اور اجتہاد، ص ۱۲۰–۱۲۱

د۔ مجتہد فی الفتویٰ:

یہ وہ لوگ ہیں، جو اپنے مسلک کی پابندی کرتے ہوئے، اپنے امام یا ان کے شاگردوں یا بعد کے مجتہدین کے اقوال کو ایک دوسرے پر ترجیح دینے کی اہلیت رکھتے ہیں، عام طور پر ان حضرات کے لیے "مفتی" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔(۴۵)

اس تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ اجتہاد کے لیے نہ صرف اعلیٰ پائے کے علم کی ضرورت ہے، بلکہ اس کے لیے علم میں رسوخ اور وسیع تجربے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اس لیے کہ جس شخص کو اپنے اصول کار کا علم نہیں ہے، یا اسے دوسرے فقہاء کے اقوال کا پتہ نہیں ہے۔ اسے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور راستے سے بھٹکانے کے لیے کھلی چھٹی نہیں دی جاسکتی؟

۲۔ بطور مقننہ پارلیمنٹ کا کردار:

انہوں نے آگے چل کر اس سوال کا بھی جائزہ لیا ہے کہ ان حالات میں پارلیمنٹ کی کیا اہمیت ہے:

رہا یہ سوال کہ اگر مذکورہ بالا اہلیت کو مدار ٹھہرایا جائے، تو پھر مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کا بطور مقننہ (Legislative) کیا کردار رہ جاتا ہے؟

حالانکہ کسی بھی ملک میں پارلیمنٹ کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے یہی وہ واحد ادارہ ہے جس پر پورے ملک کے لوگ، اپنے ووٹ کا حق استعمال کر کے اعتماد کا اظہار کرتے ہیں اور جس میں ملک کے ہر گوشے اور قریب قریب ہر اہم طبقے کی نمائندگی ہوتی ہے، لہٰذا اگر کوئی مسئلہ اس ادارے کے ذریعے حل کیا جائے تو اس پر ایک طرح سے پوری قوم متفق ہو سکتی ہے۔

اس پس منظر میں "قانون سازی" کے لیے مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے اساسی کردار کو نہ تو نظر انداز کرنا ممکن ہے اور نہ ہی اس سے الگ تھلگ کوئی اور راہ ڈھونڈھنا مناسب ہے، لہٰذا اگر قوم کسی متفقہ فقہ یا قانون کی خواہش مند ہے تو اس کے لیے اس ادارے پر اظہار اعتماد کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا۔

تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ادارے کے ذریعے نہ تو فی الوقت درجۂ اجتہاد پر فائز اہل علم منتخب ہو رہے ہیں اور نہ ہی مستقبل قریب یا بعید میں ایسا ہونا ممکن نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاست کے میدانِ کارزار میں جن لوگوں کے جھنڈے نصب ہیں اور جو لوگ کسی نہ کسی پارٹی کے ساتھ وابستہ ہو کر ہر صورت میں اسمبلی کی ایوان تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی اہلیت و صلاحیت کا معیار کچھ اور ہو تو ہو مگر "فقہی علم" قطعاً نہیں ہے اور انہیں احادیث کے متعلق ضروری ضروری باتیں بھی معلوم نہیں ہوتیں۔ ان میں سے پڑھے لکھے وہ لوگ کہلاتے ہیں جو ایک انگریزی زبان میں بولنے اور لکھنے کی مشق بہم پہنچا لیتے ہیں۔(۴۶)

۳۔ کسی عہدے پر فائز شخص کا حق اجتہاد:

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ذمہ دار عہدے پر فائز ہو جائے، تو کیا اسے بہر صورت اجتہاد کا حق بھی حاصل ہو جائے گا...... اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

عہدوں اور مناصب کے حوالے سے کسی کو مرتبہ اجتہاد پر فائز کرنے کی یہ کوشش انتہائی خطرناک ہی نہیں، بلکہ اسلامی تاریخ کے مسلمہ شواہد و واقعات کے بھی سراسر خلاف ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ سلسلہ آج بحال کر دیا جائے اور یہ باور کر لیا جائے کہ جس

---

۴۵) ایضاً، ص ۱۲۱-۱۲۱

۴۶) ایضاً، ص ۱۲۲-۱۲۳

شخص کو پچاس ہزار، یا ایک لاکھ انسانوں نے اپنی ترجمانی کے لیے منتخب کرلیا ہے، اسے اجتہاد کا حق حاصل ہو گیا ہے اور وہ جس طرح کا چاہے اجتہاد کرسکتا ہے، تو پھر یزید بن امیر معاویہؓ، حجاج بن یوسف اور عبیداللہ بن زیاد جیسے لوگوں کا کیا قصور ہے کہ انہیں مجتہد مطلق تسلیم نہ کیا جائے اور ان کے سیاسی مخالفین کو، جن میں بہت سے نامور صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی ہیں۔ ان کے اجتہاد سے انحراف کرنے کا کیوں نہ مجرم تصور کیا جائے؟ اسی طرح یزید کے متعلق ہمیں متعدد تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ تین افراد کے سوا تمام لوگوں نے اس کی بیعت کر لی تھی اور بیعت کرنا ووٹ دینے سے اظہار اعتماد کا زیادہ مؤثر طریقہ ہے، لیکن اگر اس اظہار اعتماد کے باوجود اسے شرعی معاملات میں ''مجتہد'' تسلیم نہیں کیا جاتا، بلکہ اس پر امور شریعت سے انحراف کرنے کا الزام لگایا گیا ہے، تو اس سے ثابت ہوا کہ محض ''انتخاب'' یا ''اظہار اعتماد'' کسی فرد کو درجہ اجتہاد تک پہنچانے کا ذریعہ نہیں ہے، لہٰذا اس پہلو سے ''مجلس شوریٰ'' (قومی اسمبلی) کو محض اس کے منتخب ہونے کی بنا پر اجتہاد کا حق نہیں دیا جا سکتا، البتہ چونکہ اس کی حیثیت مقننہ (Legislative) کی بھی ہے، لہٰذا اسے ایک خاص حد میں رہتے ہوئے اپنے اس حق کے استعمال کرنے کا مجاز تصور کیا جا سکتا ہے۔ (۴۷)

۴۔ پارلیمنٹ کی قانون سازی کی حدود:

جہاں تک پارلیمنٹ کی قانون سازی کی حدود کا تعلق ہے تو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

اسلامی شریعت میں پارلیمنٹ کی قانون سازی کو ابتداءً دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) عمومی نظم و نسق

(ب) خصوصی شرعی قانون سازی (۴۸)

ان میں سے ہر ایک کی تفصیل درج ذیل ہے:

(الف) عمومی نظم و نسق سے متعلق قانون سازی:

باوجودیکہ شریعت اسلامیہ ''قانون الٰہی'' ہے پھر بھی اسلامی حکومتوں کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ''رفاہِ عامہ'' کے پیشِ نظر شریعت طیبہ نے مسلمان حکمرانوں کو براہ راست قانون سازی کے خصوصی اختیارات تفویض کیے ہیں، ہمارے اس زمانے میں چونکہ حکمرانوں کا ''حق قانون سازی'' پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کو تفویض کر دیا گیا ہے اور حکمرانِ وقت ذاتی حیثیت میں کسی قسم کی قانون سازی کا مجاز نہیں ہے، اس لیے ہم شریعت کے حکمرانوں کو تفویض کردہ قانون سازی کے اختیارات کا، انہی کو نمائندہ اور ترجمان قرار دے سکتے ہیں۔

اس قسم کی قانون سازی کا جواز اور عوام الناس کے لیے جائز اور قانونی حدود میں رہتے ہوئے اس کا واجب الاتباع ہونا قرآن وسنۃ اور اجماع کی تینوں دلیلوں سے ثابت ہے۔

اسی طرح اجماع امت سے بھی اسی موقف کی تائید ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ہر دور میں مسلم حکمرانوں اور خلفائے نے بہت ایسے معاملات ومسائل میں اجتہاد کیا اور غور وفکر سے احکام صادر کیے جو انہیں وقتی ضروریات کے لحاظ سے اکثر پیش آیا کرتے تھے اور

---

(۴۷) ایضاً، ص ۱۲۳-۱۲۶

(۴۸) ایضاً، ص ۱۲۳-۱۲۶

چونکہ امت نے اجماعاً ان کے اس حق کو تسلیم کیا، اس لیے ان کا یہ حق اب شرع اسلامی کا ایک جزو بن گیا ہے۔(۴۹)

آگے چل کر انہوں نے ان امور کی تفصیل بھی دی ہے۔ جن میں بقول ان کے پارلیمنٹ کو قانون سازی کا حق اسلام نے تسلیم کیا ہے۔

ایسے امور میں مختلف محکمہ جات کا قیام، ان کے لیے کارکن عملے کا تقرر، محکمہ جاتی اختیارات وحدود کی تعیین، محصولات وغیرہ کی تشخیص، خراج اور ارضی محصولات کی وصولی، جیل خانوں کی تنظیم وتاسیس، مختلف علاقوں کا انتظامی عملہ وغیرہ کی تقرری اور امن وامان کے قیام وغیرہ کے امور شامل ہیں۔ ان کے علاوہ "سیاست شرعیہ" (قانون تعزیرات) بھی اسی فہرست کا حصہ ہے، جس میں سے بطور خاص محتسب کے فرائض اور دیگر احتسابی عملے کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس نوع کے احکام کا مقصد امن وامان کا قیام اور لوگوں کے معاملات کی تنظیم وتدبیر سے ہے، اس لیے یہ تمام امور ان کے دائرۂ اختیار میں آتے ہیں، کہ پارلیمنٹ جس قسم کا مناسب سمجھے، بحث وتمحیص اور غور وفکر کے بعد فیصلہ صادر کرے۔ ایسے ہر فیصلے کی پابندی اسی طرح لازمی ہوگی، جس طرح کہ دیگر احکام شریعت کی پابندی لازم ہے۔(۵۰)

اس تفصیل سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ "پارلیمنٹ" کو امن وامان کے قیام، نظم ونسق کی تدبیر وتنظیم اور محصولات وغیرہ کی تعیین وتنفیذ کے لیے لامحدود اختیارات حاصل ہیں، وہ اپنے ان اختیارات کا قانون سازی کے ذریعے اظہار ونفاذ کرسکتی ہے۔ تاہم اس مقصد کے لیے بھی مناسب ہوگا کہ پارلیمنٹ کی معاونت اور رہنمائی کے لیے ماہرین قانون اور جید علمائے کرام پر مشتمل ایسی کمیٹی یا بورڈ تشکیل دیا جائے، جو ان معاملات میں قرآن وسنۃ کی روشنی میں حدود کار کی تعیین کرے اور پارلیمنٹ کے کام کو آسان بنائے جیسا کہ علامہ المحمصانی اپنی کتاب فلسفۃ التشریع الاسلامی میں تحریر فرماتے ہیں:

"سلطانِ وقت کے شرعی اختیارات کے مقرر کردہ حدود اور شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ انتظامی امور میں اہل بصیرت سے مشورہ لے، جیسا کہ اس آیت میں مذکورہ ہے کہ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (اے رسول! آپ مسلمانوں کے معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہا کریں) اور (دوسری جگہ فرمایا): وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ، (یعنی مسلمانوں کا معاملہ باہمی مشورہ سے طے ہونا چاہیے) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے

روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ بعض معاملات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے مشورہ فرمایا کرتے تھے، اور آنحضرت ﷺ کے بعد ائمہ مجتہدین ایسے جائز معاملات میں جن کے لیے قرآن وحدیث میں ایسا حکم نہ ملتا تھا۔ جسے اساس قرار دے سکیں، تو وہ دیانت دار اہل علم سے مشورہ لیتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق خاص طور پر مذکور ہے کہ وہ دوسروں سے مشورہ لیتے اور استصواب رائے میں سب سے زیادہ مشہور تھے۔"(۵۱)

(ب) خصوصی شرعی قانون سازی:

الغرض ملک وملت کے وسیع تر مفاد میں، یہ بات عین قرین انصاف ہے کہ ایسے معاملات میں بھی پارلیمنٹ حتمی فیصلہ کرنے سے قبل ماہرین قانون اسلامی سے بھی مشاورت لے اور اس کی روشنی میں حتمی فیصلہ کرے۔

---

۴۹) ایضاً

۵۰) ایضاً

۵۱) ایضاً

خصوصی شرعی قانون سازی سے مراد یہ ہے کہ پارلیمنٹ کسی ایسے مسئلے میں قانون سازی کرے، جس کا تعلق خالصتاً شریعت اسلامیہ سے ہو۔ اسے مزید دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: اولاً ایسے احکام و مسائل جن کا شریعت اسلامیہ میں قطعی اور دوٹوک فیصلہ موجود ہو، ثانیاً ایسے احکام و مسائل جن کے متعلق ہمیں دوٹوک فیصلہ نہ ملتا ہو، یا فیصلہ تو موجود ہو، البتہ اس کی توضیح وتشریح کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہو۔

اگر تو اس کا تعلق ایسے احکام و مسائل سے ہو، جن کے متعلق قرآن و سنۃ یا اجماع اُمت نے قطعی فیصلہ صادر کر دیا ہو، تو ایسے مسئلے میں پارلیمنٹ کو قطعاً قانون سازی کا حق حاصل نہیں ہے اور اگر اس نے ایسا کیا تو یہ اسلام کے خلاف کھلم کھلا بغاوت ہوگی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مقابلے میں اسلام ہمیں کسی بھی طاقت کے سامنے سر جھکانے اور اس کی بات من وعن تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

انما الطاعة فی المعروف.

''حاکم کی اطاعت تو فقط نیک کاموں میں ہی کرنی چاہیے۔''

اسی طرح ایک اور حدیث نبوی میں ارشاد ہے:

لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق. (۵۲)

''بندے پر ایسے کسی حکم کی تعمیل ضروری نہیں، جس میں خدا کی نافرمانی لازم آتی ہے۔''

ان ارشادات نبویہ سے قطعی طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ''دینی اور شرعی معاملات میں مسلمان'' پہلے اپنے خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل کرتا ہے اور ثانیاً اپنے حکمرانوں کے احکام کی۔ اگر حاکم کوئی ایسی بات کرنے کو کہے جو قرآن و سنہ کی نصوص سے متصادم ہو تو مسلمان اپنی جان پر تو کھیل سکتا ہے، مگر خدا اور سول کے احکام کی نافرمانی کا تصور نہیں کر سکتا۔

لیکن اگر اس مسئلے میں شریعت طیبہ میں کوئی حکم نہ ملتا ہو، مثال کے طور پر، ہیروئن فروش یا ہیروئن نوش وغیرہ کی سزا وغیرہ۔ یا پھر اس کا حکم تو موجود ہو، البتہ اس کی توضیح وتشریح درکار ہو، مثال کے طور پر زکوٰۃ، دیت، سرقہ اور مہر وغیرہ کے نصاب کا مسئلہ، یا مسکین اور فقیر وغیرہ کی توضیح وتشریح کا حکم کہ ان امور کا اگرچہ قرآن مجید میں ذکر موجود ہے، لیکن چونکہ ان کا تعلق نقدی سے ہے، اس لیے اپنے دور کے تقاضوں یا کرنسی کے ریٹ وغیرہ کی روشنی میں ان کے نصاب کی تعیین وتشریح کی گنجائش موجود ہے اور چونکہ ان کی توضیح وتشریح ان احکام سے متصل ہوگی، لہٰذا اس طرح یہ قانون سازی ''حدود شریعت'' میں داخل ہے۔

دوسری طرف ''ممبران پارلیمنٹ'' کا اپنا اسلامی ذہن یا ان کے پاس دینی معلومات کا ذخیرہ نہیں ہوتا، لہٰذا وہ اجتہاد و استنباط کے اساسی قواعد وضوابط اور مآخذ اربعہ (قرآن، سنہ اجماع اور قیاس) سے بے بہرہ ہونے کی بنا پر ان سے استفادہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، اس لیے اگر یہاں بھی انہیں اجتہاد اور قانون سازی کا حق دے دیا جائے تو اس سے دوررس منفی اثرات پیدا ہوں گے۔ دوسری طرف انہیں اس حق سے محروم کرنا بھی قوم و ملک کے وسیع مفاد کے خلاف ہوگا۔ اس لیے اس مسئلے کے حل کے لیے درمیانی راہ اختیار کرنا ناگزیر ہوگا۔ (۵۳)

درمیانی راہ یہ ہے کہ حکومت نامور علمائے دین اور ماہرین پر مشتمل ایسی کمیٹی یا بورڈ (Board) تشکیل دے، جو ''اجتہاد''

---

۵۲) فلسفۃ التشریع الاسلامی، ص ۲۹۳-۲۹۴، بحوالہ اعلام الموقعین، ۱: ۰۷

۵۳) السیوطی: جامع الصغیر، (حدیث ۳-۹۹) بحوالہ مسند احمد بن حنبل اور مستدرک حاکم

کے درجے پر فائز ہوں اور ملک کے دینی و مذہبی حلقوں میں نیک نام بھی ہوں، ان کی یہ تقرری نہ تو سیاسی بنیادوں پر ہو اور نہ ہی فرقہ وارانہ اساس پر، بلکہ ان کی نامزدگی خالصتاً علمی اور تحقیقی بنیادوں پر ہو۔ یہ لوگ لومۃ لائم کی پروا کیے بغیر دینی امور کی انجام دہی میں نیک شہرت کے مالک ہوں۔

پھر جیسے ہی حکومت قانون کا کوئی مسودہ تیار کرے، تو سب سے پہلے اس بورڈ کے سامنے پیش کرے اور اس سے مشاورت اور رائے لینے کے بعد، اسے حتمی اور قطعی منظوری کے لیے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرے۔ اس طرح بالواسطہ طور پر پارلیمنٹ اپنے اجتہاد اور قانون سازی کے حق سے محروم بھی نہیں ہوتی اور اس کے ساتھ ساتھ اجتہاد اور اس کے لوازم کی پابندی بھی ممکن حد تک کی جا سکتی ہے۔

فی الوقت ہمارے ملک میں اسلامی نظریاتی کونسل (Islamic Ideological Council) کے نام سے ایک ادارہ موجود ہے تاہم اس ادارے کو "عضو معطل" بنانے یا ایک حد میں محدود کر دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس ادارے کو پارلیمنٹ کے ساتھ وابستہ کیا جائے اور اس کی ماہرانہ آراء کو فوری طور پر قانون کا درجہ دے دیا جائے، جبکہ فی الوقت اس کونسل کو محض جزو معطل بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ "اسلامی نظریاتی کونسل" میں سیاسی یا فرقہ وارانہ بنیادوں پر جو تقرریاں اور نامزدگیاں کی جاتی ہیں، اس پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے، اس ادارے میں صرف اور صرف اہل لوگوں کا تقرر کیا جائے اور اس میں مختلف طبقوں کے لوگوں کو بھی نمائندگی دی جائے تا کہ اس کی سفارشات زیادہ مؤثر اور مربوط بنائی جا سکیں۔

یہ کونسل مختلف امور و مسائل میں باہمی مشاورت اور بحث و تمحیص کے علاوہ ملک کے مقتدر اور جید علمائے کرام اور حاضرین قانون سے بھی مشاورت کرے اور ان سب کی آراء سے استفادے کے بعد کامل غور و خوض کے ساتھ اپنی سفارشات مرتب کرے۔ اس کی سفارشات کو حکومت قانون کا درجہ دے کر ملک میں نافذ کرے۔ (۵۴)

۵- موازنہ و تجزیہ:

اس تفصیلی بحث سے درج ذیل امور واضح اور ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (م ۱۹۷۹ء) اور جماعت اسلامی پارلیمنٹ کو حق اجتہاد دینے کے سخت خلاف ہیں، اس لئے کہ پارلیمان میں آنے والوں کی اکثریت مجتہد کے معیار پر اور اس کے اوصاف و شرائط پر پورا نہیں اترتی۔ اور محض ان کا عوامی ووٹوں سے منتخب ہونا...... انہیں اجتہاد کا اہل ثابت نہیں کرتا۔

۲۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا موقف بھی مولانا مودودی کے قریب قریب ہے، اور انہوں نے لکھا ہے کہ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں قانون سازی اور افتاء کا کام حکومت کی تحویل اور ان کی مداخلت سے الگ رہا ہے اور عصر حاضر میں بھی یہی انداز اور یہی طریقہ زیادہ موزوں ہے۔

۳۔ مکتب اہل حدیث جن کی نمائندگی حافظ صلاح الدین یوسف کے ذریعے سے ہوئی، وہ بھی پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے سخت خلاف ہیں اور انہوں نے خود علامہ اقبالؒ اور ان کے حامیوں اور ان کے شارحین پر بھی، اس بنا پر شدید تنقید کی ہے کہ علامہ اقبال

---

۵۴) پارلیمنٹ اور اجتہاد، ص ۱۲۷-۱۲۸

کے خطبے میں شامل بنیادی نکات کی نفی کرتے ہوئے......ان کے موقف اوران کے دلائل کو......نا قابل اعتنا گردانتے ہیں۔انہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ خود علامہ اقبال نے بھی اپنی آخری عمر میں پارلیمنٹ کے اجتہاد کے اپنے موقف سے رجوع کر لیا تھا۔

۴۔ حنفی مسلک سے تعلق رکھنے والے تمام علماء بھی اس کے خلاف ہیں......جیسا کہ ڈاکٹر محمود الحسن عارف......جواردو دائرہ معارف اسلامیہ کے سربراہ اور معروف اسلامی اسکالر ہیں، اور ڈاکٹر محمد امین......دونوں نے ہی یہ موقف اختیار کیا ہے کہ چونکہ قرآن وسنت کی معیت میں جن سے کسی صورت میں بھی انحراف کی اجازت نہیں ہے اور مغربی طرز کی جمہوریت کے ذریعے دھونس اور دولت کے بل بوتے پر جو لوگ منتخب ہو کر سامنے آتے ہیں اور جہاں کسی مسئلے کا اس کے صحیح تناظر اور صحیح میرٹ پر فیصلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اکثریت کی بنیاد پر فیصلہ ہوتا ہے وہ ایسے افراد کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اجتہاد کا حق نہیں دیا جاسکتا۔البتہ پارلیمنٹ روزمرہ کے مسائل اور انتظامی وادارتی ، مالی معاملات میں حسب دستور اور حسب قانون

فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ جہاں کسی شرعی مسئلے کا تعلق ہو تو وہاں علامہ اقبالؒ کی اپنی تجویز کے مطابق علماء کی کونسل سے رائے لینا اور اس رائے کے مطابق پابندی کرنا ضروری ہے۔

۵۔ شیعی مکتب فکر بھی پارلیمنٹ کو حق اجتهاد دینے کے خلاف ہے، اس لیے کہ ان کے نزدیک اجتہاد کا حق......صرف ائمۂ معصومین کو حاصل ہے، اور امام غائب کے بعد، ان کے نمائندگان اور درجۂ مجتہد پر فائز افراد کو حاصل ہے۔اسی لیے، ایران میں......شیعی انقلاب کے بعد......"مجلس بزرگان" کے نام سے، ایک الگ کونسل بنائی گئی ہے، اور اسی مجلس کو......"آئین میں ترمیم" کرنے کے لیے، اس مجلس کا اتفاق ضروری ہے۔

۳۔ تاریخی تجزیہ:

اس کے علاوہ ہمارے ملک میں اسمبلیوں کی تاریخ......ایک طویل تاریخ رکھتی ہے اس پورے عرصے میں پاکستان کی پارلیمنٹ نے کبھی بھی کوئی فیصلہ استحقاق اور رعیت کی بنیاد پر نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ سیاسی دباؤ، حکومتی جماعت کی سیاسی اور قانونی مجبوریوں کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہے اور تاریخ میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ کڑوا سچ سننے کے بجائے پارلیمنٹ نے اپنے ہی اراکین کو محافظوں کے ذریعے ایوان سے باہر پھینکوا دیا۔ان کو پابند سلاسل کیا اور ایک ہی دن میں سیکڑوں شقوں پر مشتمل ترامیم کی منظوری دی۔خود شق B-58 دو دفعہ منظور کی جا چکی ہے اور ایک دفعہ اسے منسوخ کیا جا چکا ہے اور دوسری مرتبہ منسوخ کرنے کی تیاری کی جارہی ہے۔ایسی پارلیمنٹ اور ایسا ادارہ کس طرح قرآن وسنۃ کی روشنی میں اجتہاد جیسے عظیم کام کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے؟

❀❀❀

(ضمیمہ-الف)

پاکستان کے دینی مدارس کا موقف ومسلک

پاکستان میں اس وقت ہزاروں کی تعداد میں دینی مدارس موجود ہیں، یہ دینی مدارس ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور دینی معاملات اور شرعی امور میں پوری مہارت اور ممارست رکھتے ہیں۔اس لیے ان دینی مدارس کا نقطۂ نگاہ جاننا بھی بے حد ضروری تھا۔

ہم نے اپنے نگران ڈاکٹر محمود اختر صاحب کے ایماء پر بہت سے مدارس کو خطوط تحریر کیے (۱)......ان میں درج ذیل مدارس نے ان کے جوابات دیے:

۱- جامعہ نعیمیہ......گڑھی شاہو لاہور (۲)

۲- جامعہ قاسم العلوم، ملتان (۳)

۳- جامعہ دارالعلوم، کراچی (۴)

۴- دارالافتاء جمیلی (منسوب بہ مفتی جمیل احمد) و مدرسہ خدام اہل سنت تعلیم القرآن......کرم آباد وحدت روڈ لاہور (۵)

ان تمام دینی مدارس کا پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کے بارے میں موقف یہی ہے کہ چونکہ اجتہاد کرنا صرف مجتہدین کا کام ہے اور پارلیمنٹ کے اراکین اس کی اہلیت نہیں رکھتے، لہٰذا انہیں یہ حق حاصل نہیں اور اگر وہ ایسا کریں تو ان کے اجتہاد کی شرعاً کوئی اہمیت اور حیثیت نہیں۔ (۶)

جامعہ قاسم العلوم کے مفتی عبدالعزیز صاحب نے البتہ یہ اضافہ کیا کہ پارلیمنٹ کو مکمل معاملات کو چلانے کے لیے قانون سازی کا حق ہے۔اس شرط کے ساتھ کہ ان کے بتائے ہوئے قوانین قرآن وسنہ کے خلاف نہ ہوں...... (۷)

---

۱) اس خط کے مضمون کے لیے دیکھیے ضمیمہ......ص ۱۴۸۔

۲) دیکھیے مسلکہ صفحہ، ص ۱۵۰-۱۵۳۔

۳) ایضاً، ص ۱۵۷۔

۴) ایضاً، ص ۱۵۷۔

۵) ایضاً، ص ۱۵۵-۱۵۶۔

۶) ایضاً، ص ۱۵۷۔

۷) ایضاً، ص ۱۵۶۔

مضمون: استفتاء

محترمی ومکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔۔۔۔مزاج گرامی!

کیافرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیان دین شرع متین۔۔۔۔درج ذیل مسئلے کے بارے میں:

(۱) بعض جدت پسندوں کا خیال ہے کہ موجودہ زمانے کی پارلیمنٹ قانون سازی میں غیر معمولی اختیارات رکھتی ہے۔۔۔اس پس منظر میں سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ زمانے کی پارلیمنٹ (قومی اسمبلی رسینٹ کے اراکین کو۔۔۔۔احکام اسلامی میں اجتہاد کرنے اور قرآن وسنت کی روشنی میں نئے احکام تخریج اور مستنبط کرنے کا حق حاصل ہے، یانہیں۔

(۲) نیز۔۔۔۔قومی اسمبلی اور سینٹ کے بنائے اور وضع کیے ہوئے شرعی اور دینی احکام کی کیا حیثیت ہوگی؟ کیا۔۔۔۔انہیں۔۔۔۔''مستقل اجتہاد'' کے طور پر قبول کیا جائے یانہیں؟ بینوا وتوجروا۔

والسلام

(پروفیسر سید محمد شمس الدین)

شعبہ علوم اسلامیہ

گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور

دفتر افتاء......جامعہ نعیمیہ کا نقطہء نگاہ......(الف)

س: کیا دور حاضر میں بھی مجتہد مطلق پیدا ہو سکتے ہیں؟

ج: علامہ طحطاوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد حق تعالیٰ کی ایک خاص رحمت اور اس کا فضل محض ہے جو کسی خاص زمانہ اور وقت تک محدود نہیں ہے بقول دانائے شیراز حافظ شیرازی

ع فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحای کرد

یعنی اب بھی اس کا امکان ضرور ہے کہ مجتہد مطلق پیدا ہوں، مگر امر واقعہ یہی ہے کہ ائمہ اربعہ کے بعد کوئی مجتہد مطلق پیدا نہیں ہوا گو کہ امکان ضرور ہے، بلکہ علماء حنبلیہ کے نزدیک تو کسی زمانہ کا مجتہد سے خالی ہونا جائز نہیں ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی شرح صحیح مسلم، ج ۳ ص ۳۲۸ پر لکھتے ہیں:

''ہر چند کہ ائمہ اربعہ کے بعد اب کسی میں اصول اجتہاد وضع کرنے کی اہلیت ہے، نہ اس کی ضرورت ہے، اس کے باوجود اس کا کوئی قائل نہیں ہے کہ اب کوئی شخص مجتہد مطلق نہیں ہو سکتا اور تمام مسائل شرعیہ میں اجتہاد اور اصول اجتہاد وضع کرنے کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اگر کوئی شخص ائمہ اربعہ کی طرح علوم شرعیہ میں گہرائی اور گیرائی پیدا کر لے تو اجتہاد فی الشرع کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے، البتہ پیش آمدہ مسائل میں جزوی طور پر اجتہاد ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور اس دور میں بھی علماء راسخین یہ فریضہ سرانجام دے رہے ہیں، مثلاً ریل گاڑی اور طیارے میں نماز، لاؤڈ سپیکر پر نماز کا جواز اور عدم جواز، رویت ہلال کمیٹی کے اعلان پر روزہ اور عید، ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا جواز اور عدم جواز، ایلوپیتھک کی خشک اور مائع دواؤں کا استعمال، اسپرٹ اور الکوحل سے مرکب اشیاء کے استعمال سے کپڑوں کی طہارت اور نجاست، بدن انسانی میں خون لگانے کا مسئلہ، انسانی اعضاء کی پیوندکاری اور پوسٹ مارٹم وغیرہ، یہ اور ان جیسے بہت سے مسائل عصر حاضر کی پیداوار ہیں اور جیسا کہ امام غزالی اور دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ اجتہاد کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ مجتہد تمام علوم شرعیہ میں ماہر ہو، بلکہ جو شخص بعض مسائل میں اجتہاد کر سکتا ہے وہ بھی اجتہاد کا مجاز ہے اور علامہ شامی فرماتے ہیں کہ جن مسائل میں امام سے روایت نہ ہو، ان مسائل میں اپنے امام کے اصول وقواعد کی متابعت میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے اور ایسے شخص کو اصطلاح میں ''مجتہد فی المسائل'' کہتے ہیں اور علماء راسخین جو مسائل عصریہ میں اجتہاد کر رہے ہیں وہ بلاشبہ مجتہد فی المسائل ہیں۔

نوٹ: شرائط اجتہاد، دائرہ اجتہاد یعنی کہاں اجتہاد ہوگا اور کہاں نہیں اور طبقات مجتہدین پر تفصیلی معلومات کے لیے دیکھیے مبسوط

کتب اصول۔

اب رہا یہ سوال کہ قومی اسمبلی اور سینٹ کے استنباط کردہ دینی اور شرعی احکام کی کیا حیثیت ہوگی؟ تو اس سلسلہ میں گزارش یہ ہے کہ چونکہ پاکستان میں انتخاب کے موقع پر ہر حلقہ انتخاب سے بکثرت امیدوار از خود کھڑے ہو جاتے ہیں اور زر کثیر خرچ کر کے اپنے لیے کنویسنگ کرتے ہیں اور مخالف امیدوار کی کردار کشی کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں غیبت، افتراء اور تہمت تمام حدود کو پھلانگ جاتے ہیں اور یہ طریقہ اسلام میں بالکل ناجائز ہے اور پھر انہی منتخب شدہ امیدواروں میں سے صدر مملکت، وزیر اعظم وزیر اعلیٰ اور دیگر وزراء کا انتخاب ہوتا ہے اور یہی امیدوار اسمبلی میں جا کر کسی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں ملک کے سر برآوردہ علماء اور دانش وروں پر مشتمل اسلامی نظریاتی کونسل اتفاق رائے سے کسی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کرتی ہیں، لیکن وہ اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک قومی اسمبلی اس کو منظور نہ کرے اور قومی اسمبلی کے ممبروں کے لیے اسلامی علوم یا مروجہ علوم میں کسی علم کی کوئی شرط نہیں ہے، نیکی اور تقوی کی سیاسی تجربہ اور تدبر کی حتی کہ مرد ہونے کی بھی کوئی شرط نہیں ہے، دفتر میں کلرک بھرتی ہونے کے لیے بھی کم از کم میٹرک پاس ہونے کی شرط ہوتی ہے بس چلانے والے ڈرائیور کے لیے بھی تجربہ کی شرط ہوتی ہے لیکن اس ملک کو چلانے کے لیے امیدواروں کے لیے علم اور تجربہ کی کوئی شرط نہیں ہے ہر فاسق وفاجر، جاہل اور نا تجربہ کار شخص خواہ مرد ہو یا عورت انتخاب کے لیے کھڑا ہو سکتا ہے اور پیسہ اور اثر ورسوخ کے زور پر اسمبلی بھی میں پہنچ کر صدر مملکت، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ یا کسی بھی محکمہ کا وزیر بن سکتا ہے اور وہ علم، تجربہ اور اچھے کردار کے بغیر بھی اسلامی نظریاتی کونسل کے پیش کردہ شفارشات کو مسترد کر سکتا ہے اور کسی بھی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

(حضرت علامہ غلام رسول سعدی، شرح صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، مطبوعہ فرید بک سٹال لاہور، ج ۵ ص ۷۶۲)

اس سے آپ اندازہ لگالیں کہ اسمبلی اور سینٹ کے ارکان کے اجتہاد اور استنباط واستخراج کردہ دینی اور شرعی احکام کی کیا حیثیت ہوگی؟

واللہ اعلم بالصواب

دار العلوم جامعہ نعیمیہ لاہور
فون: ۳۲۹۳۲۸۹

دفتر افتاء...... جامعہ نعیمیہ کا نقطہ ءنگاہ......(ب)

الجواب هو الموفق للصواب: پوچھے گئے سوالات کے جواب کے لیے چند بنیادی اصول کا جاننا ضروری ہے، تاکہ اصل مسئلہ کی نوعیت واضح ہو سکے۔

(ا) کسی بھی پیش آمدہ مسئلہ کے حل کے لیے چار چیزیں ماخذ بنتی ہیں:

(۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، (۳) اجماع اور (۴) قیاس

وجہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالی کو یمن کے انتظامی امور کی ذمہ سونپی گئی تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: اے معاذ مقدمات تمہارے پاس آئیں گے ان کا فیصلہ کس طرح کروگے؟ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالی عنہ نے عرض کی "اقضی بکتاب الله" میں مقدمات کا فیصلہ کتاب اللہ سے کروں گا، ارشاد: اگر (بظاہر) کتاب اللہ سے وہ مسئلہ نہ مل سکے تو؟ حضرت معاذؓ نے عرض کی "بسنة رسول الله"، اگلا سوال تھا اگر سنت رسول سے نہ مل سکے تو؟، اس پر آپؓ نے عرض کیا "احتهد برای" میں پھر اجتہاد سے مسئلہ کا استخراج کرنے کی کوشش کروں گا، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کی تحسین فرمائی اور الحمد للہ کے الفاظ یاد فرمائے (ترمذی شریف)

(۲) ترکت فیکم امرین والی حدیث انور، کہ میں تم میں دو امور چھوڑ کے جا رہا ہوں جب تک تم انہیں تھامے رکھو گے گمراہی سے بچے رہو گے ایک کتاب اللہ اور دوسرے میری سنت (مشکوۃ)

اجماع امت بھی ماخذ ہے، اس پر وہ حدیث شاہد ہے جسے ترمذی کے حوالہ سے صاحب مشکوۃ نے نقل کیا، عن ابن عمر رضی الله عنهما، قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله لا يجمع امتى او قال امة محمد صلى على ضلالة ويد الله على الجماعة (مشکوۃ ص ۳۰، مطبع مجتبائی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا اللہ تعالی میری امت کی گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا (امتی یا امت محمد) جماعت کو اللہ تعالی کی تائید حاصل رہے گی (امت سے مراد امت اجابت ہے، نہ کہ دعوت، ورنہ تمام فلم بین فلم کے دیکھنے پر اتفاق کر لیں تو فلم بنی کا جواز پیدا نہیں ہوتا)۔

(۳) قیاس پر نصوص قرآنی شاہد "فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ" (القرآن) اعتبار قیاس بالمثل کو کہتے ہیں (نور الانوار) لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهُ (النساء: ۵)

(ب) کسی بھی پیش آمدہ مسئلہ کو جب آپ قیاس سے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تو قیاس کی ان تمام شرائط و ارکان کو پیش نظر رکھنا ہوگا لغۃً و شرعاً قیاس کہتا ہے: (۱) قیاس لغت میں "التقدیر" موازنہ کرنا، بحاورۂ کہتے ہیں "قس النعل بالنعل" جوتے کے ایک پاؤں کا دوسرے سے موازنہ کر لے۔

(۱) ”شرعا“ اذا اخذوا حکم النوع من الاصل سموا ذلك قیاساً۔ کسی علت مشترکہ کی بناپر فرع کے لیے وہی حکم لگانا جوکہ اصل کے لیے ہے۔

شرائط: ان لا یکون الاصل مخصوصاً بحکمه بنص آخر۔

اصل جس سے ہم فرع کی طرف حکم کو منتقل کرنا چاہتے ہیں وہ کسی دوسری نص کی وجہ سے اس حکم کے ساتھ خاص نہ ہو، جیسے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی اکیلے ہی گواہی دو کے برابر قرار دی گئی۔

(۲) اصل کا حکم غیر قیاسی نہ ہو،”وجہ یہ ہے کہ غیر قیاسی شے مقیس علیہ نہیں بن سکتی، بلکہ اپنے مورد پر بند رہتی ہے“ جیسے نماز میں قہقہہ سے وضو کا ٹوٹ جانا۔

(۳) جس اصل کا حکم فرع میں لگانا مقصود ہے اس کی علت بعینہ فرع میں پائی جانا ضروری ہے۔

(۴) اصل کے حکم کی علت شرعی ہو(شارع علیہ السلام سے منقول ہو) لغوی نہ ہو۔

(۵) علت کے بعد بھی اصل کا وہی حکم رہے جو علت سے پہلے تھا، کیونکہ رائے سے حکم بدلنا باطل ہے۔

رکن: اصل کے لیے جو حکم کسی علت کی بنا پر لگا بعینہ اس علت کی فرع کے لیے ثابت کرنے کے بعد اصل والا حکم لگانا۔

(ج) کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استخراج احکام کے لیے ان کی جملہ اقسام سے باخبر ہونا، جو کہ اجمالاً ذیل کے امور پر مشتمل ہیں:

تقسیم اول: عام، خاص، مشترک، ماؤل

(۲) ظاہر، نص، مفسر، محکم (اس کے چار مقابلات) خفی، مشکل، مجمل، متشابہ

(۳) حقیقت، مجاز، صریح، کنایہ

(۴) استدلال احکام کے طریق، عبارۃ النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص، اقتضاء النص

نوٹ: جس طرح یہ جملہ اقسام کا علم کتاب اللہ سے ہونا ضروری ہے، اسی طرح ان اقسام کا علم سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہونا بھی اسی طرح ضروری ہے۔

ان امور کی آگاہی کے بعد دور صحابہ میں جن امور پر اجماع ہوا اور ان کی روایت ہم تک پہنچنے کی سند کے اعتبار سے جس درجہ کا وہ اجماع ہوگا اس کا علم ہونا۔

پھر قرون اولیٰ میں ائمہ مجتہدین کے طبقات اور ان کے وضع کردہ اصولوں سے آگاہ ہونا بھی اسی طرح سے ضروری ہے۔ کن کن فقہاء کے افراد نے اصول وضع کیے اور اجمالاً، ائمہ کے طبقات کا خاکہ:

(اولیٰ) طبقہ ائمہ مجتہدین فی الشرع جیسے ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ، امام مالک بن انس علیہ الرحمۃ، امام ابوادریس شافعی علیہ الرحمۃ، امام احمد بن حنبل علیہ الرحمۃ انہوں نے کتاب وسنت سے احکام کا استنباط اور استخراج کرنے کے لیے خود اصول وضع کیے۔

(ثانی) طبقہ مجتہدین فی المذہب، یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے اپنے امام کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے فروع میں

اپنے اپنے اصول وضع کرتے ہیں جیسے احناف میں سے امام ابو یوسف، امام محمد بن حسن امام زفر امام حسن بن زیاد وغیرہ۔

(ثالث) طبقہ مجتہدین فی المسائل التی لا روایۃ فیہا عن صاحب المذہب، یہ وہ طبقہ ہے کہ کسی فرعی مسئلہ میں انہیں اپنے امام سے روایت نہیں ملتی اور یہ لوگ اپنی صلاحیتوں سے اس مسئلہ کا استخراج کرتے ہیں۔

(رابع) یہ وہ طبقہ ہے جو خود تو اجتہادی صلاحیتوں کے مالک نہیں ہوتے، مگر خداداد صلاحیت کی وجہ سے اپنے امام کے مسئلہ کی توضیح کر سکتے ہیں ان کے عدل وحکمت پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

(خامسہ) اصحاب ترجیح: یہ وہ لوگ ہیں جو ائمہ متقدمین سے جو مختلف روایات ان تک پہنچتی ہیں ان کو دلائل سے ایک دوسرے پر ترجیح دینے پر قادر ہوتے ہیں۔

(سادسہ) یہ ایسا طبقہ ہے کسی بھی روایت کی چھان بین کر کے اس کے قوی یا ضعیف ہونے کے ادلہ جانتے ہیں۔

(سابعہ) یہ ایسے لوگ ہیں جو نہ تو اجتہادی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں، نہ ہی قوی وضعیف کا علم رکھتے ہیں، یہ عوام الناس کا وہ طبقہ ہے جو اندھیری رات میں ایندھن برائے نار تلاش کر رہا ہوتا ہے اور اسی میں تاریکی کی وجہ سے فرق نہیں کر سکتا۔

یہ تمام امور جن کا اب تک ذکر ہو چکا، اس سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ پیش آمدہ کسی بھی مسئلہ پر رائے کے اظہار کے لیے کتاب اللہ کی جملہ اقسام کا علم ہو، احادیث طیبات پر سیر حاصل عبور ہونا اور ایک ایک حدیث پر گہری نظر ہونا ضروری ہے۔ آج تو ائمہ حدیث کی کاوشوں سے ذخیرہ احادیث ہمارے سامنے ہے، اس کی سند کے رجال پر پوری پوری تحقیق وتدقیق پر ضخیم کتب موجود ہیں۔ قرون اولیٰ میں جب یہ اہتمام ہوا کہ احادیث کو اکٹھا اور ذخیرہ کر دیا جائے، ابھی موجود نہ تھا کہ امام ابوحنیفہؒ جیسے اپنے فن فقاہت کے اور علم حدیث کے ماہر ترین ہوتے ہوئے یہ کہتے سنے گئے کہ اذا صح الحدیث فھو مذھبی اگر آپ کو کوئی ایسی حدیث مل جائے جس کی صحت پر کسی طرح کا کوئی اشتباہ نہ ہو تو حدیث انور سے فقاہت وہی میرا مسلک ہوگا۔

پھر اجماع پر نظر ہونا اور تمام تر صلاحیتوں جن کا تعلق طبقہ اولیٰ، ثانی اور ثالثہ سے ہے، تمام امور پر نظر دوڑانے کے باوجود مسئلہ نہ مل سکے تو شرائط قیاس کو پیش نظر رکھ کر اس پیش آمدہ مسئلہ پر رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔

ارکان اسمبلی جن کا تعلق ساتویں طبقہ سے ہے، ان کے بارے تصور کہ وہ پیش آمدہ کسی مسئلہ پر اپنی رائے سے استخراج کر لیں گے یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایم بی بی ایس ڈاکٹر سے رائے لی جائے جناب آپ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں: لوہا فرنس میں کتنی ڈگری فارن ہیٹ پر پانی کی طرح پگل جاتا ہے؟ سمجھ دار اپنی رائے میں یہی کہے گا کہ یہ میرا فن نہیں، صاحب فن کی طرف رجوع فرمائیں۔

ارکان اسمبلی اور سینٹ کے ارکان کو مسئلہ فقہیہ کے استخراج کا حق دینا ماضی بعید کے اس فتنہ کی مانند ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں ظاہر ہوا، نو مسلم عبداللہ بن سبا یہودی تھا وہ اپنی قوم کے ساتھ مسلمانوں میں فتنہ ڈالنے کے لیے مسلمان ہوا۔ مسلمانوں کے بعض افراد کو محبت اہل بیت کی پٹی پڑھائی تو دوسروں کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا ساتھ دینے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا مشورہ دیا اور ہر ایک کو دوسرے کے خلاف پٹی پڑھاتا۔ اسی طرح کے ایک اور فتنہ کا تذکرہ حضرت علامہ ابوادریس محمد عبدالرب حنفی قادری دہلوی نے اپنی تقریظ فتح المبین فی رد ظفر المبین کے صفحہ ۴۹۶ پر کہا: لالہ انت رام ولد لالہ کوٹی مل اپنی قوم کے ساتھ برائے نام مسلمان ہوئے اور فتنہ عدم تقلید کی بنیاد ڈالی اور عوام کو بخاری ومسلم کی موجودگی میں کسی اور کے قول کو اپنانے کو کفر

وبدعت قرار دیا۔

طبقات فقہاء کے اول وثانی طبقہ کے علاوہ کسی فقہی جزی کا حل صرف اسی شخص کے لیے ممکن ہے، جو مجتہدانہ تمام تر صلاحیتوں سے متصف ہو۔ جو عملاً آج بالفعل ناممکن اگر چہ بالقوۃ ممکن ہے۔

اسے یوں سمجھیے کہ رؤیت باری تعالیٰ بالقوہ ممکن ہے، اگر رؤیت باری تعالیٰ ممکن نہ ہوئی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام رؤیت کا سوال نہ کرتے "رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ" انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم سے ایسا سوال جو فی نفسہ محال ہو از خود محال ہے۔ رب کریم کا ارشاد ہے: ﴿وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناضرۃ﴾ جنت میں خوش بخت چہرے اپنے رب کو ملاحظہ کریں گے اور اصول ہے کہ جو بالقوہ ممکن ہو وہ بالفعل ممکن ہے۔ مگر نفس امکان وجود کو مستلزم نہیں ہوتا۔ جس طرح رؤیت باری تعالیٰ فی نفسہ ممکن، مگر بالفعل محال ہے کہ واجب الوجود کا امکان میں پایا جانا لازم آئے گا۔ اسی طرح آج بلکہ قیامت کے لیے مجتہد کا ہونا فی نفسہ ممکن، مگر فعلاً محال ہے، نہ کتاب وسنت اور اجماع کی تمام جزئیات کا احاطہ کر سکے اور نہ ہی استخراج جزی پر قادر ہو۔

اس لیے ماسوائے فتنہ کے اسے اور کسی شے سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔

واعاذنا اللہ تعالیٰ منہ۔ ھذا ھو عندی مختصراً واللہ اعلم بالصواب۔

دستخط

محمد عبدالعلیم سیالوی

جامعہ نعیمیہ، لاہور (مہر دارالافتاء جامعہ نعیمیہ، لاہور)

02/08/09

جامعۃ الاسلامیہ جامع العلوم ملتان کا موقف

الجواب

(۱) موجودہ زمانے کی (قومی اسمبلی/ سینٹ) کے اراکین کو احکام اسلامی میں اجتہاد کرنے اور قرآن وسنت کی روشنی میں نئے احکام استنباط کرنے کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ شرائط استنباط واجتہاد ان میں مفقود ہیں لمافی الدر المختار:

وشرطه الاسلام والعقل والبلوغ، وكونه فقيه النفس اى شديد الفهم بالطبع وعليه باللغة العربية وكونه حاوياً لكتاب اللّٰه تعالىٰ فى ما يتعلق بالاحكام، وعالماً بالحديث متناً وسنداً وناسخاً ومنسوخاً، وبالقياس واما المجتهد فى حكم دون حكم فعليه معرفة ما يتعلق بذلك الحلم۔ (ج۸،ص۴۲)

(۲) قومی اسمبلی وسینٹ کے وضع کیے ہوئے احکام مستقل اجتہاد کے طور پر قبول نہیں کیے جائیں گے اور نہ ہی موجودہ پارلیمنٹ وسینٹ کے وضع کیے ہوئے دینی احکام کی کوئی قابل اعتبار حیثیت ہوگی، لمافی الدر:

دل على ان الجاهل لا يمكنه القضاء بالفتوى ايضاً، فلا بد من كون الحاكم عالماً ديناً۔ (ج۸،ص۵۷)

فقط واللہ اعلم

بندہ محمد عمر فاروق معین

مفتی جامعہ قاسم العلوم ملتان

الجواب صحیح

مہر

حافظ فضل احمد

مفتی جامعہ قاسم العلوم ملتان

۳۰/۰۸/۱۴۳۰ھ

۲۲/۰۸/۲۰۰۹ء

الجواب

ہمیں مندرجہ بالا فتوی سے اتفاق ہے لیکن پارلیمنٹ کو ملکی معاملات چلانے کے لیے قانون سازی کا حق حاصل ہے اس شرط کے ساتھ کہ ان کے بنائے ہوئے قوانین قرآن وسنت کے خلاف نہ ہوں۔

مہر

عبدالعزیز عفی عنہ

٦.٩.٢٠٠٩

دارالافتاء، الجامعۃ الاسلامیہ جامع العلوم ملتان

جامعہ دارالعلوم کراچی......کا موقف:

الجواب حامداً ومصلیا

(۱) جو مسائل قرآن وحدیث میں منصوص ہیں وہ محل اجتہاد ہی نہیں، اسی طرح جو مسائل اجماعی ہیں ان میں بھی اجتہاد کی گنجائش نہیں۔ہاں جو مسائل غیر منصوص ہوں اوران پر اجماع بھی منعقد نہ ہوا ہو وہ محل اجتہاد ہیں، لیکن اجتہاد کرنا ہر شخص کا کام نہیں، بلکہ اجتہاد وہ شخص کرسکتا ہے جس شخص کو کتاب اللہ کی تمام آیات اوران کی تفسیر کا مکمل علم ہو، الفاظ کے لغوی شرعی مفہوم سے واقف ہو، ناسخ ومنسوخ کا بھی علم ہو، کتاب اللہ میں مذکور احکام کی اقسام اوران کی تفصیلات کا بخوبی علم رکھتا ہو، اسی طرح احادیث کے ذخیرہ پر بھی اس کو عبور حاصل ہو، حدیث کی سند اور متن کا علم ہو، اسی طرح امتِ اسلامیہ کے اجماع اور چودہ سو سالہ تعامل سے پوری طرح واقف ہو، نیز قیاس کی تمام اقسام کو جانتا ہو اور استنباط کی صلاحیت ہو اور امت کو اس کی امانت ودیانت اور علم وتقدس پر اعتماد ہو۔

جس شخص میں مذکورہ بالا صفات نہ ہوں وہ اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اس صلاحیت کے بغیر اجتہاد کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص علم طب حاصل کیے بغیر علاج کرے تو جو نتیجہ اس صورت میں مریض کا ہوگا وہی نتیجہ نااہل کے اجتہاد کی صورت میں دین کا ہوگا۔

آج کی پارلیمنٹ جس کی اکثریت قرآن کریم کا ترجمہ تک نہیں جانتی اسے اجتہاد کا حق کیونکر حاصل ہوسکتا ہے؟

كشف الاسرار ج ۷، ص ۱۳۵

الاجتهاد: هو استفراغ الفقيه الوسع لتحصيل ظن بحكم شرعي۔

واحترز بالفقيه عن غيره فإن استفراغ النحوي او المتكلم الذي لا فقه له لتحصيل ما ذكر لا يسمي اجتهاداً۔

قال صدر الشريعة رحمه الله:

(باب الاجتهاد) شرطه ان يحوي علم الكتاب بمعانيه لغة وشرعاً واقسامه المذكورة، وعلم السنة متناً وسنداً، ووجوه القياس كما ذكرنا۔ (التوضيح)

وقال العلامة سعد الدين التفتازانیؒ:

الاجتهاد، هو في اللغة تحمل الجهد اى المشقة۔ وفي الاصطلاح استفراغ الفقيه الوسع لتحصيل ظن بحكم شرعي، وهذا هو المراد بقولهم: بذل المجهود لنيل المقصود ومعنى استفراغ الوسع بذل تمام الطاقة بحيث يحس من نفسه العجز عن المزيد عليه فخرج استفراغ غير الفقيه وسعه في معرفة حكم شرعي فبذل الفقيه وسعه في معرفة حكم شرعي قطعي، او في الظن بحكم غير شرعي ليس باجتهاد۔ وشرط الاجتهاد ان يحوي اى ان يجمع العلم بامور ثلاثة۔

الاول: الكتاب اى القرآن بان يعرفه بمعانيه لغة وشريعة اما لغة فبان يعرف معاني المفردات والمركبات وخصوصها في الإفادة فيفتقر إلى اللغة والصرف والنحو والمعاني والبيان اللهم إلا ان يعرف ذلك بحسب السليقة، واما شريعة فبان يعرف المعاني المؤثرة في الاحكام مثلاً يعرف في قوله تعالى: ﴿أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ﴾ ان المراد بالغائط الحديث، وان علة الحكم خروج النجاسة عن بدن الإنسان الحي باقسامه

من الخاص والعام والمشترك والمجمل والمفسر وغير ذلك مما سبق ذكره بان يعلم ان هذا خاص وذاك عام، وهذا ناسخ وذاك منسوخ إلى غير ذلك، ولا خفاء فى ان هذا مغاير لمعرفة المعانی۔

الثانی: السنة قدر ما يتعلق بالاحكام بان يعرفها بمتنها وهو نفس الحديث وسندها، وهو طريق وصولها إلينا من تواتر، او شهرة، او آحاد۔ و فى ذلك معرفة حال الرواة والجرح والتعديل۔

الثالث: وجوه القياس بشرائطها و احكامها واقسامها والمقبول منها والمردود وكل ذلك ليتمكن من الاستنباط الصحيح وكان الاولى ذكر الإجماع ايضاً إذ لا بد من معرفته ومعرفة مواقعه لئلا يخالفه فى اجتهاده۔ (التلويح)

وقال القرضاوی:

وقد زاد بعض الاصوليين فى هذا الحد لفظ "الفقيه" فقال: بذل الفقيه الوسع ...... الخ قال الشوكانی: ولا بد من ذلك، فإن بذل غير الفقيه وسعه لا يسمى اجتهاداً اصطلاحاً، ومن لم يذكر هذا القيد فهو ملاحظ عنده، إذا لا يستطيع نيل الحكم بطريقه الاستنباط إلا الفقيه، والمراد بالفقيه هنا: المتهيء للفقه الممارس له، وعبروا عنه بقولهم: من اتقن مبادئ الفقه بحيث يقدر على استخراجه من القول إلى الفعل، وليس المراد: من يحفظ الفروع الفقهية فقط، على ما شاع الآن، لان بذل وسعه ليس باجتهاد اصطلاحاً۔

وهذا قيد منهم، فإن كثيراً من المشتغلين بالعلوم الإسلامية الاخرى كعلم الكلام او التصوف او السيرة او التاريخ، ونحوها وبعض الخطباء والوعاظ البلغاء يقحمون انفسهم فى ميدان الاجتهاد، ويفتون برايهم فى اعوص المسائل، وهم بعيدون عن ساحة الفقه، والغوص فى بحاره، وكل ميسر لما خلق له، كما ان مجرد حفظ فروع الفقه ومسائله فى مذهب او اكثر لا يجعل من صاحبه فقيهاً قادراً على الاجتهاد والاستنباط، وسياتى مزيد بحث لهذا فى شروط المجتهد۔ (الاجتهاد فى الشريعة الإسلامية)

(۲) اگر قومی اسمبلی اور سینٹ کے وضع کردہ قوانین قرآن وسنت، اجماع یا قیاس صحیح کے خلاف ہوں تو ان پر اجتہاد کا پردہ ڈال کر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ واللہ اعلم بالصواب

الجواب الصحیح
مہر نائب مفتی (احقر محمود اشرف غفر اللہ لہ)
جامعہ دار العلوم کراچی، ۱۹/۸/۱۴۳۰ھ

دستخط
(سید حسین احمد)
دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی
۱۷۔۸۔۱۴۳۰ھ
مہر دار الافتاء، فتوی نمبر ۱۱۸۶/۵۵
مؤرخہ ۲۱ شعبان ۱۴۳۰ھ

<u>دارالافتاء جمیلی (منسوب بہ مفتی جمیل احمد) ومدرسہ خدام اہل سنت تعلیم القرآن کا موقف</u>

الجواب حامداً ومصلیا

(۱) اجتہاد کا دروازہ تو بند ہو چکا ہے، اب کسی میں وہ اہلیت نہیں ہے جو کہ اجتہاد کے لیے ضروری ہے اس مسئلہ کی پوری تفصیل علامہ شامی نے تحریر فرمائی ہے کہ علم، تقوی، طہارت اور قرآن وسنت کے علوم میں مہارت کاملہ اب کسی میں نہیں ہے اور اسمبلی کے ارکان تو بے چارے اکثر دینی علوم سے محروم ہیں لہذا ان کو بھی اس کا حق نہیں ہے۔

(۲) اگر ان کا کوئی فیصلہ قرآن وسنت اور اجماع امت کے خلاف ہوگا تو وہ قابل تسلیم نہیں۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

دستخط

(کتبہ شیر محمد غفرلہ)

۴/شعبان ۱۴۳۰ھ

مہر مفتی

مدرسہ خدام اہلسنت، تعلیم القرآن

کرم آباد، وحدت روڈ،

لاہور

مہر دارالافتاء جمیل

کرم آباد، لاہور

فصل سوم:

پارلیمنٹ کے حق اجتھاد کے مؤیدین اور مخالفین کے دلائل کا تجزیہ و تقابل

اس بحث کے اختتام پر یہ مناسب ہوگا کہ پارلیمنٹ کے حق اجتھاد کے مؤیدین اور مخالفین کے دلائل کے مابین تجزیہ و تقابل کریں اور یہ دیکھیں کہ کس کے دلائل زیادہ مضبوط اور طاقت ور ہیں:

مؤیدین کے دلائل	مخالفین کی طرف سے محاکمہ
ترکی کی حزب اصلاح مذہبی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام میں عینیت اور اثباتیت کا امتزاج نہایت خوبی سے ہو چکا ہے۔	ترکی ایک سیکولر ریاست ہے، لہٰذا اس کا سیاسی نظام قابل استفادہ نہیں (۱)۔
علامہ اقبالؒ اجتھاد کا مفہوم احکام میں تبدیلی ہے، نیز کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنا ہے۔(۲)	یہ درست نہیں ہے، اجتہاد کے معنی قرآن وسنۃ کی کسی نظیر کو سامنے رکھ کر، نئے مسئلے کو اس پر قیاس کرنا ہیں اور اس کی حدود و شرائط میں یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص یہ اجتہاد کرے وہ مجتھد ہو (۳)۔
جس طرح سائنس میں ہے، اسی طرح قانون کی تاریخ میں بھی یہ بات ہے کہ بعض اوقات کسی خاص دور کے تمام مجتہدین کا کسی بات پر اجماع اس کی صحت اور صداقت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجتہدین یا صحابہ کرامؓ کے اجماع سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور قانون کو بدلا جاسکتا ہے(۴)۔	جہاں تک صحابہ کرام اور بعد کے مجتہدین کے اجتہاد کا تعلق ہے تو جب اجماع اپنی شرائط کے ساتھ منعقد ہو جائے، تو اس پر یہ قطعی دلیل اور قطعی حجت ہے اور تمام مسلمانوں پر اس کی پیروی لازم ہے، اس کی مخالفت یا اس کا توڑنا جائز نہیں ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت گمراہی پر اکٹھی نہیں ہو سکتی (۵)۔

---

۱) دیکھیے حافظ صلاح الدین یوسف، ص ۱۲۶۔

۲) مجیب اللہ ندوی، ص ۱۱، ۱۲، بحوالہ عائلی کمیشن آف پاکستان۔

۳) دیکھیے حافظ صلاح الدین یوسف، ڈاکٹر محمد امین، ڈاکٹر محمود الحسن عارف اور قدیم علماء کا موقف، نیز عبدالکریم زیدان، الوجیز فی اصول الفقہ، ص ۶۳۵۔

۴) مجیب اللہ ندوی، ص ۱۵-۱۶۔ بحوالہ عائلی کمیشن رپورٹ۔

۵) عبدالکریم زیدان، ص ۲۲۶، ۲۲۷۔

کیا اجتہاد پارلیمنٹ کا حق ہے؟

مؤیدین کے دلائل	مخالفین کی طرف سے محاکمہ
دورِ اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشوونما اور قانون ساز مجالس کا قیام ایک بڑا ترقی افزا قدم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مذہب اربعہ کے نمائندے جو سر دست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں وہ اپنا یہ حق مجالس تشریعی کو منتقل کریں گے (۱) (علامہ اقبال)	جمہور علمائے کرام نے ان باتوں سے اتفاق نہیں کیا وہ نہ تو محض کسی شخص کے کسی مجلس کے لیے انتخاب یا کسی عہدے پر اس کے فائز ہونے کو معیار اجتہاد سمجھتے ہیں، اور نہ ہی پارلیمنٹ کو مجموعی طور پر اجتہاد کا حق دیتے ہیں...... چند آرا درج ذیل ہیں: مولانا مودودی پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کے سخت مخالف تھے (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)
حضرت علامہ نے دورِ معاصر کے تقاضوں کی روشنی میں اجماع کا حق ایک طرح سے ہر اسلامی ملک کی پارلیمنٹ کو دیا ہے (پروفیسر مرزا محمد منور) (۲)	قانون سازی کو حکومتی دسترس سے آزاد ہونا چاہیے۔ اسلامی قانون کا یہ اصول ہے کہ عدالت و قانون سازی کو حکومت سے آزاد رہنا چاہیے۔ (۶) (ڈاکٹر محمد حمید اللہ)
فقہی مسلکوں کے انفرادی نمائندوں سے اجتہاد کا اختیار ایک مسلم قانون ساز اسمبلی کو منتقل کر دیا جائے۔ محارب فرقوں کے پیدا ہو جانے کے پیش نظر عہد جدید میں یہی ایک صورت ممکن ہے جو اجماع اختیار کر سکتا ہے۔ (ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ) (۳)	علامہ اقبال کے ان خیالات سے امت نے کبھی اتفاق نہیں کیا...... علامہ اقبال کے قریب دوست اور معروف عالم دین مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال کے یہ لیکچر شائع نہ ہوئے ہوتے تو بہتر تھا (۷)۔
اب وقت آ گیا ہے کہ تعبیر شریعت کا اختیار فقہی مسلکوں کے افراد سے لیکر قوم کو منتقل کر دیا جائے، جو اس کی اصل اور جائز حق دار ہیں۔ (۴)۔	جمہوریت (اور اس کے طریقہ انتخاب کو) روح اسلام کے عین مطابق قرار دینا...... حقائق کے یکسر خلاف ہے۔ بلاشبہ شاعران مغرب نے جمہوریت کا ناسور اس زور سے پھونکا ہے کہ بڑے بڑے اہل علم بھی اس کی زُلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے ہیں۔ (حافظ صلاح الدین یوسف)
کیا موجودہ اسمبلی گزشتہ زمانوں میں کی ہوئی شریعت کی تعبیر اور فقہاء کے اجتہادات کی پابند ہے؟ اس مسئلے پر علامہ اقبال کا اجتہاد یہ ہے کہ موجودہ اسمبلی اس کی پابند نہیں۔ (محمد یوسف گورایہ)	انتخاب کی بنیاد ووٹوں پر رکھی جاتی ہے اور اس گنتی میں ایک صحیح یا مناسب امیدوار محض ایک ووٹ کم پڑنے پر کسی غلط یا غیر مناسب امیدوار کے مقابلے میں شکست کھا سکتا ہے۔ (۸) ایضاً
علامہ اقبال کے نزدیک عہد حاضر میں ملکی قوانین کی تقنین اور تشکیل کے لیے اجتماعی اجتہاد و تعبیر قانون ساز اسمبلی کا اختیار ہے (۵) ایضاً	

---

۱) علامہ اقبال، خطبات، ص ۲۶۹۔

۲) اقبال اور اجتہاد، درسہ ماہی منہاج، ص ۲۷۱۔ بابت ربیع الاول ۱۴۰۳/ جنوری ۱۹۸۳ء

۳) ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ، اقبال اور اجتہاد، ص ۱۹۔

۴) ایضاً ص ۱۹۔

۵) خطبات بہاولپور، ص ۲۲۰۔

۶) ایضاً۔

۷) حافظ صلاح الدین یوسف، اجتماعی اجتہاد، ص ۱۳۔

۸) ایضاً، ص ۱۵۶

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ تعبیر شریعت کا حق منتخب نمائندگان کو ہے نامزد علماء کو یہ حق نہیں دیا جانا چاہیے...... یہ وہ نقطہ نظر ہے جس میں علامہ اقبال منفرد ہیں، ان کی اس رائے کو اہل علم وفکر میں پذیرائی نصیب نہیں ہوئی۔

اور اجتہاد کا اہل وہی ہے جس میں مخصوص قسم کی صلاحیت و استعداد ہوگی(۹)۔

منتخب نمائندوں میں سے اکثریت علمی اہلیت وصلاحیت سے عاری اور ان اوصاف وشرائط سے بے بہرہ ہوتی ہے جو اجتہاد کے لیے ضروری ہے۔

(ب) اگر انہیں یہ اختیار دے دیا جائے، تو ہر پانچ سال کے بعد شریعت کا نیا ایڈیشن تیار کرنا پڑے گا۔

(ج) اس تجویز کے مضمرات سے خود علامہ کو بھی اختلاف ہے جیسا کہ انہوں نے مثنوی اسرار و رموز میں...... راہ آباء کی روش پر چلنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا ہے۔ پھر یہ مسلمہ اسلامی تعبیرات کی بھی نفی کرنا ہوگا(۱۰)۔ پھر علامہ اقبال نے خود بھی آخری دنوں میں اپنے ان خیالات سے رجوع کر لیا تھا(۱۱)۔

مغرب میں چونکہ اقتدار و اختیار کا منبع عوام ہیں۔ اس لیے وہاں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سیاسی اور قانونی اقتدار اور انہیں کی ملکیت ہونا چاہیے لیکن اسلام میں یہ صورت نہیں ہے(۱۲)۔

---

۹) ایضاً، ص ۱۵۷۔

۱۰) ایضاً، ص ۱۶۳-۱۶۴۔

۱۱) ایضاً

۱۲) ڈاکٹر محمد امین، عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون، ص ۹۷۔

پھر پارلیمنٹ کی اساس بالغ رائے دہی پر ہے، جو اسلامی تصورات کے خلاف ہے، جبکہ اسلام نے شوریٰ کا تصور دیا، جس کی اساس اہلیت اور استحقاق ہے، لہٰذا موجودہ پارلیمنٹ کو ''حق اجتہاد'' حاصل نہیں (۱۳)۔

اسلامی نقطۂ نظر سے بھی شوریٰ میں تین خوبیاں ہونی چاہئیں......علم، تقویٰ اور عوامی اعتماد اور موجودہ پارلیمنٹ تینوں معیارات پر پورا نہیں اترتی (۱۴) لہٰذا ہماری اسمبلیوں کو موجودہ ہیئت میں حق اجتہاد نہیں دیا جاسکتا۔

اسلام میں قانون سازی کا حق اللہ تعالیٰ، اس کے رسول کا ہے، جبکہ مجتہد کو قرآن وسنہ کی روشنی میں اجتہاد کا حق دیا گیا ہے، جو مطلق نہیں ہے(۱۵)۔

عہدوں اور مناصب کے حوالے سے کسی کو مرتبہ اجتہاد پر فائز کرنے کی یہ کوشش انتہائی خطرناک ہی نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے مسلمہ شواہد وواقعات کے بھی خلاف ہے(۱۶)۔

پارلیمنٹ کو روزمرہ کے نظم ونسق اور مالیاتی اور قانونی امور سے متعلق تو قانون سازی کا حق حاصل ہے، مگر دینی اور مذہبی امور میں اُسے یہ حق حاصل نہیں (۱۷)۔

اگر کوئی شخص ائمہ اربعہ کی طرح علوم شرعیہ میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرلے تو اجتہاد فی الشرع کا دروازہ اب بھی کھلا ہے البتہ پیش آمدہ مسائل میں جزوی طور پر اجتہاد ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور اس دور میں بھی علمائے راسخین یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں اور پارلیمنٹ کے ارکان کے لیے تو علم اور تقویٰ کی کوئی شرط نہیں ہے۔(۱۸)

(دارالافتاء جامعہ نعیمیہ)

---

۱۳) ایضاً،ص ۸۱-۸۲۔

۱۴) ایضاً،ص ۱۸۱-۱۸۲۔

۱۵) ڈاکٹر محمود الحسن عارف، پارلیمنٹ اور اجتہاد، درسہ ماہی المنہاج،ص ۸۶۔۸۷۔

۱۶) ایضاً،ص ۸۸۔۸۹۔

۱۷) ایضاً۔۔

۱۸) فتویٰ دارالعلوم جامعہ نعیمیہ (قلمی) نقل مسلک۔

ارکانِ اسمبلی، جن کا تعلق ساتویں طبقے (عوام الناس کا وہ طبقہ جو اندھیری رات میں ایندھن برائے نار تلاش کررہا ہوتا ہے) ان کے بارے میں یہ تصور کہ وہ پیش آمدہ کسی مسئلے پر اپنی رائے سے استخراج کرلیں گے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایم بی بی ایس ڈاکٹر سے یہ رائے لی جائے کہ لوہا فرانس میں کتنی ڈگری فارن ہائیٹ پر پانی کی طرح پگل جاتا ہے...... ارکان اسمبلی اور سینٹ کے ارکان کو مسئلہ فقہیہ کے استخراج کا حق دینا ماضی بعید کے اس فتنہ کی مانند ہے جو حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں ظاہر ہوا(۱۹)۔

(دارالعلوم جامعہ نعیمیہ)

موجودہ زمانے میں (قومی اسمبلی/سینٹ) کے اراکین کو احکام اسلامی میں اجتھاد کرنے اور قرآن وسنۃ کی روشنی میں نئے احکام استنباط کرنے کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ شرائط استنباط واجتھاد ان میں مفقود ہیں(۲۰)

(جامعہ قاسم العلوم، ملتان)

لیکن پارلیمنٹ کو ملکی معاملات چلانے کے لیے قانون سازی کا حق حاصل ہے اس شرط کے ساتھ کہ ان کے بنائے ہوئے قوانین قرآن وسنۃ کے خلاف نہ ہوں۔

(مفتی عبدالعزیز)

اجتہاد کرنا ہر شخص کا کام نہیں، جبکہ اجتہاد وہ شخص کرسکتا ہے جس شخص کو کتاب اللہ کی تمام آیات اور ان کی تفسیر کا علم ہو اور جس شخص میں مذکورہ بالا صفات نہ ہوں، وہ اجتھاد کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ آج کی پارلیمنٹ جس کی اکثریت قرآن کریم کا ترجمہ تک نہیں جانتی اُسے اجتھاد کا حق کیونکر حاصل ہوسکتا ہے۔(۲۲)

(جامعہ دارالعلوم، کراچی)

اسمبلی کے ارکان تو بے چارے اکثر دینی علوم سے محروم ہیں۔ لہٰذا ان کو بھی اس (اجتھاد) کا حق نہیں ہے اور اگر ان کا کوئی فیصلہ قرآن و سنۃ اور اجماع امت کے خلاف ہوگا تو وہ قابل تسلیم نہیں ہوگا۔

---

۱۹) ایضاً۔

۲۰) دارالافتاء جامعہ قاسم العلوم ملتان (نقل منسلک)

۲۱) دارالافتاء، جامعہ قاسم العلوم، ملتان۔

۲۲) مفتی محمد اشرف وسید حسین احمد، دارالافتاء، جامعہ دارالعلوم کراچی (اصل مملوکہ مقالہ نگار، نقل منسلک)

باب: ششم

عصر حاضر میں اسلامی ممالک کی پارلیمانوں میں اجتہادی کاوشیں،
ایک عمومی بحث

فصل اول: اسلامی ممالک میں اجتہادی کاوشوں کا پس منظر۔۔۔۔۔۔ایک عمومی جائزہ

فصل دوم: شمالی افریقہ کے ممالک میں اجتہادی اداروں کا جائزہ۔۔۔

(الف) حصہ اول (تیونس)

(ب) حصہ دوم (مراکش) میں اجتہادی اداروں کا جائزہ

فصل سوم: حصہ اول، جمہوریہ مصر اور اس کے اجتہادی ادارے

حصہ دوم، سوڈان اور اس کے اجتہادی ادارے

فصل چہارم: حصہ اول، انڈونیشیا کے اجتہادی ادارے

حصہ دوم، ملائشیا کے اجتہادی ادارے

فصل پنجم حصہ اول، سعودی عرب اور ایران کے اجتہادی ادارے

حصہ دوم، پاکستان کے اجتہادی ادارے

فصل اوّل:

مسلم ممالک میں پارلیمانوں کی اجتہادی کاوشوں کا پس منظر

جب آنحضور ﷺ نے دنیا سے وصال فرمایا، تو اس سے ایک بار تو مسلمان صدمے کی وجہ سے سکتے میں آ گئے، وہ اس بات پر حیران تھے کہ یہ یکا یک کیا ہو گیا ہے اور آنحضور ﷺ نے دنیا سے کیوں پردہ فرمالیا ہے؟ تاہم جب وہ اس صدمے سے باہر آئے اور انہیں اسلامی احکام کے پہلو سے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے مسائل کا ایک انبار ہے، جسے انہوں نے آنحضرت ﷺ کی دی ہوئی ہدایات کی روشنی میں حل کرنا ہے۔

اسلامی تاریخ میں صحابہ کرامؓ نے اپنے اجتہاد سے جو پہلا فیصلہ کیا وہ خلافت کے قیام اور حضرت ابو بکرؓ کے خلیفہ راشد کے طور پر تقرر کا تھا(۱)۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اکابر صحابہ (حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح (رضی اللہ عنہم) کو یہ خبر ملی کہ ''سقیفہ بنی ساعدہ'' میں انصار مدینہ کا ایک اجتماع ہو رہا ہے جو حضرت سعدؓ بن عبادۃ (رئیس الخزرج) کو اپنا امیر مقرر کرنے والے ہیں یہ ایک ایسا مسئلہ تھا، جو فوری توجہ چاہتا تھا، چنانچہ یہ تینوں صحابہ کرامؓ وہاں پہنچے اور انہوں نے انصار مدینہ کو ان کی ذمہ داریاں اور نبی اکرم ﷺ کے ان کے بارے میں ارشادات یاد دلائے، تو انہوں نے اپنی طرف سے امیر مقرر کرنے کا فیصلہ واپس لے لیا اور تمام لوگوں نے اتفاق رائے سے حضرت ابو بکرؓ کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیا(۲)۔

خلافت کی تاسیس اور منہاج نبوت کے مطابق اس کا قیام ایک مثبت اور عظیم پیش رفت تھی، جو آنحضور ﷺ کے وصال کے چند گھنٹوں کے بعد حاصل ہوئی، اس سے...... انتظامی معاملات کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے علاوہ دینی مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک قومی بنیاد مل گئی، چنانچہ اس دور میں جو بھی مسائل پیش آئے، صحابہ کرامؓ نے باہمی مشاورت اور قرآن وسنہ میں غور و فکر کے ذریعے انہیں حل کیا، اسی بنا پر حضرت ابو بکر صدیقؓ کے متعلق ان کے سوانح نگار نقل کرتے ہیں:

> ''حضرت ابو بکرؓ کسی پیش آئندہ مسئلے کے بارے میں کتاب اللہ پر غور کرتے اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ملتا تو پھر نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ میں دیکھتے اگر ان کے علم میں نبی اکرم ﷺ کی کوئی سنت نہ ہوتی تو لوگوں سے پوچھتے کہ کسی کو اس بارے میں نبی اکرم ﷺ کی سنت معلوم ہے۔ اگر کسی سے آنحضور ﷺ کی سنت مل جاتی تو وہ اس پر

---

۱ مناع القطان، تاریخ التشریع الاسلامی، مطبعہ مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء ص ۱۳۳۔

۲ ایضاً ۱۳۳-۱۳۴

عمل کرتے اگر سنت نہ ملتی، تو ممتاز صحابہ کرامؓ اور اہل علم کو جمع کرتے اور ان سے مشورہ کرتے، اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کا بھی یہی معمول تھا'' (۳)

صحیح البخاری میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق بھی ایک ایسا ہی واقعہ روایت کیا ہے (۴)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے جس طرح انتظامی امور و معاملات میں مسلم حکمرانوں کو اہل حل وعقد سے مشورے کا پابند کیا ہے (۵)، اسی طرح دینی اور اجتہادی امور میں بھی مسلمان حکمرانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اہل حل وعقد سے مشورہ کریں اور مشورے میں جو بات طے ہو جائے اس پر عمل کریں۔ عصر حاضر میں یہ کام پارلیمانوں کے ذریعے انجام پا رہا ہے۔

دور صحابہ میں ہمیں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ فیصلہ کرنے والوں میں سے ایسے صحابہ بھی شامل ہوتے تھے جن کی ذاتی رائے بعد میں اس مسئلے میں تبدیل ہو جاتی تھی، مگر وہ اجتماعی مشورے میں طے پانے والے حکم کے بدستور پابند رہتے، مثال کے طور پر حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں اجتماعی مشورے سے یہ طے ہوا تھا کہ ام ولد (۶) کی فروخت ممنوع ہوگی، اس فیصلے میں حضرت علیؓ کی رائے بھی شامل تھی، تاہم بعد ازاں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی ذاتی رائے بدل گئی اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ام ولد کی فروخت کی اجازت دے دی جائے، ایک تابعی حضرت عبید سلفی کو جب یہ علم ہوا تو انہوں نے حضرت علیؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

'' آپ کی وہ رائے جو اجتماعی صورت میں سامنے آئی تھی وہ آپ کی انفرادی اور ذاتی رائے سے بہتر ہے۔''

اس پر حضرت علیؓ نے اپنی انفرادی رائے واپس لے لی اور لوگوں سے کہا کہ وہ پہلے سے جو فیصلہ کرتے آرہے ہیں وہی کرتے رہیں (۷)۔

دراصل اجتماعی فیصلوں میں مشورے کی برکت شامل ہو جاتی ہے اور جب کوئی بات مشورے سے طے ہوتی ہے تو اس میں نسبتہً غلطی کا امکان کم ہوتا ہے اور پھر اس کے استنباط میں بیک وقت کئی لوگ شامل ہوتے ہیں جس کی بنا پر اس فیصلے میں بہتری پیدا ہو جاتی ہے پھر بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مشورے سے طے ہونے والے مسائل میں لوگوں کا اجتہاد بدل جاتا تھا۔ اور نیا اجتہاد نئے دور کے تقاضوں کے زیادہ مناسب ہوتا تھا، مگر اس کے باوجود اجتماعی فیصلے پر ہی عمل کیا جاتا۔

ماں باپ دونوں سے پیدا ہونے والے حقیقی بھائی اور محض والدہ کی طرف سے ایک بھائی کے متعلق حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا تو حضرت عمرؓ نے تمام بھائیوں کو ایک تہائی مال میں شریک قرار دیا۔ چنانچہ مروی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے ایک بار وراثت کا ایک معاملہ پیش آیا: ہوا وہ یہ کہ ایک عورت فوت ہوئی اور اس کے وارثوں میں اس کا خاوند، اس کی ماں اور اس کے دو بھائی شامل تھے۔ ایک شخص نے حضرت عمر فاروقؓ کو یاد دلایا کہ آپ نے ایسے ہی مسئلہ میں فلاں سال اس کے برخلاف فیصلہ صادر کیا تھا، تو

---

۳ ابن قیم، اعلام الموقعین، ۱/ ۷۰-۷۱، مطبعۃ النیل۔

۴ البخاری، الجامع الصحیح، ۱۳/ ۲۹۸، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب ۱۳، حدیث ۷۳۲۸۔

۵ القرآن الکریم، (۴۲/ ۳۸) الشوریٰ۔

۶ ام ولد ایسی باندی جس سے مالک کی اولاد ہو۔ ایسی باندی بیوی کے درجہ میں ہوتی ہے اور اپنے مالک/ خاوند کی وفات کے بعد آزاد ہو جاتی ہے (دیکھیے۔ المرغینانی، ہدایہ)

۷ البخاری، باب مناقب علی ابن ابی طالب، حدیث ۳۷۰۷

حضرت عمر فاروقؓ نے اس پر یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

"تلک ما قضینا یومئذ وھذہ علی ما قضینا الیوم" (۸) وہ فیصلہ اس وقت اور اس دور کے لحاظ سے تھا اور یہ فیصلہ ہمارے آج کے دور کے مطابق ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے اس فیصلے پر نامور محقق اور محدث ابن قیم لکھتے ہیں:

''امیر المومنین نے ان دونوں موقعوں پر اسی رائے کو لیا جو ان کے نزدیک زیادہ درست اور صحیح تھی، اور ان کا سابق فیصلہ ان کے لیے دوسرے اجتہاد کی طرف رجوع کرنے سے انہیں مانع نہیں ہوا۔(۹)

صحابہ کرامؓ کے اسی طرز عمل سے اجتہاد کے ایک نئے منہج کا آغاز ہوا، یہ الگ بات ہے کہ مختلف دینی معاملات میں مشاورت یا مذاکرے کا یہ عمل زیادہ دنوں تک ایک اصول اور ضابطے کے طور پر برقرار نہ رہ سکا اور خود خلافت راشدہ کے آخری دور میں کمزور ہو گیا تھا اور اموی دور (۴۰۔۱۳۲ھ) میں تو مکمل طور پر سرکاری اور قومی سطح پر کہیں نظر نہیں آتا۔ تاہم اس سے اجتہادات کو مقبول اور عوام میں متداول بنانے کے لیے ایک اہم اساس ضرور میسر آئی۔ اسی بنا پر نامور تابعی حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اپنے دور خلافت میں اپنی سلطنت کے تمام علاقوں میں یہ حکم ارسال کیا:

''ہر علاقے (کی عدالتوں میں) وہی فیصلے نافذ کیے جائیں جس پر وہاں کے فقہاء متفق ہوں۔''(۱۰)

جس سے واضح ہوتا ہے، کہ سرکاری اور قومی سطح پر نہ سہی، البتہ علاقائی سطح پر ضرور مشاورت اور باہمی اتفاق سے مسائل کے حل کا سلسلہ جاری ہوا۔ تاہم خلافت راشدہ کے بعد یہ سلسلہ جاری نہ ہو سکا اس کی جگہ مختلف مسالک وجود میں آ گئے تاہم عصر حاضر میں پارلیمنٹ کی صورت میں ایک ایسا ادارہ موجود ہے جہاں قومی سطح پر اجماع کا انعقاد ممکن ہے اس حوالہ سے اسلامی دنیا کے چند ممالک کی پارلیمانوں کا جائزہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

۲۔ دوسری صدی میں قائم ہونے والے اجتہادی مسالک:

پھر جب دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں فقہی اور اجتہادی دبستان وجود میں آئے، تو ان کا اجتہاد اگرچہ غیر سرکاری نوعیت کا تھا تاہم انہوں نے بھی، خصوصاً فقہ حنفی کے بانی امام ابوحنیفہؒ نے، انفرادی اور شخصی اجتہاد کے بجائے اجتہاد کا یہی اجتماعی طریقہ اختیار فرمایا، جس سے دینی اور اجتہادی معاملات میں مشاورت اور مذاکرے کا طریقہ فروغ پذیر ہوا۔ امام ابوحنیفہؒ نے ''جو مجلس تدوین فقہ تشکیل دے رکھی تھی اور جس میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین شریک ہوا کرتے تھے اس مجلس میں کھلی بحث وتمحیص کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہوتا تھا۔ تاہم اس کے باوجود امام ابوحنیفہؒ یہ سمجھتے تھے کہ تمام تر بحث و تمحیص اور گفتگو کے باوجود ان مسائل و معاملات میں مزید بہتری کی گنجائش موجود ہے، چنانچہ شمس الدین الذہبی نے امام ابوحنیفہؒ کے فضائل میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ امام صاحب فرمایا کرتے تھے:

''ہمارا یہ علم اجتہاد (رائے) ہے اور یہ سب سے بہتر بات ہے، جس تک ہم پہنچ سکے ہیں اور جو ہمارے پاس اس سے بہتر

۸۔ ابن القیم، اعلام الموقعین ۱/۱۳۱..... مطبعۃ النیل۔

۹۔ ابن القیم، اعلام الموقعین ۱/۲۳۱؛ محمد معروف الدوالیبی، المدخل الی علم اصول الفقہ، بار پنجم ۱/۲۰۱۔۲۰۷۔

۱۰۔ الدارمی، السنن، ۱/۱۲۲

بات لے کر آئے گا ہم اسے قبول کرلیں گے۔"(۱۱)

پھر صرف یہی نہیں کہ یہ مذاکرہ یا یہ مباحثہ......اپنے ہم مسلک لوگوں کے درمیان ہوتا تھا بلکہ مختلف افکار اور مختلف خیالات رکھنے والے اصحاب علم وفضل کے مابین بھی اسی جذبے کے ساتھ مذاکرے اور مباحثہ کا اہتمام ہوتا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ کو بعض سیاسی اور ذاتی مصالح کے تحت ایک مرتبہ چھ ماہ کے لیے حجاز مقدس میں رہنا پڑا۔ ان دنوں حجاز مقدس کے دونوں مرکزی شہر، یعنی مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ اہل علم وفضل کی خصوصی آماجگاہ تھے۔ یہاں علم کے دریا بہتے تھے اور پھر یہاں کے مقامی علماء کے علاوہ یہاں حج وعمرہ کے لیے آنے والے علماء وفضلاء کا ایک الگ حلقہ تھا، جو یہاں اپنے علم وفضل کے ساتھ سکونت رکھے ہوئے تھے۔ اور یوں علمی اور فکری تحریکیں ایک ملک سے دوسرے ملک اور دوسرے سے تیسری ملک سفر کرتی تھیں اور علماء کی یہاں آمد اور قیام سے یہاں کے علمی اور فکری حلقوں کو بھی بے حد فیض پہنچتا تھا۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کے مطابق خود نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو دور دراز کے علاقوں سے مدینہ منورہ میں طالب علموں کی آمد سے باخبر کردیا تھا۔(۱۲)

چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کو یہاں کئی علماء وفضلاء سے تبادلہ خیال اور مذاکرے کا موقعہ ملا، جن میں امام مالکؒ کا نام سرفہرست ہے۔ امام مالکؒ کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کی علمی گفتگو، بعض اوقات نماز عشاء کے بعد شروع ہوتی اور نماز فجر تک جاری رہتی، اسی طرح امام ابوحنیفہؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے معروف ترین شاگردوں یعنی حضرت عطاء بن ابی رباحؒ اور حضرت ابن جریجؒ سے یہیں ملے اور ان دونوں سے علمی مذاکرات کیے(۱۳)۔

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ اور امام اوزاعیؒ کے مابین ہونے والے مباحثے بھی بڑے معروف ہیں۔

پھر اس صدی کے تیسرے بڑے فقیہ امام محمد بن ادریس الشافعیؒ اور امام محمدؒ بن الحسن الشیبانیؒ کے مابین ہونے والے مذاکرے اور مباحثے بھی کسی وضاحت اور تشریح کے محتاج نہیں، جن کا ذکر امام شافعیؒ نے اپنی کتاب الام میں کئی مقامات پر کیا ہے۔(۱۴)

اس دور کے اہل علم وفضل کے مابین ہونے والے ان مذاکرات اور علمی مباحثوں کا اس وقت کے لحاظ سے کوئی نتیجہ نکلا ہو، یا نہ نکلا ہو، لیکن اس سے یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے، کہ علماء اور فقہاء کے مابین ایک دوسرے کے خیالات جاننے اور ایک دوسرے سے علمی اور فکری استفادہ کرنے کے لیے...... مذاکرے اور مباحثے کی یہ روایت بہت مفید ثابت ہوئی تھی، علاوہ ازیں اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مختلف دینی علمی مسائل ومعاملات میں مشاورت اور مذاکرے کا جو سلسلہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے بابرکت ادوار میں شروع ہوا تھا، وقت گزرنے کے باوجود یہ سلسلہ دوسری اور تیسری صدی تک کے ادوار میں جو علم فقہ کی تدوین کے ادوار ہیں، جاری وساری رہا اور مشاورت اور مذاکرے کی اس روایت نے آئندہ دور میں بھی فقہ اسلامی کی تدوین و

---

۱۱ الذہبی، شمس الدین الذہبی، فضائل الامام ابی حنیفہ وصاحبیہ ص ۲۱۔

۱۲ المکی، موفق الدین، مناقب الامام اعظم ابی حنیفہؒ، ۲/۱۶۴۔

۱۳ ایضاً/۸۸۔

۱۴ ایضاً۔

تالیف کے دوران میں بے حد مفید کردار ادا کیا۔

۳۔ اجتہاد اور تدوین کے آئندہ ادوار میں مذاکرے اور مباحثے کی روایت:

اجتہاد کے حوالے سے شروع سے ہی مذاکرے اور مباحثے کی روایت کا آغاز ہونا مسلم معاشرے کے لیے ایک نیک فال تھا، لیکن افسوس کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ روایت جاری نہ رہی اور رفتہ رفتہ اجتہاد انفرادی نوعیت کی ایک شے بن کر رہ گیا، جس کی بنا پر اسلامی دنیا میں فقہاء کی رائے میں تنوع اور رنگارنگی نظر آنے لگی۔

اس تنوع اور رنگارنگی کے کئی اسباب تھے، جن میں سے ایک سبب علماء کے مابین کسی مرکزیت کا فقدان تھا، جو مسائل و معاملات میں ایک دوسرے کے فکری نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دوسرا اہم ترین سبب اس دور میں ابھرنے والی علمی اور فکری تحریکوں کے دوران پیدا ہونے والا علمی اور کسی حد تک علاقائی اور مسلکی تعصب تھا، جو دنیائے اسلام کے مختلف شہروں میں بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا۔(۱۵)

علاوہ ازیں جوں جوں تدوین و تالیف فقہ کی یہ علمی اور فکری تحریک آگے بڑھ رہی تھی، فقہ کے ساتھ اصول فقہ کے عنوان سے اساسی اصول و قواعد پر بھی زور دیا جانے لگا تھا۔ جن کے تحت نت نئے مسائل کے حل اور ان کے استنباط کے لیے قرآن و سنۃ اور اجماع سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ گویا اب مسائل ہی میں اختلاف نہ تھا، بلکہ استنباط و استخراج احکام کے قواعد بھی ایک دوسرے سے الگ ہونے لگے تھے، جس کی بنا پر فقہا کی آراء میں اختلاف ابھر کر سامنے آنے لگا۔ تاہم اس اختلاف اور تنوع کا نقصان یہ ہوا کہ دنیائے اسلام ''اجماع'' کے نام کی اہم ترین شے سے محروم ہو گئی۔ اور اب نئے دور میں اجتماعی اجتہاد کے بجائے انفرادی اجتہاد پر، یا زیادہ سے مسلکی اجتہاد پر زور دیا جانے لگا اور یوں امت اتحاد و اجماع کے بجائے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو گئی اور پورا عالم اسلام ان...... بولیوں یا ان نعروں سے گونجنے لگا۔(۱۶)

یہ گروہی اور مسلکی تعصب اتنا بڑھا کہ چوتھی صدی اور اس کے بعد کے علماء نے اپنے مسلک کی تنگنائے سے باہر نکل کر مطلقاً دیکھنا بند کر دیا اور عملی طور پر یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ مسائل کے حل کے لیے اب نئے اجتہاد کی ضرورت نہیں، بلکہ قدیم علماء کے اجتہادات ہی اب ان کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔

شروع شروع میں یہ محض ایک رویہ تھا، اور قومی طور پر کوئی شخص بھی اجماع کی بندش کا قائل نہ تھا، لیکن...... مسائل کے حل کے لیے اپنایا جانے والا یہی رویہ رفتہ رفتہ ''جمود'' اور باب اجتہاد کی بندش کا ذریعہ بن گیا...... اور پھر کھلے بندوں یہ کہا جانے لگا کہ اب اجتہاد کی ضرورت باقی نہیں رہی، یہی اجتہاد کے دروازے کا بند ہونا اور مذاکرے اور مباحثے کی روایت کا اپنے طبعی انجام تک پہنچنا تھا۔

مسلمانوں میں ''جمود'' اور مسلکی تعصب ہی ان کے زوال کا باعث بنا اور ان کا یہ زوال ایک طویل عرصے تک جاری رہا اور اسی زوال و انحطاط اور دور تقلید و عہد جمود میں مسلمانوں سے بغداد چھینا گیا۔ پھر اسپین اور اس کے علمی مراکز، مثلاً قرطبہ اور غرناطہ

۱۵۔ محمد معروف الدوالیبی، المدخل الی علم اصول الفقہ، ۱/۱۲۶۔

۱۶۔ اسی بنا پر فقہاء نے بعد کے ادوار میں ''اجماع'' ناممکن قرار دیا، کہ اب نہ تو پوری اسلامی دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کرنا ممکن ہے اور نہ ہی مسلکی تعصب کی بنا پر عملی طور پر ایسا ہونا ممکن ہے۔ اور اب تو ایک شہر کی سطح پر بھی ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آیا۔

دشمنوں کے قبضہ میں چلے گئے ،(۱۷) لیکن جمود اور مسلکی اور گروہی تعصب کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اس میں تبدیلی آنے میں کئی صدیاں لگیں۔

۴۔ دور تقلید:

مسلمانوں میں دور تقلید کی ابتدا چوتھی صدی ہجری کے وسط (تقریباً نواح 350ھ) سے ہوئی اور یہ دور تقلید بارہویں صدی ہجری/اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک جاری رہا۔(۱۸)

اس دور میں ایک طرف تو فقہی مسالک کی تنظیم ہوئی اور دنیائے اسلام ان فقہی مسالک کے مابین تقسیم ہوگئی۔ کسی ملک میں ایک مسلک پروان چڑھا، تو دوسرے ملک میں دوسرا مسلک فروغ پذیر ہوا۔ علاوہ ازیں اسلامی مملکت میں اب بہت سی سیاسی تبدیلیاں بھی رونما ہو چکی تھیں، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ مملکت اسلامیہ، جو پہلے مشرق و مغرب کے کئی علاقوں پر مشتمل تھی، اب متعدد حصوں میں بٹ گئی اور ہر ایک کے اپنے اپنے سیاسی اور علاقائی تقاضے تھے...... ابتداء میں...... خلافت عباسیہ کے قیام (۱۳۲ھ) پر مملکت اسلامیہ کے دو حصے ہوئے، اندلس میں اموی حکومت قائم ہوئی اور مشرق میں عباسی حکومت کا قیام عمل میں آیا، پھر عباسی حکومت کے مزید حصے ہو گئے اور شمالی افریقہ میں فاطمی حکومت قائم ہوگئی۔ جبکہ مصر اخشیدیوں کے قبضے میں چلا گیا، اور مرکز خلافت میں سلجوقی اور دیلمی سردار حکمرانی کرنے لگے (۱۹)

اسلامی مملکت کے اس ضعف و اضمحلال کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی قلمرو میں غور و فکر میں کمی واقع ہوگئی، اجتہاد کا راستہ متروک ہو گیا اور تقلید کا منہج وسیع طریقے سے اختیار کر لیا گیا۔ اب ہر فقیہ کے لیے یہ لازم تھا کہ وہ کسی نہ کسی معین فقہی مسلک کی تقلید اختیار کرے۔ انتہا یہ ہے کہ اس دور میں بعض فقہاء نے فقیہ کے لیے بھی ایک مسلک چھوڑ کر دوسرے مسلک کو یا اس کی کسی ایک بات کو اپنانے کو ممنوع قرار دے دیا، چنانچہ ایک ایک مسجد میں دو دو جماعتیں ہونے لگیں، ایک مرتبہ شوافع کے لیے اور دوسری مرتبہ احناف کے لیے اور حال یہ ہو گیا کہ ایک مسلک کے لوگ دوسرے لوگوں اور ان کے امام کی نماز کی صحت میں شک کرنے لگے۔(۲۰)

۵۔ باب اجتہاد کی بندش اور اس کے اسباب:

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اس دور میں اجتہاد کا دروازہ کیوں بند ہوا تو اس کے کئی اسباب تھے:

(الف) اسلامی حکومتوں کا ضعف:

اس دور میں امت اسلامیہ سیاسی طور پر ضعف اور اضمحلال کا شکار تھی اور دینی اور مذہبی طور پر بھی یہ دور مجموعی کمزوری اور

---

۱۷ دیکھیے، ابن القیم، اعلام الموقعین، ۲۳۲/۱۷۔

۱۸ محمد بن الحسن، الفکر السامی فی تاریخ الفقہ، مکتبۃ العلمیۃ، ص ۱۳۔

۱۹ ابن الاثیر، الکامل، جلد ۹، ص ۴۸ --- ۱۰۰: ابن الجوزی، المنتظم، مطبوعہ بیروت، ۱۹۰۷ء۔

۲۰ الدوالیبی، المدخل الی علم اصول الفقہ الاسلامی، ص ۱۰۶۔

ضعف کا دور تھا اور ایسے ایسے لوگ اجتہاد کا دعویٰ کر رہے تھے جو قطعی طور پر اجتہاد کے اہل نہ تھے اور چونکہ عوام میں بھی دینی علم کی کمی تھی، اس لیے وہ اس بات کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ کون اجتہاد کا اہل ہے اور کون اہل نہیں ہے اور کس کا اجتہاد درست ہے اور کس کا اجتہاد درست نہیں ہے، ان حالات میں اس بات کا قوی امکان تھا کہ نا اہل لوگ اجتہاد کے نام پر لوگوں کو گمراہ کرتے اور مملکت اسلامیہ میں انتشار اور گمراہی پھیل جاتی، اسی لئے علمائے کرام نے اس بات کو ضروری خیال کیا کہ وہ اجتہاد کے دروازے کو بند کرنے کا اعلان کریں، تاکہ عوام الناس کو گمراہی سے بچایا جا سکے۔ (۲۱)

(ب) سابقہ دور میں ہونے والے فیصلوں کا احترام:

بعض فقہاء کا خیال تھا کہ چونکہ دوسری اور تیسری صدی کے دوران میں اجتہاد کے عنوان سے اتنا کام ہو چکا ہے کہ اب اس پر اضافے کی گنجائش نہیں تھی اور صورت حال یہ تھی کہ جو مسئلہ بھی پیش ہوتا اور جس کے متعلق فتوے یا اجتہاد کی ضرورت پیش آتی، اس پر پہلے ہی علماء اور فقہاء کے فتاویٰ موجود ہوتے تھے، چنانچہ فقہاء نے جب یہ دیکھا کہ ان کے بزرگوں نے سابقہ دور میں ان کی ہر ضرورت کو پورا کر دیا ہے، تو انہوں نے معاشرے کو ایک نظم پر رواں دواں رکھنے کے لیے اس بات کا ذکر شروع کر دیا کہ اب مزید اجتہاد کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ (۲۲)

(ج) متون کی اہمیت:

مزید برآں اس دور میں قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی طرف توجہ دینے کے بجائے لوگ اپنے اساتذہ اور قدیم علماء و فقہاء کے متون یاد کرنے اور اپنا زیادہ تر وقت اپنے فقہی ائمہ کی کتابوں کی تلخیص اور ان کی حاشیہ نگاری میں صرف کرنے لگے تھے اور فقہی تعصب کا یہ حال تھا کہ انہیں قرآن حکیم کی آیت بھی پیش کی جاتی، جو ان کے مسلک کے خلاف ہوتی یا اسی طرح اسی نوع کی حدیث پیش کی جاتی تو وہ اس کی بھی تاویل کر دیتے تھے اور اسے کھینچ تان کر اپنے مسلک کی تائید پر محمول کر لیتے تھے۔ اس مسلکی تعصب نے لوگوں کے ذہن بند کر دیئے اور یوں اجتہاد کے دروازے کی بندش کا تصور عام ہو گیا۔ (۲۳)

(د) تصنیف و تالیف کا مشکل انداز:

اس زمانے میں مسلمانوں میں تہذیب و تمدن کے فروغ سے آسان اور سہل پسندی کی جگہ مشکل پسندی کا طریقہ عام ہو گیا تھا اور عوام کی زندگی میں بود و باش سے لے کر ان کی اجتماعی زندگی تک ہر بات میں تکلف پسندی کا رجحان پنپنے لگا تھا۔ یہ رجحان ان کی شاعری اور ان کے ادب سے لے کر ان کی تصنیف و تالیف تک میں پیدا ہو گیا۔ (۲۴) اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علمائے کرام جو کتابیں تصنیف و تالیف کرتے تھے ان میں مشکل اور نادر الفاظ اور مشکل و نامانوس ترکیبوں کی کثرت ہوتی اور طلبہ کا خاصا وقت ان گورکھ دھندوں کو حل کرنے اور ان چوٹیوں کو سر کرنے میں بسر ہو جاتا تھا۔ اور پھر یہی مشکل پسندی اور اسلوب بیان کی ندرت علماء اور فقہاء

۲۱۔ ڈاکٹر محمد السید الوکیل، اسباب الضعف فی الامۃ الاسلامیۃ، ص ۱۲۸۔

۲۲۔ ایضاً۔۔۔

۲۳۔ الفقہ الاسلامی، فی ثوبہ الجدید، ۱/۱۷۷۔

۲۴۔ احمد امین، ضحیٰ الاسلام، ۲/۵۶۔

کی تحریروں میں جھلکنے لگی۔ یوں انسانی ذہنوں کی وہ ریاضت جو کسی علمی اور فکری کام میں صرف ہوتی تھی اب محض لفظوں کے ہیر پھیر اور جملوں کی ندرت پسندی کی نذر ہو جاتی تھی۔ اسی لیے اس دور میں خود علماء نے بھی اجتہاد کے بجائے ان کاموں میں توجہ صرف کرنا شروع کر دی جو ان کے لیے غیر ضروری بھی تھے، اور نامناسب بھی (۲۵)۔ تاہم اس دور میں بعض علماء ایسے تھے کہ انہوں نے تقلید کی بجائے اجتہاد کی شمع جلائے رکھی اور آزادانہ طریقے پر فقہی مآخذ اور ائمہ کے اجتہادات سے استفادے کا سلسلہ جاری رکھا، جن میں سب سے نمایاں شخصیت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی تھی۔ (۲۶)

۶۔ <u>اسلامی ممالک میں قوانین شرعیہ اور جدید وضعی قوانین میں تصادم:</u>

یہ سلسلہ یعنی اسلامی ممالک میں تقلیدانہ بلکہ کورانہ روش نجانے کب تک جاری رہتی اور یہ سلسلہ نامعلوم کب تک دراز ہوتا کہ قدرت نے عالم اسلام پر ایک نئی افتاد ڈال دی۔ عالم اسلام ابھی کورانہ تقلید اور مشکل اور انتہائی دقیق الفاظ کے ساتھ متون مرتب کرنے اور ان کی شروح مرتب کرنے کے مزے لوٹ رہا تھا کہ اس پر مغربی استعمار نے حملہ کر دیا اور یکے بعد دیگرے ایک ایک ملک اور ایک ایک ریاست مغربی طالع آزماؤں کے قبضے میں جانے لگی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک طوفان بدتمیزی تھا جو عالم اسلام کی گردن پر یکے بعد دیگرے سوار ہونے لگا تھا، رفتہ رفتہ یہ نوبت آ گئی کہ مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک تمام اسلامی ممالک مغربی سامراج کے تسلط میں آ گئے۔ کہیں ولندیزی ان پر قابض ہو گئے، تو کہیں فرانسیسی، روسی اور کہیں برطانوی ان کے شہروں پر قابض ہو گئے۔ حقیقت میں یہ ایک عذاب الٰہی تھا، جو اسلامی ملکوں پر ان کی جہالت اور کم کوشی کی بنا پر واقع ہوا تھا۔ (۲۷)

تاہم اللہ تعالیٰ جب لوگوں پر کوئی برائی مسلط کرتا ہے تو بعض اوقات اس کے اندر سے کوئی بھلائی اور خیر بھی پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی اس وقت بلاد اسلامیہ کے ساتھ بھی ہوا، مغربی راج قائم ہونے سے قبل بلاد اسلامیہ کی ساری توانائیاں باہمی جنگ و جدال پر صرف ہو رہی تھیں، لیکن مغربی اقوام کی ان ممالک میں آمد کی بدولت اسلامی ملکوں میں بیداری اور نشاۃ اسلامیہ کی زبردست اور طاقت ور تحریکیں اٹھیں اور انہوں نے مسلمانوں کو طویل خواب غفلت سے جگایا۔ (۲۸) اور فقہ کی دنیا میں بھی اس کے واضح اثرات نظر آنے لگے۔

اس کی مزید تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ مغربی اقوام اپنے ہمراہ بہت سے ''وضعی قوانین'' لائی تھیں، جسے انہوں نے اسلامی ممالک میں نافذ کیا، یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے سخت تکلیف دہ تھی، اسی لیے انہوں نے ان قوانین کو دلی خوشی سے نہیں، بلکہ مجبوری اور اضطرار کے ساتھ قبول کیا تھا، اسی لئے مسلمانوں میں بھی ان قوانین کے مقابلے میں اپنے قوانین کو جدید بنانے کی تحریک کا آغاز ہوا۔

سب سے پہلے اس ٹکراؤ یا تصادم کی ابتدا مصر میں خدیو اسماعیل پاشا کے دور میں ہوئی، جہاں چند برس پہلے معروف فرانسیسی حکمران نپولین نے حملہ کر کے اس پر تسلط جما لیا تھا اور پھر اس علاقے پر انگریزی استعمار کا بھی قبضہ رہا تھا (۲۹)۔ خدیو مصر اسماعیل پاشا نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مجلۃ الاحکام العدلیہ کی تدوین قریبی عثمانی دور میں ہوئی تھی اور یہ مجلّہ ان کی ضرورت کو پوری نہیں

۲۵۔ مناع القطان، تاریخ التشریع الاسلامی، مطبعۃ موسسۃ الرسالۃ، ص ۳۳۳۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۳۴۔

۲۷۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ۱۱۰۔

۲۸۔ مناع القطان، ص ۳۳۶۔

۲۹۔ دیکھیے...... مقالہ مصر، Encyclopaedia of Islam، مطبوعہ لائیڈن۔

کر رہا، اس نے فرانس کے شہری قوانین (قانون نپولین) کا عربی میں ترجمہ کروایا اور اسے اپنے ملک میں نافذ کر دیا۔ یہ بہت بڑی جرأت تھی جو حاکم مصر نے اس میدان میں کی تھی۔ (۳۰)

لیکن چونکہ مسلمان کسی ایسے قانون یا اس کے مجموعہ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے جسے کسی غیر مسلم ملک کے قانون سازوں نے مرتب اور مدون کیا ہو، اس لیے اسے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کچھ علماء کو اس کام پر مامور کرنا پڑا جو لوگوں کو یہ بتاتے تھے کہ یہ مجموعہ ہائے قوانین مالکی فقہ سے مستعار ہیں (۳۱)۔ لیکن یہ محض ایک غلط بیانی تھی، اس لیے کہ مغربی قوانین خواہ کتنے ہی خوش نما کیوں نہ ہوں، شرعی قوانین سے مختلف ہیں، اسی لیے کسی ایسے قانون کو جو مغربی طرز حیات سے مستعار ہو شرعی قوانین پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (۳۲)

مصر کے بعد باقی دنیائے اسلام بھی یکے بعد دیگرے مغربی ممالک اور مغربی قوانین کے سائے تلے آ گئی، اس لیے کہ مغربی استعمار جہاں بھی گیا وہ اپنے وضعی قوانین کو اپنے ہمراہ لے کر گیا، اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ مختلف اسلامی ملکوں میں موجود مسلم علماء کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ انہیں بھی اسی طرز پر اپنے قوانین کو مرتب اور مدون کرنا چاہیے۔

چنانچہ مسلم علماء نے جب ان مغربی وضعی قوانین کا مطالعہ کیا تو یہ دیکھا کہ یہ قوانین بڑے سادہ اور سلیس طریقے پر مختصر اور جامع قسم کے جملوں پر مشتمل ہیں۔ انہیں دیکھ کر مسلم علماء نے اسی طرز پر اسلامی قوانین کو مرتب کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں درج ذیل کوششیں ہوئیں:

۱۔ مجلة الاحكام العدلية:

۱۲۰۳ھ میں مملکت عثمانیہ کی طرف سے نامور علماء اور مجتہدین پر مشتمل ایک کمیٹی (لجنہ) تشکیل دی گئی، جس نے سات برسوں میں اسلامی احکام کا مجموعہ مرتب کیا، جسے فقہ حنفی کے مطابق تدوین کیا گیا تھا، اسے "مجلۃ" اس لیے کہا گیا، کیونکہ عام رسائل و جرائد کی طرح اسے بھی یکے بعد دیگرے جاری کیا جاتا تھا (۳۳)، اس میں درج ذیل حصے ہیں:

۱۔ مقدمہ:

مقدمہ میں علم الفقہ کی تعریف اس کی اقسام اور بنیادی فقہی قواعد کا ذکر ہے۔

۲۔ ابواب وکتب:

مجلّہ میں مختلف مسائل میں سے ہر مسئلے پر ایک مستقل باب یا کتاب مرتب کی گئی ہے، یوں اس کی کل کتب

۳۰۔ مناع القطان، ص ۳۳۵۔

۳۱۔ مناع القطان، ص ۵۳۳۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۳۰۔

۳۳۔ مناع القطان، ص ۳۳۶-۳۳۷۔

(Chepters) کی تعداد 18 ہے۔ ہر باب یا کتاب کے شرع میں مغربی قوانین کی طرح اس کتاب/ باب میں مستعمل ہونے والی اصطلاحوں کا ذکر ہے(۳۴)۔

ہر کتاب/ باب میں احکام کا ذکر مختصر انداز میں اور صرف ''ایک رائے'' کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس میں فقہی اختلاف اور فقہی دلائل کا ذکر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس طرح اس میں ۱۸۵۱ احکام/ مادوں کا ذکر آیا ہے اور اس کا نفاذ ۱۲۹۳ھ سے مملکت ترکیہ اور اس کے ماتحت علاقوں میں شروع ہوا(۳۵)۔

اس طرح یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد قسم کا کام تھا، جس نے آئندہ دور میں فقہی مسائل و احکام کو جدید ترتیب کے ساتھ مدون کرنے کا ایک نیا اور جدید انداز متعارف کرایا(۳۶)۔

۲۔ مرشد الحیران لمعرفة الانسان:

''مجلة الاحکام العدلیة'' کی ترتیب و تدوین مکمل طور پر ایک سرکاری کوشش تھی، مگر اس کوشش نے مسلمان فقہاء کے سامنے ایک راستہ کھول دیا، چنانچہ نامورتر کی ماہر قانون محمد قدری پاشا نے ایک کتاب اسی انداز اور اسی طرز پر حنفی فقہ کے مطابق مرتب کی اور اس کا نام ''مرشد الحیر ان المعرفة احوال الانسان'' رکھا۔ اس کا پہلا حصہ احوال الشخصیہ (Personal Law) پر، دوسرا حصہ وقف پر، اور تیسرا حصہ ''احکام المعاملات'' پر مشتمل تھا، اس میں موجود فقہی عنوانات (مادہ جات) کی تعداد ۱۰۴۵ تک پہنچتی ہے(۳۷)۔

۳۔ التشریع الجنائی فی الاسلام:

ایک اور ماہر قانون عبدالقادر عودہ نے، جس کا تعلق مصر کے ''الاخوان المسلمون'' سے تھا اور جو پیشے کے اعتبار سے محکمہ قضا سے وابستہ تھا، مذکورہ بالا عنوان پر ایک اور جامع مجموعہ قوانین مدون کیا، یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، اس کا پہلا حصہ عمومی اور دوسرا خصوصی ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ میں جنایات (Crimes)، حدود (Hadood)، اور التقریرات پر احکام مدون کیے گئے ہیں۔ اس مجموعے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ فقہی مسالک اور وضعی قوانین کو یکجا کیا گیا ہے، یہ احکام جمع کرنے کا جدید ترین اسلوب ہے، جو ڈاکٹر عبدالقادر عودہ نے اختیار کیا اس میں اس موضوع پر ۶۸۹ عنوانات شامل ہیں(۳۸)۔

(ب) پھر چونکہ یہ کام احکام کو جدید خطوط پر ڈھالنے اور نت نئے مسائل کو حل کرنے پر مشتمل ہے، اور یہ افراد کا انفرادی سطح کا کام نہیں ہے، اس لئے اس کے لیے اداروں کی ضرورت تھی، اس بنا پر بہت جلد اس کے لیے کئی کئی علماء اور فقہاء پر مشتمل ادارے اور مجالس کا قیام عمل میں لایا گیا۔

---

۳۴ مجلة الاحکام العدلیہ، استانبول، مقدمہ، ص ۱-۲۔

۳۵ ایضاً۔

۳۶ مناع القطان، ص ۳۲۸۔

۳۷ سرکیس، معجم المطبوعات العربیة: بذیل مادہ

۳۸ مناع القطان، ص ۳۲۸۔

دراصل بیسویں صدی کے دوران میں اسلامی معاشرہ دنیا کے کونے کونے تک جا پہنچا تھا اور دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا تھا، جہاں مسلمان اوران کا دینی معاشرہ موجود نہ ہو، چنانچہ ایک طرف تو اسلامی ممالک میں روز افزوں سول سوسائٹی کو اپنے احکام اور مسائل کے حل کے لیے بصیرت درکار تھی تو دوسری غیر مسلم ملکوں میں بسنے اور زندگی گزارنے والی مسلم اقلیت کو اپنے مسائل کے حل کے لیے رہنمائی کی ضرورت تھی۔

پھر وقت نے افراد کی بجائے اداروں اشخاص کے بجائے مجالس کی اہمیت بڑھادی اور یوں فقہ اسلامی کی ابتدا جس ماحول سے ہوئی تھی یعنی عہد ابی بکر اور عہد عمر کے دوران کی فقہی مجالس شوریٰ اور امام ابوحنیفہؒ کی مجلس فقہ سے، جس سے فقہی قوانین کو مختصر انداز میں مرتب کرنے کی بنیاد پڑی تھی، اسی طرز اور اسی منہج پر نئی مجالس کا قیام عمل میں آنے لگا۔ جس نے شرعی مسائل کے حل کے لیے انفرادی اجتہاد کے بجائے اجتماعی اجتہاد کی اہمیت کو بڑھا دیا (۳۹)۔

ایک وقت تھا جب دنیائے اسلام میں مختلف علماء اور فقہاء کا سکہ چلتا تھا۔ اور مختلف علاقوں اور خطوں کے علمائے کرام ذاتی طور پر فتویٰ جاری کرتے تھے تو ان کا فتویٰ قبولیت حاصل کر لیتا تھا، لیکن وقت نے اس طریقہ کار کو متروک ہی نہیں، بلکہ ناپسندیدہ قرار دے دیا تھا، چنانچہ نامور فقیہ ابن القیم لکھتے ہیں:

''اور جس شخص نے محض فقہی کتب کو سامنے رکھ کر اور لوگوں کے عرف ورواج، ان کی عادتوں، ان کے زمانوں، ان کے مختلف علاقوں، ان کے حالات اور ان کے حالات کے قرائن کو پیش نظر رکھ کر فتویٰ دیا تو وہ خود بھی گمراہ ہوا اور اس نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا اور اس کا جرم اس معالج اور طبیب کے جرم سے بڑھ کر ہے، جس نے لوگوں کے شہروں، ان کی عادتوں، ان کے زمانوں اور ان کی طبیعتوں کو جانے بغیر محض طبی کتابیں پڑھ کر ان کا علاج کیا، بلکہ جیسے یہ معالج جاہل ہے، اسی طرح یہ مفتی بھی جاہل ہے اور وہ لوگوں کے لیے اس سے زیادہ ضرر رساں ہے، جتنا کہ مذکورہ بالا معالج اور طبیب (۴۰)

لہٰذا اب یہ بات لازمی ہوگئی ہے کہ محقق علماء اور اصحاب بصیرت اور اہل علم و دانش پر مشتمل کوئی جماعت ان مسائل پر ہر پہلو سے غور وحوض کرے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس مجلس میں شرعی قوانین پر عبور رکھنے والے لوگوں کے پہلو بہ پہلو جدید قوانین کے ایسے ماہر بھی شامل ہوں، جو جدید حالات، ان کے تقاضوں اور ان کی جدید تعبیرات سے بھی آشنا ہوں تا کہ جو اجتہاد اور جو قانون سازی ہو، وہ ہر پہلو سے مکمل اور ہر اعتبار سے قابل اعتبار ہو۔

ان فقہی مجالس اور اداروں کے سامنے درج ذیل تین طرح کے مسائل غور وحوض کے لیے پیش کیے جائیں:

(۱) نئے پیش آمدہ مسائل، جو اجتماعی نوعیت کے ہوں اور گھمبیر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا تعلق مختلف علوم وفنون سے ہو۔

(۲) اجتماعی نوعیت کے ایسے مسائل، جن پر ماضی میں اجتہاد تو ہوا، مگر ان پر فقہاء کی آراء مختلف ہوں اور موجودہ زمانے میں کسی ایک رائے کو ترجیح دینے کی ضرورت ہو۔

---

۳۹ مناع القطان، ص ۳۳۹-۳۴۰، دیکھیے ڈاکٹر عبدالحمید السوسوہ الشرقی، الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی، دوحہ وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیہ، ۱۹۸۸ء۔

۴۰ اعلام الموقعین، ۳/۷۸، دار الجیل۔ بیروت

(۳) ایسے شرعی احکام جن کا دارومدار مختلف علاقوں یا مختلف ادوار کے عرف وعادت پر ہو اور اس وقت وہ عرف ورواج بدل چکا ہو (۴۱)۔

آیئے اب ہم مختلف اسلامی ممالک میں ہونے والی...... اجتہادی کاوشوں کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ اہم ترین اسلامی ممالک میں، فقہی اور اجتہادی ادارے کس طرح کام کر رہے ہیں، اور یہ کہ ان ممالک میں پارلیمنٹ...... ''اجتہادی'' کوششوں کے حوالے سے کیا کردار ادا کر رہی ہے، اس ضمن میں درج ذیل اسلامی ممالک کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

۴۱ دیکھیے ڈاکٹر عبدالحمید السوسوۃ الشرفی، ص ۱۰۷-۱۲۳۔

فصل دوم:

شمالی افریقہ کے ممالک میں اجتہادی اداروں کا جائزہ

(حصہ اول) تیونس:

جمہوریہ تیونس شمالی افریقہ کا ایک اسلامی ملک ہے، جو بلادالمغرب (Barbary) کی مشرقی ڈھلانوں پر مشتمل ہے، اسے قرون وسطیٰ میں افریقیہ بھی کہا جاتا تھا،...... اس کا رقبہ ۱۵۴،۵۳۰ مربع کلومیٹر ہے۔ اس کے مشرق اور شمال میں...... بحر اوسط، مغرب میں الجزائر اور جنوب میں لیبیا واقع ہے(۱)...... ۳۰ مارچ ۱۹۹۴ء کو ہونے والی مردم شماری کے مطابق، یہاں کے باشندوں کی تعداد ۸،۷۸۵،۳۶۴ (ستاسی لاکھ پچاسی ہزار تین سو چونسٹھ) افراد ہے۔ ۲۰۰۴ء کی مردم شماری کے مطابق باشندوں کی تعداد ۹،۹۱۰،۸۷۲ ہے اور آبادی کی کثافت فی مربع کلومیٹر ۶۴،۱ فی مربع کلومیٹر ہے(۲)۔ ملک کے تقریباً تمام باشندے مسلمان ہیں، عربی یہاں کی سرکاری زبان ہے؛ اس کے علاوہ سواحلی اور فرانسیسی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ بہت محدود تعداد میں عیسائی اور یہودی بھی آباد ہیں...... اس کے دارالحکومت کا نام بھی تونس ہے۔(۲)

اسلام:

۱۹۵۷ء کے بنیادی آئین کی رو سے، مملکت کا سرکاری مذہب اسلام ہے اور صدر مملکت کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے، آئین کے دیباچہ میں آئین بنانے کی ایک وجہ...... اسلامی تعلیمات کی پاسداری بھی قرار دی گئی۔ البتہ مملکت میں بعض جدید اصلاحات متعارف کرائی گئی ہیں۔ جیسے کہ عورتوں کو ان کے حمل کے اسقاط کی اجازت دی گئی ہے،......۔

حکومت مشاورت کے لیے "مفتی اعظم" کا تقرر کرتی ہے،...... اس وقت مفتی اعظم مولانا محمد شیخ محمد جیر بالخذا ہیں۔ لوکل انتظامیہ کے طور پر...... حکومت کو ۲۴ زونوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

ملک میں بہت سی سیاسی جماعتیں، نفاذ اسلام کے لیے کام کر رہی ہیں۔ جن میں خصوصی طور پر حزب نہضہ (Party de la renaissance) کا ذکر کیا جا سکتا ہے...... اس جماعت پر ۱۹۸۱ء میں پابندی لگا دی گئی، مگر بعدازاں اٹھالی گئی۔ رشید چنوچی اس کے صدر اور شیخ عبدالفتح اس کے جنرل سیکرٹری ہیں۔(۳)

ملک میں قدامت پرست علماء کے ساتھ ساتھ جدت پسند علماء کی بھی خاصی تعداد موجود ہے۔ اسی بنا پر حکومت نے خواتین کو اسقاطِ حمل کرانے کی اجازت دے رکھی ہے۔(۴)

۱۔ The States man's year book 2007, 130th Edition، ص ۱۲۹۱۔

۲۔ Europa World year Book 2007، ۲/ ۴۳۹۹۔

۳۔ ایضاً، ۲/ ۴۳۱۰۔

۴۔ ایضاً، ۲/ ۴۳۱۲۔

اجتہادی اداروں کا جائزہ:

تیونس ایک عرب افریقن جمہوری ملک ہے، جو ایک طرف جدت پسند ہونے کا دعویدار ہے، تو دوسری طرف......عرب ممالک کے ساتھ مضبوط دینی رشتہ رکھنے کی بنا پر قدامت پرستانہ جذبات واحساسات سے خالی نہیں ہے، تاہم ملک میں......اسلامی نظام کے نفاذ کے حق میں ستر (۷۰) کی دہائی سے، ایک زوردار تحریک موجود ہے، اس کے علاوہ مختلف شہروں میں دینی اور مذہبی ادارے بڑے منظم اور مربوط طریقے پر کام کر رہے ہیں، تاہم ملک میں......اجتماعی اجتہاد کے حوالے سے کوئی خاص تحریک یا ادارہ موجود نہیں ہے۔

تیونس میں قانون سازی سے متعلق تمام اختیارات پارلیمنٹ کو حاصل ہیں اور پارلیمنٹ اپنے فیصلے کرنے میں پوری طرح آزاد ہے۔ وہاں پارلیمنٹ کی امداد واعانت کے لیے علماء کی کونسل بھی موجود نہیں۔

فی الوقت تیونس کا شمار ایک ترقی پذیر اور لبرل ریاستوں میں ہوتا ہے اور وہاں اعتدال پسند طبقہ حکمرانی کے مزے لوٹ رہا ہے۔ اور ملک میں جدید طرز کے قوانین نافذ ہیں۔

❀❀❀

حصہ دوم:

مراکش: (المملکۃ الغربیہ) میں اجتہادی پارلیمنٹ کی کاوشوں کا جائزہ

شمالی افریقہ میں دوسری اسلامی ریاست کا نام مراکش (Moroco) ہے۔ اس کے شمال میں بحر روم، مغرب میں بحر اوقیانوس (بحر ظلمات)، اور جنوب میں صحارا واقع ہے۔ مشرقی جانب اس کی سرحدین علاقہ تل اور وہران کے میدان مرتفع تک پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ سرحد...... جو اسے الجزائر سے جدا کرتی ہے، بالکل رسمی سی ہے...... البتہ شمال کی طرف کوئی اسی میل کی لمبائی تک...... حد بندی مستقل ہے۔(۱)

اس کا کل رقبہ ۷۱۰۸۵۰ (سات لاکھ دس ہزار آٹھ سو پچاس) مربع کلومیٹر ہے اور ۱۹۹۴ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی دو کروڑ، ساٹھ لاکھ انیس ہزار دو سو اسی (۲۶،۰۱۹۲،۸۰) افراد پر مشتمل ہے۔ اور ۲ ستمبر ۲۰۰۴ء کو آبادی کا تخمینہ ۹۱۷،۸۰ ۲۹۸ (دو کروڑ اٹھانوے لاکھ اکیانوے ہزار سات سو آٹھ) افراد کا لگایا گیا ہے۔(۲) اس کا دارالحکومت رباط ہے۔

ملک میں ۹۹٪ آبادی مسلمان ہے، جس میں ۹۰٪ فی صد سنی مسلمان ہیں اور آبادی کا زیادہ تر تعلق مالکی فقہ کے ساتھ ہے۔

اسلامی تعلیمات اور شریعت اسلامیہ کے نفاذ کے لیے وزارت اوقاف ساتھ شاہی فرمان کے ذریعے دو مجالس بھی قائم کی گئی ہیں (۱) مجلس علمی اعلیٰ (۲) مجلس فتویٰ۔ مجلس فتویٰ مجلس علمی اعلیٰ کے ماتحت کام کرتی ہے۔

۱۔ مجلس العلمی الاعلیٰ اور اس کے اغراض و مقاصد

شاہی فرمان میں مجلس العلمی الاعظمی اغراض و مقاصد درج ذیل بیان کیے گئے ہیں:

اسلام اور وحدت عقیدہ و مذہب مراکشی تشخص کا اہم عنصر ہے۔ یہاں کے بادشاہوں نے ہمیشہ اسلامی امور، اس کے احکام پر عمل اور عقائد سے وابستگی پر زور دیا ہے۔ اسلام کی صحیح تعلیم و تدریس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آج بھی ہم اپنے اسلاف کے راستے پر گامزن ہیں۔ جس دور میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اس کے تقاضوں کے مطابق مختلف میدانوں میں تبدیلی کے ذریعے ترقی حاصل ہوئی ہے۔

اجنبی مذاہب و افکار کی مراکشی معاشرے میں اشاعت اور اس کی اصل اقدار کو خطرے کے پیش نظر ضروری ہے کہ ایسے ادارے قائم ہوں جن کے ذریعے بادشاہ سلامت کی رہنمائی میں اسلام کی تعبیر کا کام سرانجام پا سکے۔ اور دینی اور دنیوی امور میں

۱۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۲/۳۹۸؛ The Europa Year Book, 2007، ۲/۳۰۲۵

۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۲/۳۹۸۔

۱۔ ظہیری شریف شاہی فرمان نمبر ۱۰۸۰۲۷۰، مجریہ ۸ اپریل ۱۸۸۱ء...... بحوالہ مجلہ اجتہاد، ص ۱۰۳۔

۲۔ ظہیر شریف، نمبر ۰۳،۳۰۰۔۱، مجریہ...... ۲۲- اپریل ۲۰۰۴ء، دیکھیے مجلہ اجتہاد، ص ۱۰۶۔

ایسے فیصلے کیے جائیں جو زمان و مکان کے تقاضوں کو پورا کریں اور امت (مسلمہ) مغربیہ کے اقدار سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے دیگر مذاہب وافکار سے بے نیاز کر دیں۔

۱۔المجلس العلمی الاعلیٰ صوبائی مجالس کے سربراہوں سے مل کر تشکیل پاتی ہے (۳)۔

۲۔المجلس العلمی الاعلیٰ کسی بھی معروف علمی شخصیت کو اس کی علمی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے معاملات کے پیش نظر مشاورت اور رائے کے اظہار کی غرض سے اپنے اجتماعات میں آنے کی دعوت دینے کی مجاز ہے۔

۳۔ المجلس العلمی الاعلیٰ کا دائرہ اختیار:

(الف) ان مسائل پر بحث کرنا جنھیں بادشاہ سلامت اس کے سامنے پیش کریں۔

(ب) صوبائی مجالس کے امور کو منظم کرنا۔

(ج) عالمی نوعیت کی اسلامی تنظیموں کے ساتھ رابطہ رکھنا، جیسا کہ رابطہ عالم اسلامی اور مؤتمر اسلامی قابل ذکر ہیں۔

۴۔المجلس العلمی الاعلیٰ: سال بھر میں دو عمومی اجلاس منعقد کرتی ہے اور وہ اس بات کی مجاز ہے کہ ہنگامی حالات کے پیش نظر مزید اجلاس بھی منعقد کرے اور یہ اس وقت ہوتا ہے، جب بادشاہ سلامت اس کی ضرورت محسوس کرے اور اسلامی معاملات کا مکلّف حکومتی شعبہ ان اجلاسوں کی ترتیب اور ان کی تاریخ انعقاد طے کرے گا۔

۵۔اعلیٰ مؤظف المجلس العلمی الاعلیٰ کے متعلق ظہیر شریف میں لکھی جانے والی ضروری باتوں کا ذمہ دار ہوگا۔

۶۔ ہر صوبائی مجلس (المجالس العلمیۃ الاقلیمیۃ) ایک صدر اور سات ممبران سے، جو سب کے سب ظہیر شریف کے مطابق متعین کیے گئے ہوں مل کر تشکیل پاتی ہے۔

ہر صوبائی مجلس کسی بھی معروف علمی شخصیت کو اس کی علمی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مشاورت اور رائے کے اظہار کی غرض سے اپنے اجتماعات کے اندر آنے کی دعوت دینے کی مجاز ہے۔

۲۔الھیئۃ العلمیۃ المکلفۃ بالافتاء مجلس افتاء (۴)

شاہ مراکش نے ۲۲ راپریل ۲۰۰۴ء کو ایک خصوصی فرمان کے ذریعے اس کا اجرا کیا تھا۔

۱۔فتویٰ دینے کی مجاز مجلس علمی کا اجتماع، المجلس العلمی الاعلیٰ کے مرکز میں ہوگا اور اگر ضرورت پڑے تو اس کے اجتماعات کا انعقاد مجلس کے سیکرٹری کے فیصلہ کے مطابق کسی دوسری جگہ پر بھی ممکن ہے۔

۲۔فتویٰ دینے کی مجاز مجلس علمی پندرہ ممبران سے تشکیل پاتی ہے، جن میں سے دس ممبران مجالس علمی کے صدور سے منتخب کیے جاتے ہیں جب کہ پانچ ممبران المجلس العلمی الاعلیٰ میں متعین مخصوص علماء سے منتخب کیے جاتے ہیں۔

۳۔ مجلس علمی اور مجلس فتویٰ:

مجلس علمی، فتویٰ دینے کی مجاز مجلس علمی کے تمام ممبران سے بنتی ہے۔ اس کے ساتھ مجلس کے باہر موجود تجربہ کار ماہر علمی شخصیات کو بھی اس کا رکن مقرر کیا جاسکتا ہے۔ منتظم مجلس علمی عمومی کا اجلاس ہر مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ طلب کرسکتا ہے۔ بوقت

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۴۔ ایضاً، ص ۱۰۷

ضرورت ہنگامی اجلاس بھی طلب کیے جاسکتے ہیں۔

۴۔ تحقیق وتدریس:

مجلس علمی کے ہاں بحث ومباحثہ اور تحقیق کے لیے ایسے شعبہ جات ہیں، جو مجلس کے پاس آنے والے مسائل اور حادثات کے متعلق مباحث کے تیار کرنے میں ماہر علمی مجالس کی مدد کرسکیں۔

۵۔ شعبہ تحقیق وتدریس مندرجہ ذیل شعبہ جات سے مل کر تشکیل پاتی ہے:

(الف) فقہ مالکی میں تحقیقی شعبہ

(ب) تقابلی فقہ میں تحقیقی شعبہ

(ج) جدید فقہی معاملات سے متعلق شعبہ اجتہاد

یا کوئی اور ایسا شعبہ جس کی ضرورت اس وقت محسوس ہو۔

۶۔ بحث مباحثہ کے لیے ہر شعبہ مجلس کے ایسے پانچ ارکان جن میں سے ایک رودادنگار ہو، پر مشتمل ہوگا، یاد رہے کہ یہ رودادنگار اپنے شعبہ کے اجلاس میں ارکان کے درمیان رابطے کا کام بھی سرانجام دے گا(۵)۔

۷۔ فتویٰ دینے کی مجاز مجلس علمی فتویٰ دینے کے لیے درخواستیں شاہ فرمان (1.03.300) کی دفعہ (۷) کے احکامات کے مطابق المجلس العلمی الاعلیٰ کے صدر امیر المؤمنین کی وساطت یا مجلس کے سیکرٹری جنرل کی وساطت سے وصول کرے گی اور آخری صورت میں سیکرٹری جنرل کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ فتویٰ کے لیے ہر درخواست جو اس کے پاس پہنچتی ہے، مذکورہ مجلس کے سامنے پیش کرنے کے لیے المجلس العلمی الاعلیٰ سے منظوری لے۔

۸۔ مجلس فتویٰ وصول کردہ درخواستوں کو تشکیل شدہ ماہر تعلیمی کمیٹیوں کے سامنے پیش کرے گی۔

۹۔ ہر کمیٹی فتوی کی غرض سے وصول شدہ درخواستوں کو بغور پڑھے گی اور ہر پیش آمدہ معاملے کے بارے میں باوثوق علمی آراء کی روشنی میں فیصلہ کرے گی۔ مجلس علمی واضح، آسان اور مختصر عبارت میں فیصلے صادر کرے گی جو اتفاق رائے سے مجالس علمی کی آراء کے مطابق ہوں گے۔

۱۰۔ مجلس علمی کی طرف سے صادر ہونے والے فتووں کی صورت میں فیصلے شائع ہونے سے قبل المجلس العلمی الاعلیٰ کے باقی ارکان کے علم میں لائے جائیں گے۔

۱۱۔ فتویٰ دینے کی مجلس علمی کی طرف سے صادر کیے گئے فتوؤں کو ایک مخصوص رجسٹر میں محفوظ کیا جائے گا اور اس کی نشرواشاعت کی غرض سے المجلس العلمی الاعلیٰ تمام ممکنہ وسائل کو بروئے کار لائے گی(۶)۔

۲۔ قانون سازی

مراکش میں قانون سازی کا عمل دستور یا کسی اور قانونی ذریعہ کے فراہم کردہ مراحل سے بالترتیب ہوکے گزرتا ہے۔ قانون سازی کا یہ عمل کافی حد تک فرانسیسی ماڈل سے اخذ کیا گیا ہے۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۶۔

ابتدائی مرحلہ:

نیا قانون بنانے یا اس میں ترمیم کی ضرورت بادشاہ کے ان خطبات سے جو وہ ہر آئینی سال کے افتتاحی اجلاس سے کرتا ہے یا وزیر اعظم کے نام سے اس کے خط یا دیگر قومی اجلاسوں اور کانفرنسوں کو شاہ کی طرف سے بھیجے ہوئے خطوط سے طے ہوتی ہے۔ اور اس سلسلے میں بادشاہ حکومت اور پارلیمنٹ کو قانون مرتب کرنے کے لیے عمومی ہدایات فراہم کرتا ہے۔

علاوہ ازیں قانون بنانے کی ضرورت حکومتی اعلانات، وزارتی حکمت عملی اور دیگر علاقائی، دوطرفہ یا کثیر الملکی بین الاقوامی معاہدات کے نتیجے میں سامنے آجاتی ہے۔

مسودہ تیار کرنے کا مرحلہ:

قانونی مسودہ کسی مخصوص وزارت یا چند وزراء کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے جس کے اغراض و مقاصد کا اس وزارت سے تعلق ہو۔ ابتدائی خاکہ قانونی ماہرین تیار کرتے ہیں جس میں جنرل سیکرٹریٹ آف گورنمنٹ کی حمایت بھی شامل ہو سکتی ہے۔

مسودہ وزراء کی آراء جاننے اور اس پر اپنے خیالات کے اظہار کی غرض سے متعلقہ وزارت کو بھیج دیا جاتا ہے۔ ایسی تنظیموں اور این جی اوز سے اور دیگر ماہرین سے بھی مسودے کی تشکیل کے مرحلے میں مشورہ لیا جاسکتا ہے جن کا ایسے قوانین سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔

وزراء کی آراء حاصل کرنے کے بعد ڈرافٹ جنرل سیکرٹریٹ آف گورنمنٹ کو بھیج دیا جاتا ہے جو ڈرافٹ کی آئینی حیثیت موجودہ قوانین اور اس کے اصول وضوابط سے ہم آہنگ ہونے کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور پھر تمام وزراء کی آراء جاننے کی غرض سے ساری وزارتوں کو اس کا مسودہ بھیج دیا جاتا ہے۔

جنرل سیکرٹریٹ آف گورنمنٹ وزیر اعظم کی توثیق کے بعد ڈرافٹ کو بحث ومباحثہ کے لیے حکومتی شوریٰ کے پاس جمع کرا دیتا ہے جو ڈرافٹ کو مجلس وزراء کے سامنے مطالعہ کی غرض سے پیش کرتی ہے۔ اس اجلاس کی صدارت خود امیر المؤمنین فرماتے ہیں۔ یہ نہایت نازک مرحلہ ہوتا ہے، کیونکہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو حکومتی شوریٰ کے لیے تو قابل قبول ہوتی ہیں لیکن مجلس وزراء ان سے اختلاف کر سکتی ہے۔ یہاں ڈرافٹ کی منظوری کے فوراً بعد وزیر اعظم اسے پارلیمنٹ کے سامنے رکھتا ہے۔

ڈرافٹ کو پارلیمنٹ کے دو میں سے کسی بھی ایک ایوان، ایوان نمائندگان یا ایوان کونسلران کے پاس بھیجا جاسکتا ہے لیکن دونوں ایوانوں سے ووٹ حاصل کرنا ضروری ہے۔ ہر چیمبر میں ڈرافٹ کے اوپر پہلے ایک مخصوص مستقل پارلیمنٹری کمیشن میں اس کے اغراض ومقاصد کے حوالے سے بحث کی جاتی ہے اور جہاں شق بہ شق، لفظ بہ لفظ اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور اختلاف کی صورت میں مسودے کو اسی مرحلے میں بھی نامنظور کیا جاسکتا ہے اور اگر مستقل کمیشن اسے منظور کر لے تو عام بحث ومباحثہ کے لیے بھیجا جائے گا اور پھر رائے شماری ہوگی۔

یہی عمل دوسرے ایوان میں بھی ہوگا اور کوئی بھی مسودہ اس وقت تک آگے نہیں جاسکتا جب تک پہلے ایوان سے منظور نہ ہولے۔

اگر کسی قانونی مسودے کو دونوں ایوانوں نے دو مرتبہ پڑھنے کے بعد بھی منظور نہیں کیا تو حکومت ایک مشترکہ دوطرفہ کمیٹی تشکیل دے گی جو دونوں ایوانوں کی نمائندگی کرے گی، تاکہ ایک متفقہ مسودہ منظور ہو۔ اس مسودہ کو دونوں ایوانوں کے پاس منظور

کرنے کی غرض سے بھیجا جائے گا۔اس مرحلے میں حکومتی مرضی کے بغیر کسی بھی قسم کی ترمیم قبول نہیں کی جائے گی۔

دونوں ایوانوں سے مسودہ منظور ہونے کی صورت میں وزیراعظم مجلس وزراء کے پاس واپس لے جائے گا جو اسے شاہی کابینہ کے پاس مہر شاہی (تشہیر) کی غرض سے رکھے گا۔بادشاہ تیس دن کے اندر دستخط کرے گا۔اس طرح مسودہ قانون بن جاتا ہے اور جنرل سیکرٹریٹ آف گورنمنٹ کو سرکاری جریدے میں شائع کرنے کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔(۷)

خلاصہ بحث

۱۔مراکش ایک بہت قدیم ریاست ہے، جس کی تاریخ نے ہر دور میں ملکوں کی تاریخ کو متاثر کیا۔

۲۔مراکش کے آئین میں اگرچہ دورکنی پارلیمنٹ موجود ہے لیکن دینی اور مذہبی مسائل کے حل اور ان سے متعلق قانون سازی کے لیے حکومت نے پارلیمنٹ کی مدد کے لیے قومی اور صوبائی سطح پر فتویٰ مجالس اور علمی مجالس قائم کر رکھی ہیں جن سے نچلی سطح سے دینی اور مذہبی مسائل کے متعلق ''حصول آراء'' کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور مختلف سطحوں پر ان آراء کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

۳- آخر میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوان اس کی حتمی منظوری دیتے ہیں جس کے بعد وہ قانون بن جاتا ہے۔

۴- اور اگر دونوں ایوان یا ان میں سے کوئی ایوان اس کی منظوری نہ دے تو ایسی صورت میں دونوں ایوانوں کی مشترکہ کمیٹی اس پر دوبارہ غور کرتی ہے اور ایک نیا مسودہ تیار کر کے دونوں ایوانوں سے منظوری لی جاتی ہے۔

اس طرح مذہبی مجالس کے فتاوٰی کی روشنی میں قانون سازی کا مرحلہ نہایت آسانی سے مکمل کرلیا جاتا ہے۔

۷۔ دیکھیے رسالہ اجتهاد، ص ۱۰۷-۱۰۸۔ترتیب حضرت بلال۔

فصل سوم: حصہ اوّل

جمہوریہ مصر اور اس کے اجتہادی ادارے

مصر......قبل از مسیح کے دور سے......تہذیب وتمدن انسانی کا مرکز رہا ہے......اس کی تہذیب وتمدن نے آس پاس کے کئی ملکوں......خصوصاً قدیم اسرائیل......اور روم ویونان کی تہذیبوں کو متاثر کیا ہے(۱)......یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس (Herodotas) سمیت اس کا ذکر قدیم ترین مؤرخین کے ہاں ملتا ہے......اس کے علاوہ قرآن حکیم اور بائبل......دونوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔(۲)

اسلامی مملکت کے طور پر، عصری تاریخ کا آغاز حضرت عمرو بن العاص کی فتح مصر (۱۸ھ/۶۳۹) سے ہوتا ہے......خلفائے راشدین...... کے بعد یہاں پہلے بنو امیہ (۴۰ھ/۶۶۱ء-۱۳۲ھ/۷۴۲ء) کی اور پھر بنو عباس (۱۳۲ھ/۷۵۰ء-۲۹۲ھ/۱۹۰۵ء) کی حکومت رہی، بعدازاں خاندان ابن طولون، اخشیدیہ، فاطمی حکمرانوں، ایوبیوں (۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء-۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء)، بحری مملوکوں(۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء تا ۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء)، بری مملوکوں (۷۹۲ھ/۱۳۹۰-۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء)، عثمانی ترکوں (۹۲۳ھ/ ۱۵۱۷ء-۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۸ء)، کی حکومت رہی (۳) نپولین بونا پارٹ اپنے ہمراہ مترجموں اور علمائے ریاضیات اور علمائے طبعیات کی ایک جماعت ہمراہ لایا تھا، اس نے ''المجمع العلمی الفرنسی'' کی طرز پر ''المجمع العلمی المصری(Istituted, Egypt) قائم کیا.. جس کے تحت وصف مصر(Desereption d Egypt) جیسی کتب اشاعت پذیر ہوئیں۔(۴)

۲۔ مصر میں پارلیمنٹ کے معاون اداروں کا تعارف:

دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح مصر میں بھی قانون سازی اور اجتہاد کے تمام اختیارات پارلیمنٹ کو حاصل ہیں ''مصر'' میں دینی اور شرعی احکام کے سلسلے میں جامعۃ الازھر اور اس کے اداروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

آیئے......اب مصر میں اجتماعی اجتہادی اداروں کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں، کہ اس پہلو سے مصر...... کے اجتہادی اور فقہی ادارے کیا کام کر رہے ہیں۔

مصر کے اجتہادی اداروں میں جامعہ الازھر کو مرکزی اور اساسی حیثیت حاصل ہے، لہٰذا اس سے قبل کہ اس کے تحت قائم

---

۱ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰/۱۸۶-۱۸۷ (بذیل مقالہ مصر)

۲ ایضاً۔

۳ ایضاً۔

۴ ایضاً، ص ۱۸۸۔

ہونے والے اجتہادی اداروں کا ذکر کیا جائے الازہر کا تعارف مناسب ہوگا:

تیسری صدی ہجری کے دوران مرکز خلافت میں عباسی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسلامی دنیا میں کئی قوتوں نے سر اٹھایا، جن میں فاطمی خاندان بھی شامل ہے جو خود کو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ الزہراءؓ کی اولاد قرار دیتا تھا۔ تاہم ان کے لیے یہ اعزاز کافی ہے، کہ انہوں نے الازہر کی صورت میں عظیم ترین ورثہ چھوڑا ہے۔(۵)

یہ تحریک ابتدا میں مراکش میں پروان چڑھی اور پھر معروف ماہر حرب جوہر صقلی نے چوتھی صدی ہجری کے وسط میں مصر پر حملہ کیا اور وہ اسکندریہ کو فتح کرتے ہوئے ۱۱ شعبان ۳۵۸ھ/ ۹۶۹ء کو مصر کے قلب و مرکز فسطاط تک پہنچ گیا۔ اور یوں پورا مصر اس کے زیر نگیں آ گیا۔ اس نے اہل مصر کو امان دیتے ہوئے ان سے یہ وعدہ کیا کہ ان کی مذہبی آزادی برقرار رہے گی۔(۶)

اس نے سابقہ دارالحکومت فسطاط کو اپنے لیے موزوں اور مناسب نہ پا کر اپنی آمد کے چھ دنوں کے بعد یعنی ۱۷ شعبان ۳۵۸ھ/ ۹۶۹ء کو اس وقت کے حکمران المعز لدین اللہ کے ایماء پر دریائے نیل کے کنارے قاہرۃ المعزیہ شہر کی بنیاد رکھی۔(۷)

جوہر صقلی بڑا منتظم اور مدبر شخص تھا۔ اس نے اس نئے شہر کے مرکز میں ایک جامع مسجد کی بھی تاسیس کی۔ یہ ۱۴ رمضان المبارک ۳۵۹ھ/ ۹۷۱ء کا واقعہ ہے۔ یہ نئی مسجد قاہرہ ہی کی نسبت سے ''جامع القاہرہ'' کہلائی اور اسے دو سال میں یعنی ۳۶۱ھ میں مکمل کیا اور تکمیل کے بعد اس میں پہلی نماز جمعہ ۷ رمضان المبارک ۳۶۱ھ میں ادا کی گئی۔(۸)

بعد ازاں ''العزیز باللہ'' کے دور حکومت میں مسجد کے آس پاس فاطمی محلات تعمیر ہوئے، جن کا نام حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے نام سے استفادہ کرتے ہوئے؟ القصور الزہراء'' رکھا گیا۔ اسی نسبت سے بعد ازاں مسجد کا نام بھی ''جامع الازہر'' پڑ گیا(۹)۔ یا پھر شروع سے ہی...... اس کا یہ نام رکھا گیا...... اور اس کی نسبت حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے نام الزہراء...... سے کی گئی ہے۔

۲۔ الازہر بطور ایک تعلیمی مرکز:

اس دور میں یہ روایت بھی تھی کہ جو مسجد بھی تعمیر ہوتی اسے ایک تعلیمی اور تدریسی مرکز کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا، چنانچہ مسجد نبوی، مسجد حرام، جامع مسجد کوفہ، جامع مسجد بغداد اور جامع القرویین وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں، اسی بنا پر جامع الازہر تعمیر ہوئی تو اسے ایک تعلیمی مرکز کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ چنانچہ الازہر کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ۳۷۸ھ/ ۹۸۸ء میں جب نامور شیعی فقیہ اور عالم دین یعقوب بن کلس نے، جو العزیز باللہ اور اس کے بیٹے کے زمانے میں ان کا وزیر تھا، یہاں اپنا تدریسی منصب سنبھالا، تو اس

۵۔ اللجنۃ العلیا للاحتفال بالعید الالفی الازہر، الازہر تاریخہ وتطورہ...... بار دوم، القاہرہ، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء، ص ۲۷۔

۶۔ دیکھیے...... المقریزی، اتعاظ الحنفا باخبار الائمۃ الخلفاء، ص ۶۷--۷۰۔

۷۔ اس کی وجہ تسمیہ کے ضمن میں نامور مؤرخ...... المقریزی نے درج ذیل آراء دی ہیں:

چونکہ اس کی اساس جب رکھی گئی، اس وقت القاہر نامی ستارہ طلوع ہو رہا تھا۔ اس لیے یہ نام رکھا گیا۔

اس سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ جو کوئی اس حکم سے منہ پھیرے گا اور اس کے امیر کے خلاف بغاوت کرے گا، وہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے گا۔

یہ المعز لدین اللہ کے اس قول پر مبنی ہے، کہ اس نے جوہر کو یہ ذمہ داری سونپتے ہوئے کہا تھا ولتبد خلن فی خرابات ابن طولون و تبنی مدینۃ تقھر الدنیا (مقریزی، خطط۔ ۱/ ۲۷۳)۔

۸۔ دیکھیں الازہر تاریخہ و تطورہ، مطبع الشرکۃ المصریۃ العامۃ للطباعۃ والنشر، القاہرۃ، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء، ص ۲۷۔

۹۔ ایضاً، ص ۳۱، ۳۲۔

نے "العزیز باللہ" الفاطمی سے یہ درخواست کی کہ اس مسجد کو جامعہ/ دانش گاہ میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ اور یہاں دینی اور عقلی علوم وفنون کی تعلیم وتدریس شروع کی جائے۔ (۱۰) چنانچہ یعقوب بن کلس یہاں بیٹھ کر لوگوں کو تعلیم دیتا تھا اور اس نے اسماعیلی شیعی فقہ پر اپنی کتاب یہیں پڑھ کر لوگوں کو سنائی تھی (۱۱)۔ یعقوب بن کلس کی تجویز پر "مسجد الازھر" کو "جامع الازھر" میں تبدیل کر دیا گیا اور مذکور فاطمی حکمران المعز لدین اللہ نے "جامع الازھر" کے آس پاس فقہا کے لیے ۳۵ مکانات بنوائے...... جو یہاں نماز جمعہ کے بعد اکٹھے ہوتے تھے، اور نماز عصر تک قرآن کریم پڑھا کرتے تھے...... خلیفہ نے ان کی تنخواہیں اور وظائف بھی مقرر کر دیئے تھے۔ (۱۲)

پھر جب دو صدیوں کے بعد تقریباً ۵۶۷ھ/ ۱۱۷۱ء میں مصر اور شام وغیرہ پر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی حکومت قائم ہوئی اور فاطمی دور حکومت اختتام پذیر ہو گیا تو اس نے یہاں ان کا خطبہ جمعہ میں نام لینا بھی بند کرا دیا اور شیعی مذاہب سے متعلق تعلیم وتدریس کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔ البتہ ائمہ اربعہ اور ان کے مسالک کی تدریس بدستور جاری رہی، تاہم ایوبی حکمران چونکہ شافعی المسلک تھے اس لیے شافعی قاضی اور شافعی مسلک کو دوسرے مسالک کی تعلیم وتدریس پر فوقیت حاصل رہی۔ (۱۳)

لیکن جب ۶۴۸ھ/ ۱۲۵۰ء میں مملوک سلاطین میں سے، سلطان الظاہر بیبرس نے حکومتی بھاگ ڈور سنبھالی، تو اس نے نہ صرف جامع الازھر میں خطبۂ جمعہ بحال کیا، بلکہ یہاں شافعی قاضی کے ساتھ دوسرے مسالک کے قضاۃ بھی بٹھا دیئے اور تمام فقہی مسالک کی تعلیم وتدریس میں یکسانیت بحال کر دی (۱۴)، اس وقت سے الازھر کے دروازے تمام مسالک کے لوگوں اور ان کی تعلیم کے لیے کھلے ہیں۔ (۱۵)

۳۔ الازھر بطور دار الفتاء:

تاہم اپنی تاسیس سے لے کر چودھویں صدی ہجری کے اوائل/ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک جامع الازھر صرف ایک تعلیمی اور تدریسی درسگاہ کے طور پر کام کرتی رہی اور اس کا اجتہاد اور فتویٰ کے اجراء کے ساتھ کوئی تعلق اور واسطہ نہ تھا، لیکن چودھویں صدی کے اوائل میں یہاں ایک اہم تبدیلی آئی اور ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۸۶ء میں اس وقت کے شیخ الازھر الشیخ حسونہ النووی کو منصب افتاء پر فائز کیا گیا اور ان کے فتاوی ضبط تحریر میں لائے جانے لگے۔

اس کے چند سال بعد ۲۴ محرم الحرام ۱۳۱۷ھ/ ۳ جون ۱۸۹۹ء، کو شیخ محمد عبدہ کا باقاعدہ اس منصب پر تقرر عمل میں لایا گیا، چنانچہ اس منصب پر ان کے بعد شیخ محمد نجیب مطیعی، الشیخ عبد الرحمٰن قراعہ، اور الشیخ حسنین محمد مخلوف، وغیرہ کا تقرر عمل میں لایا گیا (۱۶)۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۳۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔

۱۲۔ دیکھیے المقریزی، خطط، ۱/ ۳۹۔

۱۳۔ الازھر تاریخہ وتطورہ، ص ۱۰۷، ۱۰۸۔

۱۴۔ الازھر تاریخہ وتطورہ، ص ۱۰۹-۱۱۰۔

۱۵۔ دیکھیے، الازھر بذیل جامعۃ، در کتاب مذکور، ص ۱۰۲ تا ۱۷۰۔

۱۶۔ دیکھیے، الازھر بذیل جامعۃ، ص ۳۲۲۔

۴۔ ہیئۃ کبار العلماء کا قیام:

الازھر آہستہ آہستہ تعلیمی اور تدریسی میدان میں بھی ترقی کرتا رہا اور اس کے قدم اجتہاد اور فتویٰ کے میدان میں بھی آگے بڑھتے رہے، چنانچہ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۱ء میں ایک خصوصی قانون کے ذریعے تیس (۱۷) اساتذہ کرام اور جید علماء و فقہاء پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جس کا نام "ھیئۃ کبار العلماء" رکھا گیا۔ اس کے صدر اور رئیس و سربراہ شیخ سلیم البسری تھے، مجلس کے تمام فقہا میں سے ہر ایک عالم کسی نہ کسی فن میں خصوصی مہارت رکھتا تھا، اس مجلس کے فرائض منصبی میں جہاں الازھر میں دینی علوم و فنون کی تدریس اور تعلیم تھی، وہیں دینی اور مذہبی مسائل و معاملات میں لوگوں کی رہنمائی کرنا بھی شامل تھا۔ (۱۸)

اس مجلس کی رکنیت کے لیے درج ذیل شرائط تھیں:

۱۔ متعلقہ شخص کی عمر ۴۵ برس سے کم نہ ہو۔

۲۔ وہ کم از کم دس سال الازھر میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و تدریس سے منسلک رہا ہو، جن میں سے کم از کم چار سال اس نے "درجہ عالیہ" میں تدریسی فرائض انجام دیئے ہوں۔

۳۔ علوم اسلامیہ کے کسی نہ کسی موضوع پر اس نے کوئی کتاب (تصنیف) مرتب کی ہو، یا اس کی علمی خدمات میں اعتراف کے طور پر اسے کوئی ایوارڈ دیا گیا ہو جس کا ذکر اس قانون کی ۱۲۲ ویں شق میں کیا گیا ہے۔

۴۔ وہ صاحب فضل و تقویٰ ہو اور اس کا ماضی بھی بے داغ ہو۔ (۱۹)

۵۔ لجنة كبار العلماء:

مذکورہ بالا تنظیم ایک ڈھیلی ڈھالی تنظیم تھی اور اس کی افادیت بھی زیادہ تر الازھر تک محدود تھی، اسی لیے نامور عالم، ماہر تعلیم اور ماہر فقہ و اصول فقہ ڈاکٹر مصطفیٰ المراغی نے ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۴ھ/ ۱۱-اگست ۱۹۳۵ء کو "ھیئة كبار العلماء" کو "لجنة كبار العلماء" میں تبدیل کر دیا۔ اس نئی مجلس میں...... اس کا ایک صدر اور گیارہ اراکین شامل تھے۔ جن میں تین حنفی، تین مالکی، تین شافعی اور دو حنبلی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، یہ نئی کمیٹی لوگوں کی دینی مسائل و معاملات میں رہنمائی کرنے اور ان کے سوالات کا جواب دینے کی ذمہ دار تھی، اگر سوال کسی مسلک کے مطابق پوچھا جاتا تو اسی مسلک کے مطابق جواب دیا جاتا، ورنہ قرآن و سنہ اجماع اور قیاس کی روشنی میں جواب دیا جاتا تھا۔ (۲۰)

۱۷۔ الازھر، تاریخہ و تطورہ، ص ۱۹۱۔

۱۸۔ ....؟؟؟؟

۱۹۔ الازھر، تاریخہ و تطورہ، ص ۱۹۱-۲۹۱۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۰۳-۲۰۴۔ اس مجلس کے فتویٰ دینے کی ایک مثال درج ذیل ہے: "کسی عورت کا کتنی مقدار میں دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ فقہاء کے درمیان مختلف فیہ ہے، یہاں درج ذیل مسالک ہیں:

۱۔ ایک گھونٹ (رضعة واحدة) سے، حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔

۲۔ تین گھونٹ (رضعات) سے، حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔

۳۔ ابتدائی عمر کے دو سالوں کے درمیان پانچ گھونٹ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے، لجنہ نے آخری قول جو امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا ہے، فتویٰ کے لیے اختیار کر لیا (کتاب مذکور، ص ۲۰۴)۔

بعدازاں ایک قرارداد/ قانون کے ذریعے درج ذیل افراد کو اس کی رکنیت کے لیے مقرر کردیا گیا:

۱۔ الشیخ عبداللطیف السبکی (احمد بن حنبل)

۲۔ الشیخ محمود عبدالکریم (مذہب امام شافعی)

۳۔ الشیخ محمد الکشفی (حنفی مسلک)

۴۔ الشیخ السوسی احمد (مالکی)

کمیٹی کے ہر ماہ چار اجلاس ہوتے تھے اور طویل بحث و مباحثے کے بعد فتوے جاری کیے جاتے تھے، اس کے فتاوی کی کثرت کا اس امر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صرف ایک سال ۱۹۳۶ء میں کمیٹی سے ۲۱۴۸ مسائل پوچھے گئے اور مجلس نے ۲۰۰۰ مسائل کا جواب دیا(۲۱)۔ان میں سے ۳۵ فیصد میراث سے، ۳۰ فیصد طلاق سے، ۱۵ فیصد رضاعت سے اور ۲۰ فیصد مختلف موضوعات سے متعلق تھے، اوران میں سے اکثر کا تعلق عبادات اور معاملات سے تھا۔(۲۲)

۶۔ جماعۃ کبار العلماء:

تاہم ابھی اس مجلس نے محض دو سال کا ہی سفر طے کیا تھا، کہ ۱۹۳۶ء میں اس کا نام بدل کر ''جماعۃ کبار العلماء'' رکھ دیا گیا اور اس کے لیے انتخاب میں سابقہ شرائط کو برقرار رکھتے ہوئے مزید شرائط بڑھادی گئیں، جن میں سے ایک یہ تھی کہ اس مجلس کا رکن بننے والے متعلقہ افراد کے لیے ضروری ہے کہ انہوں نے دینی علوم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہو، خواہ وہ الازھر کے اندر رہ کر ہو، یا الازھر سے باہر رہ کر ہو، اور انہوں نے کوئی علمی مقالہ پیش کیا ہو، جس سے بحث و تحیص کا کوئی نیا علمی پہلو سامنے آتا ہو۔(۲۳)

علمائے کرام اس مجلس کے تاحیات رکن رہتے تھے، مگر الشیخ عبدالرحمان تاج کے شیخ الازھر بننے پر جب......علمائے ازھر کو ۶۵ سال کی عمر میں ریٹائر کرنے کا قانون بنا، تو اس مجلس جماعۃ کبار العلماء...... کے لیے عمر کی حد ۷۰ برس مقرر کردی گئی۔(۲۴)

۷۔ مجمع البحوث الاسلامیہ کا قیام:

پھر جب مصر میں انقلاب آیا اور صدر جمال عبدالناصر نے ملک کی قیادت سنبھالی تو اس نے انقلابی قانون ۱۰۳ کے ذریعے......الازھر کی امت اسلامیہ، خصوصاً عربوں کے لیے خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اسے مسلم ثقافت اور دینی امور کی توضیح و تشریح کے لیے سب سے بڑا ادارہ قرار دیا اور اسے یہ اختیار دیا کہ وہ اسلام کے آفاقی پیغام کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا میں ہونے والی انسانی ترقی کا ساتھ دے اور انسانی بہبود کے لیے کام کرسکے(۲۵)۔

اس انقلابی قانون کے تحت......شیخ الازھر کو ''الامام الاکبر'' کا درجہ دے کر دینی اور شرعی معاملات میں اس کی رائے کو حتمی قرار دے دیا گیا......اور جامعۃ الازھر کو پانچ شعبوں میں تقسیم کردیا گیا۔جن کی نگرانی کا شیخ الازھر کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

۲۱۔ الازھر تاریخہ و تطورہ، ص ۲۰۲۔

۲۲۔ ....؟؟

۲۳۔ ایضاً۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۹۲۔

۲۵ الازھر تاریخہ و تطورہ، ص ۱۹۲۔

۱۔ الازہر...... یونیورسٹی

۲۔ مجلس اعلیٰ برائے جامعۃ الازہر

۳۔ مجمع البحوث الاسلامیہ

۴۔ ادارہ الثقافۃ الاسلامیہ والبحوث الاسلامیہ

۵۔ الازہر، سکول سسٹم

اسی طرح مجمع البحوث الاسلامیہ ۱۹۶۱ء کے قانون نمبر ۱۰۳ کی دفعہ ۱۵ کے تحت وجود میں آنے والا...... الازہر کا ایک اہم ادارہ ہے جو الازہر کے تابع ہے۔

دنیائے اسلام کی جید اور منتخب شخصیات پر مشتمل مجمع کے اراکین اور ممبران کی تعداد ۵۰ ہے، ان میں تمام مسالک کی نمائندہ شخصیات شامل ہیں۔ ۵۰ میں سے بیس کا تعلق مصر کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک سے ہونا ضروری ہے، اس کی رکنیت کے درج ذیل شرائط ہیں:

۱۔ اس کی عمر چالیس سال یا اس سے زیادہ ہو۔

۲۔ وہ متقی اور پرہیزگار ہو اس کا ماضی بے داغ ہو۔

۳۔ وہ الازہر یا علوم اسلامیہ کی تعلیم دینے والے کسی ادارے سے اعلیٰ ڈگری یافتہ ہو۔

۴۔ علوم اسلامیہ میں اس کی عمدہ تصنیفات ہوں، یا درجہ عالیہ میں علوم اسلامیہ کا پانچ سالہ تدریسی تجربہ رکھتا ہو، یا اس نے پانچ سال تک بطور مفتی یا قاضی خدمات انجام دی ہوں۔

۵۔ اس کی اس منصب پر تقرری...... شیخ الازہر کی سفارش پر صدر جمہوریہ کی طرف سے ہوگی۔(۲۶)

اس کی دوسری شرائط/تفریعات درج ذیل ہیں:

۱۔ اس کے نصف اراکین مجمع ہی کے لیے کام کریں گے۔

۲۔ اس کا سربراہ شیخ الازہر ہوگا۔

۳۔ اس کا ایک امین العام (جنرل سیکرٹری) ہوگا۔ جس کا تقرر...... شیخ الازہر کی سفارش پر صدر جمہوریہ کرے گا، اس کا تعلق مجمع کے اراکین سے ہوگا۔

۴۔ مجمع کی مجلس، سربراہ سیکرٹری متفرغ اور غیر متفرغ اراکین پر مشتمل ہوگی۔

۵۔ ہر ماہ اس کا کم از کم ایک اجلاس ضروری ہوگا جس میں اراکین کی اکثریت کی حاضری ضروری ہوگی۔

۶۔ مجمع کا صدر دفتر مجمع کے سیکرٹری جنرل کی سربراہی میں کام کرے گا، اسے ثقافت اسلامیہ کا ڈائریکٹر چلائے گا۔

۷۔ صدر دفتر میں مجمع کے امین العام اور جوائنٹ سیکرٹری کے دفاتر ہوں گے، جسے وہ اپنے اپنے ماتحت ملازمین کی مدد سے چلائیں گے۔(۲۷)

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۹۲۔

۲۷۔ الازہر، تاریخہ وتطورہ، ص ۱۹۳۔

۸۔ مجمع البحوث الاسلامیہ کے فرائض وواجبات:

۱۹۶۱ء کے قانون نمبر ۱۰۳ کی شق نمبر ۱۲ کے مطابق مجمع کی ذمہ داریاں اور اس کے فرائض مندرجہ ذیل ہوں گے۔

۱۔ علوم اسلامیہ کی مختلف شاخوں (Branches) میں وسیع اور گہری تحقیق کا اہتمام کرنا۔

۲۔ ثقافت اسلامیہ کی تجدید اور اس کے خلاف اٹھائے جانے والے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا۔

۳۔ ہر طبقے اور ہر ماحول کے اعتبار سے......اسلام کی وسعتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، ثقافت اسلامیہ کو پیش کرنا۔

۴۔ اسلام کے علمی ورثے کی تحقیق اور اس کی نشر واشاعت کرنا۔

۵۔ عوام الناس کی دینی، اجتماعی اور اقتصادی مشکلات میں رہنمائی کرنا۔

۶۔ حکمت اور اخلاق حسنہ کے ساتھ اسلام کی تبلیغ ودعوت کا اہتمام کرنا۔

۷۔ پوری دنیا میں شریعت اسلامیہ کے متعلق طبع وتالیف ہونے والے مواد میں صحیح اور درست مواد کی تائید اور ناروا اور غلط باتوں کی تردید۔

۸۔ الازھر اور پوری دنیا کے مابین......علمی تبادلے کے لیے نظام کے خاکے تیار کرنا۔

۹۔ جامعۃ الازھر میں درجہ عالیہ (High education) کو چلانے کے لیے معاونت اور اس کی تحقیقی سرگرمیوں کی نگرانی۔

۱۰۔ علوم اسلامیہ کی بحث وتحقیق پر حکومت کی طرف سے دیئے جانے والے ایوارڈ اور مقابلے کے لیے قواعد اور اصول تیار کرنا۔(۲۸)

۹۔ مجمع البحوث کی ذیلی کمیٹیاں اور ادارے:

۱۹۶۱ء سے شروع ہونے والے سفر کے نتیجے میں اس وقت مجمع ایک انتہائی فعال اور طاقت ور ادارے کی صورت اختیار کر چکا ہے اور یہ اندرون وبیرون ملک ''مصری اسلام'' کے فروغ اور اس کی اشاعت میں وسیع کردار ادا کر رہا ہے، فی الوقت اس کے درج ذیل ادارے کام کر رہے ہیں:

۱۔ ادارة البحوث الاسلامیه:

یہ ادارہ بیرون ملک سے علماء اور مختلف تعلیمی اداروں کی درخواست پر علماء اور مدرسین کو دوسرے ملکوں میں روانہ کرتا ہے، یہ مصری مندوبین ادارے کی طرف سے بیرون ملک تعلیم وتدریس کی خدمات انجام دیتے ہیں اور ان کی تنخواہ اور ان کی مراعات حکومت مصر ادا کرتی ہے۔(۲۹)

۲۔ مراقبة البحوث الاسلامیه:

مصر دنیائے اسلام کا ایک ایسا ملک ہے جہاں تعلیمی نظام صدیوں کا تسلسل رکھتا ہے۔ دنیا بھر سے لوگ یہاں سے خصوصاً الازھر سے تعلیم حاصل کرنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ بیرون ملک سے آنے والے طلبہ کا استقبال اور دوران تعلیم انہیں سہولتیں مہیا کرنا

۲۸۔ مجمع البحوث الاسلامیۃ، ص ۹۲-۹۳۔

۲۹۔ مجمع البحوث الاسلامیۃ، ص ۹۲-۹۳۔

اسی ادارے کی ذمہ داری ہے، یہی ادارہ ازہری طلبہ کو بیرونی ملک بھیجنے کا انتظام بھی کرتا ہے۔ (۳۰)

۳۔ لجنة الفتوى:

الازھر......ایک بڑی یونیورسٹی اور دانش گاہ ہی نہیں، بلکہ ایک بہت بڑا دینی اور اسلامی مرکز بھی ہے، اسی لیے لوگ اس جامعہ سے علمی اور شرعی رہنمائی کا حصول بھی چاہتے ہیں چنانچہ یہ شعبہ ادارہ کو موصول ہونے والے سوالوں کا شرعی احکام کے مطابق جواب دیتا ہے۔

۴۔ ادارة البحوث والنشر والثقافة الاسلامیه:

یہ ادارہ ملک میں دینی اور مذہبی موضوعات پر چھپنے والی کتب اور دوسرے مواد پر نظر رکھتا ہے، اور حسب ذیل خدمات انجام دے رہا ہے:

۱۔ قرآن حکیم کی طباعت کا اجازت نامہ جاری کرنا۔

۲۔ بیرون ملک سے چھپ کر آنے والے قرآن حکیم کے نسخوں کو دیکھنا اور ان کی پڑتال کرنا۔

۳۔ دینی اور مذہبی کتابوں کی اشاعت سے قبل جانچ پڑتال کرنا، ادارہ کی طرف سے تقریباً تین سو کتب اور اتنی ہی آڈیو ویڈیو کیسٹیں چھپوائی گئی ہیں۔

۴۔ غیر ملکی زبانوں میں اسلام کے بارے میں مطبوعہ کتب کی چھان بین کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔

۵۔ عرب ممالک اور مصر میں اسلامی تہذیب وثقافت کو عام کرنے کے لیے ادارہ ہر ماہ ایک بہترین کتاب طبع کرتا ہے۔ (۳۱)

۵۔ مجمع البحوث الاسلامیہ کے تحت منعقدہ عالمی کانفرنسیں اور سیمینارز:

۱۹۶۱ء کے جس قانون (۱۰۳) کے تحت اس کی تاسیس کی گئی ہے اسی کی دفعہ ۲۲ کے تحت اسے ہر سال ایک کانفرنس منعقد کا بھی اختیار دیا گیا ہے، جو کم از کم چار ہفتے (تقریباً ایک ماہ) تک جاری رہ سکتی ہے، تاکہ اس میں مجمع کی کارکردگی کا سالانہ طور پر جائزہ لیا جا سکے، ایسی کانفرنسوں میں غیر ملکی اراکین بھی ایک چوتھائی تعداد میں حاضر ہونا ضروری ہے، اپنے قیام اور اپنی تاسیس سے لے کر اب تک مجمع کے تحت ۱۹۸۵ء تک دس کانفرنسیں منعقد ہو چکی تھیں، جن میں سے پہلی مارچ ۱۹۶۴ء میں، دوسری مئی ۱۹۶۵ء، تیسری اکتوبر ۱۹۶۶ء، چوتھی ۱۹۶۸ء، پانچویں مارچ ۱۹۷۰ء، چھٹی مارچ ۱۹۷۱ء، ساتویں اکتوبر ۱۹۷۷ء، آٹھویں ۱۹۸۰ء، نویں مارچ ۱۹۸۳ء اور دسویں ستمبر ۱۹۸۵ء میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں مختلف تجاویز اور سفارشات پیش کی گئیں، ہر کانفرنس میں پیش کیے گئے مقالات، تجاویز، قراردادیں اور فیصلے مجمع البحوث کی طرف سے شائع کیے جا چکے ہیں (۳۲)

۳۰۔ الازھر، تاریخہٗ وتطورہٗ، ص ۱۹۴، اس کے آخر میں انیس (۱۹) اسلامی ملکوں کے کئی تعلیمی اداروں میں، اپنے علماء اور بحوث کے بھیجنے کا ذکر ہے...... (دیکھیے کتاب مذکور ص ۳۵۱-۳۵۳)۔

۳۱۔ مجمع البحوث الاسلامیہ، ص ۱۴۹۔

۳۲۔ ایضاً۔

خلاصہ مباحث:

اس تفصیل سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ مصر جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب وتمدن کا امین ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی اور دینی اعتبار سے بھی قدیم ترین اداروں اور جامعات کا ملک ہے...... اجتماعی اجتہاد کے حوالے سے بڑی پیش رفت رکھتا ہے۔

۲۔ مصر کی پارلیمنٹ میں مذہبی مسائل پر بحث کرنے کے بجائے مصری حکومت نے...... دینی مسائل اور معاملات میں جامعۃ الازھر اور اس کے شیخ کو دینی مسائل میں رہنمائی کا حق دے دیا ہے، اور ''الامام الاکبر'' کی حیثیت سے، اس کی سفارشات اور اس کے فتاوی کو حتمی اور قطعی حیثیت حاصل ہے۔

۳۔ ابتدائی دور میں شیخ الازھر، ذاتی طور پر یا اپنے ادارے کے علمائے کرام کی مدد سے فتوے دیا کرتے تھے، بعد ازاں حکومت نے پہلے ھیئۃ کبار العلماء قائم کی، پھر اسے لجنۃ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور ۱۹۶۱ء سے اسے ''مجمع البحوث الاسلامیہ'' کے عنوان سے نئے سرے سے ترتیب دیا گیا۔ اور تمام مذہبی ذمہ داریاں اور فرائض اسے سونپ دیئے گئے۔ فی الوقت دنیا بھر میں اپنے مندوب بھیجنے سے لے کر ملک میں قرآن کریم اور مذہبی کتابوں کی طباعت، دینی اور مذہبی مسائل میں قوم اور ملت اسلامیہ کی رہنمائی، ملک اور بیرون ملک سے طبع ہونے والی کتابوں میں اسلام اور مسلمانوں سے متعلق مواد کے جائزہ وغیرہ کے متنوع اس کے سپرد ہیں۔ جس سے یہ ادارہ ایک ایسے بین الاقوامی ادارے کے طور پر مسلمہ حیثیت اختیار کر گیا ہے، جو دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے استفادی حیثیت رکھتا ہے۔

۴۔ جہاں تک پارلیمنٹ کا تعلق ہے تو پارلیمنٹ ہر طرح کے فیصلے کرنے میں خود مختار اور آزاد ہے، لیکن عموماً وہ مذہبی اور دینی معاملات میں رائے زنی سے احتراز کرتی ہے۔

❁❁❁

فصل سوم (حصہ دوم)

سوڈان کے پارلیمنٹ کی اجتماعی اجتہادی کاوشوں کا مطالعہ

سوڈان شمالی افریقہ میں واقع ایک جمہوری ملک ہے، یہ مشترکہ طور پر مصر اور برطانیہ کی نگرانی میں رہا، اور یکم جنوری ۱۹۸۴ء میں اس نے آزادی حاصل کی۔ دراصل اسے انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں مصری حکمرانوں نے بآسانی فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کرلیا تھا، لیکن ۱۸۸۵ء میں مہدی سوڈانی نے یہاں سے مصر کا قبضہ ختم کر دیا، اور یہاں اپنی حکومت قائم کر لی، لیکن ۱۸۹۸ء میں مصری اور برطانوی فوجوں نے مشترکہ طور پر مہدی سوڈانی کا قبضہ ختم کر کے اپنی حکومت دوبارہ بحال کی۔ دونوں ملکوں کی یہ مشترکہ حکومت ۱۹۵۵ء تک یہاں قائم رہی۔(۱)

سوڈان کا شمار دنیا کے ان خطوں میں ہوتا ہے، جہاں نفاذ اسلام یا Islamization کی تحریک زوروں پر ہے...... غربت اور کم علمی کے ماحول میں...... متعدد جنگوں اور خانہ جنگوں میں مبتلا سوڈان میں...... نفاذ اسلام کی تحریک برسوں سے جاری ہے اور دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح یہاں بھی...... حکومت کو مغربی ممالک کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا ہے۔

بریگیڈیئر حسن احمد البشیر بنیادی طور پر ایک مذہبی شخص ہیں جنہوں نے ملک میں وسیع پیمانے پر...... اسلامی احکام متعارف کروائے ہیں۔ جس کی بنا پر، مغربی ممالک میں ان کے خلاف سخت تعصب پایا جاتا ہے۔ سال ۲۰۰۹ء میں اقوام متحدہ نے...... ان کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے ہیں مگر وہ تاہنوز اپنی کرسی پر موجود ہیں اور سوڈان میں خانہ جنگی اور غربت کے خاتمے کے بعد...... اقوام متحدہ کی زیر نگرانی کئی پروگرام کام کر رہے ہیں۔ حال ہی میں اقوام متحدہ نے سوڈان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے جہاں عیسائیوں کی اکثریت تھی اسے ایک الگ ملک بنا دیا گیا ہے۔

خلاصہ مباحث:

سوڈان گزشتہ کئی دہائیوں سے جنگی صورت حال سے دوچار ہے۔

۲۔ موجودہ صدر...... شخصی اور آمرانہ انداز سے حکومت چلا رہے ہیں، انہوں نے ذاتی مشاورت کے لیے کئی اہل علم کی خدمات حاصل کر چکی ہیں، لیکن ملکی سطح پر کوئی اس نوعیت کا ادارہ قائم نہیں ہے، جسے ہم اجتہادی ادارہ قرار دے سکتے ہوں۔ اور پارلیمنٹ بھی ابھی تک موثر نہیں ہے۔

۱۔ Encyclopaedia Americana, 25/836

فصل چہارم (حصہ اوّل)

انڈونیشیا میں پارلیمنٹ کی بالا دستی اور اجتہاد کی اہلیت کا جائزہ

(الف) انڈونیشیا کی مختصر سیاسی تاریخ:

انڈونیشیا.....نیدرلینڈ (ہالینڈ) کی قدیم مشرقی کالونی (East land) تھی، اس سے تیمورلیسٹ (Timore lest) کا علاقہ جو پرتگیزیوں کی کالونی تھی۔ مستثنیٰ تھا.....ڈچ (قوم) کے اس علاقے پر قبضے کی ابتدا سترھویں صدی عیسوی سے ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کا اقتدار ان جزائر میں آگے بڑھتا اور وسعت اختیار کرتا رہا۔

(ب) قانون سازی اور اجتماعی اجتہادی کوششیں:

انڈونیشیا آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک ہے۔ ۳۰ جون ۲۰۰۰ء کو ہونے والی مردم شماری کی رو سے انڈونیشیا کی آبادی بیس کروڑ باسٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار پانچ سو پچانوے (۲۰۶۲۶۴۵۹۵) افراد پر مشتمل ہے۔ جب کہ ۲۰۰۳ء کے اندازے کے مطابق اس کی آبادی کا تخمینہ ۲۱۹۸۳۰،۰۰ افراد ہے۔ (۱)

۱۹۸۵ء کے سروے کے مطابق ملک کی آبادی میں ۸۶٫۹ فیصد لوگ مسلمان ہیں۔ ۶٫۹ فیصد عیسائی، ۰٫۹ فیصد ہندو۔ ۱۰ لوگ بے مذہب اور ۶ فیصد قبائلی مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں، جبکہ ۱۹۹۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۹۰ فیصد آبادی مسلمان ہے۔

ملک کی سب سے بڑی مقتدرہ مجلس پارلیمنٹ (Mpr=the peoples Consultation Assembly) ہے، جن کا انتخاب پانچ سالہ مدت کے لیے ہوتا ہے۔ ایم پی آر میں دیوان پرواکلان رکیات (DPR) کے ۵۰۰ ارکان بھی شامل ہیں۔ تمام حاکمانہ اختیارات صدر مملکت کو حاصل ہیں، جسے ایم پی آر پانچ سالوں کے لیے منتخب کرتی ہے۔ وہ اپنی کابینہ کی مدد سے حکومت چلاتا ہے، جو صدر کے سامنے جوابدہ ہے..... پارلیمنٹ میں اگست ۲۰۰۴ء میں آئین میں آئینی ترمیمات کے ذریعے جو کئی اصلاحات کی گئیں ان کی رو سے

صدر اور نائب صدر کا انتخاب براہ راست عوام کے ووٹوں سے ہونا طے پایا ہے۔ اسی طرح پارلیمنٹ کا دوسرا ایوان DPR قرار طے پایا ہے، جو ملک کے ۲۳ صوبوں سے منتخب شدہ افراد پر مشتمل ہے۔ ہر صوبے کی اسمبلی اپنا گورنر منتخب کرتی ہے، جس کی توثیق صدر کرتا ہے۔ (۲)

ملک میں تین عبوری آئین ۱۹۴۵ء، فروری ۱۹۵۰ء اور اگست ۱۹۵۰ء نافذ رہے، لیکن جولائی ۱۹۵۹ء میں صدر نے اپنے

۱۔ نیز دیکھیے Britanica Year Book, 2006-2007، ص ۲۰۰۔

۲۔ ایضاً۔ ۲۱۸۶۔

صدارتی فرمان کے ذریعے ۱۹۴۵ء والا آئین ملک میں دوبارہ نافذ کر دیا بعد ازاں انتخابی قوانین کا قانون مجریہ ۱۹۹۹ء کو اس کا تکملہ (Supplement) بنادیا گیا، اس آئین میں ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۲ء میں بہت سی ترمیمات ہوئیں، جن کا نفاذ ۲۰۰۴ء میں عمل میں آیا۔

۱۹۴۵ء والے آئین کی کل ۳۷ دفعات ہیں، تین عبوری اور دو اضافی، دستور کے آغاز میں ایک پیش لفظ (Preamble) ہے جس میں نو آبادیاتی نظام کی مخالفت کا عزم ظاہر کیا گیا ہے اور ''اعلان آزادی'' کی دستاویز اور بنیادی اور اصولی باتیں شامل کی گئی ہیں۔ اس میں ملک کے جمہوری (Republic) ہونے کا اعلان بھی ہے اور درج ذیل چار بنیادی اصولوں کا ذکر ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی برتر ذات اور وحدانیت کا یقین۔

۲۔ منصفانہ اور مہذب انسانی معاشرے کا قیام۔

۳۔ انڈونیشیا کا اتحاد۔

۴۔ مشورے کی دانش اور منتخب نمائندگان میں اتفاق رائے پر مبنی جمہوریت۔

۵۔ تمام اہلیان انڈونیشیا کے لیے سماجی انصاف۔

آئین کے مطابق عوام ہی بالادست ہیں اور ان کے نمائندوں پر مشتمل مجلس شوریٰ (MPR) ہی ریاست کا سب سے برتر ادارہ ہے۔ جو ''مجلس قانون ساز'' (ایوان پروکلان رکیات :DPR) بھی کہلاتی ہے (۳)۔ آئین کی رو سے تمام فیصلے اتفاق رائے سے کیے جاتے ہیں۔

جب کہ ''ایوان نمائندگان'' (DPR) تمام کا تمام منتخب نمائندوں پر مشتمل ہے اور اس کا سال بھر میں کم از کم ایک اجلاس کا ہونا ضروری ہے۔ اس مجلس میں ہر صوبے کو یکساں نمائندگی دی گئی ہے، اور صوبوں کے ایوان نمائندگان کی تعداد اس کے ارکان کی تعداد کے مقابلے میں ایک تہائی سے زیادہ نہیں۔ صوبوں کے ایوان نمائندگان کا اجلاس بھی سال میں کم از کم ایک بار ہونا ضروری ہے۔

۳۔ مشاورتی کونسل:

صدر نے ایک مشاورتی ادارہ (Supreme Advisory Council: Dewan Pertimbangan Agung) بھی قائم کر رکھا ہے، جو صدر کی معاونت کرتا ہے۔ اس میں سیاسی جماعتوں...... معاشرے میں فعال گروہ اور اہم ترین افراد پر مشتمل جماعتوں کے افراد شامل ہیں۔ (۴)

انڈونیشیا میں نفاذ اسلام کے لیے بہت سی سیاسی جماعتیں جدوجہد کر رہی ہیں جن میں اسلامک انڈونیشین پارٹی (PPI)، پارتائی کی بنگ کی تان (PKU:Islamic Awakening party) محمدیہ (ڈاکٹر احمد سیفی معارف) اور نہضۃ العلماء

۳۔ The Europa world year book, 2007، ص ۲/۲۱۶۴۔

۴۔ ایضاً، ۲۱۷۸۔

(N.U) اور شرکت اسلام جیسی جماعتیں شامل ہیں۔(۵)

''مجلس علمائے انڈونیشیا'' کے نام سے علماء کی ایک اعلیٰ ترین کونسل بھی کام کر رہی ہے۔جس کا صدر دفتر مسجد استقلال، چالان، تمان وجایا کیسومہ، جکارتہ میں ہے جو کہ علماء کی ایک مرکزی کونسل ہے اور اس کے صدر سہل المحفوظ ہیں اور سیکرٹری جنرل ڈین شمس الدین ہیں(۶)۔

خلاصہ بحث:

(الف) انڈونیشیا میں قانون سازی کے تمام تر اختیارات دوایوانی مجلس قانون ساز کو حاصل ہیں۔

(ب) وہاں مجلس قانون ساز کی امداد کے یا اس کی نگرانی کے لیے علما یا دینی و مذہبی طبقے پر مشتمل کوئی مجلس یا کونسل موجود نہیں ہے۔

(ج) آئین کی ساخت مجموعی طور پر سیکولر بنیادوں پر استوار ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اعتراف تو کیا گیا ہے لیکن اسلام کو بحیثیت برتر نظام زندگی کے کوئی کردار نہیں سونپا گیا۔

(د) عوامی سطح پر بھی کوئی اجتہادی ادارہ قائم نہیں ہے، جو دوسرے ممالک کے لیے کوئی مثال بن سکے۔

۵۔ ایضاً،۲۱۸۰-۲۱۸۹۔

۶۔ ایضاً،۲۱۸۹۔

ملائشیا (Malaysia) میں پارلیمنٹ اور اس کے معاون اجتہادی اداروں کا جائزہ

ا۔ ملائشیا کی سیاسی تاریخ:

ملائشیا جنوب مشرقی ایشیا کے جنوب میں واقع ایک اسلامی جمہوری ملک ہے، جو جزیرہ نما مالے کے جنوبی اور جزیرہ بورنیو کے شمالی علاقوں پر مشتمل ہے۔ یہ ملک، جزیرہ نمائے ملائشیا اور بورنیو کی سروک (Sarowak) اور سباہ (Sabah) ریاستوں سمیت گیارہ ریاستوں پر مشتمل ایک وفاق (Federation) پر محیط ہے۔ جس کا دارالحکومت کوالالامپور ہے۔(۱) ایک دوسرے مآخذ کے مطابق، یہ ۱۳ ریاستوں پر مشتمل ایک وفاق ہے جس میں سے، گیارہ ریاستیں جزیرہ نمائے ملایا کے جنوبی حصے پر مشتمل ہیں، جبکہ دو ریاستیں سباہ اور سروک جزیرہ نما بورنیو کے شمالی حصے میں واقع ہیں۔(۲)

۳۔ ملائشیا میں اجتہادی ادارے

مسلم آبادی کا تناسب:

ملائشیا میں اسلام سب سے مستحکم مذہب ہے، تاہم دوسرے مذاہب کو بھی مذہبی آزادی دی گئی ہے، ملائشیا میں مسلم آبادی کا تناسب ۱۹۸۵ء کی مردم شماری کی رو سے ۵۳٪ ہے، جبکہ جزیرہ نما کی ۱۹ فیصد آبادی بدھ مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ چینی باشندوں کی تعداد ۱۱ فیصد اور سکھ آبادی کا تناسب ۳ء۱۱ فیصد، جبکہ عیسائی آبادی کا تناسب ۹ فیصد ہے، چینی مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کا تناسب ۶ء۱۱ فیصد ہے۔

ملائشیا میں اسلام کی بنیادیں بہت مضبوطی سے گڑھی ہوئی ہیں...... یہاں اسلام ان تاجروں کے ذریعے سے پھیلا، جو یہاں تجارت وغیرہ کے لیے آئے تھے...... جن کی اکثریت کا تعلق...... قدیم ہندوستان اور عرب علاقوں سے تھا...... مسلمانوں کے علاوہ یہاں بدھ مت، جین مت ہندومت اور عیسائیت سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی آباد ہیں......

ملائشیا...... بنیادی طور پر، ایک نیم "سیکولر" (لادینی)...... بنیادوں پر قائم ریاست ہے، تاہم حالیہ برسوں میں وہاں نفاذ اسلام اور اسلامی اداروں کے احیاء کے سلسلے میں بہت کام ہوا ہے۔

ملائشیا میں، اسلام سے بڑھتی ہوئی وابستگی کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ دسمبر ۲۰۰۱ء میں...... ایک اسلامی جماعت "المعونہ" کے انیس ارکان اس الزام میں گرفتار کیے گئے، کہ وہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے انہوں نے اسلحہ چھیننے کی کوشش کی تھی...... ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا، اور انہیں مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں۔(۳)

۱۔ Encyclopaedia Americana، ۱۸/۱۲۰۔

۲۔ The Europa world year book, 2007، ۲/۲۸۱۷۔

۳۔ The Europa world year book, 2007، ۲/۲۸۲۰۔

جولائی ۲۰۰۲ء میں معروف اسلامی ریاست PAS کے سربراہ عبدالہادی نے ریاست ٹرینگانو میں اسلامی نظام نافذ کرنے کا اعلان کیا، جہاں اس کی جماعت برسر اقتدار تھی......(۴)

۲۰۰۲ء میں......سیاحوں کی جنت سمجھے جانے والے انڈونیشیا کے جزیرے بالی میں، ہونے والے بم دھماکوں کا الزام بھی، ملائشیا کی......ایک نیم سیاسی تنظیم ''جماعت اسلامیہ'' پر لگا......اور اس کے امیر سمیت ۷۰......افراد کو حراست میں لے لیا گیا، ان میں سے بہت سے افراد پر مقدمہ چلایا گیا، اور انہیں مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں۔(۵)

وفاق کی مرکزی پارلیمنٹ میں بھی، دو اسلامی جماعتوں کی نمائندگی موجود ہے، جن میں سے پارٹی برساتو سہ (چار نشستیں) اور پارٹی اسلام سی ملائشیا (کل ۷ نشستیں) وغیرہ شامل ہیں۔(۶)

ملک میں ''قومی فتوئ کونسل'' کے نام سے......ایک اعلیٰ اختیاراتی ادارہ قائم ہے، جس کے فتووں پر......عمل کیا جاتا ہے، ملک میں ۱۹۹۶ء میں ''الارقم'' نامی تنظیم پہلی مرتبہ سامنے آئی......جس کے عقائد و خیالات پر لوگوں کو اعتراض تھا......حکومت نے ''قومی فتوئ کونسل'' سے، اس کے عقائد و خیالات کے بارے میں فتوئ حاصل کر کے......اس جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا۔(۷)

حال ہی میں مئی ۲۰۰۷ء میں ہائی کورٹ نے ایک رولنگ جاری کی ہے، جس کی رو سے مسلمانوں کے معاشرتی اور سماجی مسائل کے متعلق شرعی عدالتوں کے فیصلے ہی......قابل قبول ہوں گے، اسی بنا پر اس سلسلے میں حکومت شرعی عدالتوں کا......پورا نظام قائم کر رہی ہے۔

اعلیٰ ترین اجتہادی اداروں میں، درج ذیل اداروں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مجلس اسلام: یہ ایک ملک گیر سطح کا ادارہ ہے......جس کے امیر نامور عالم دین......حاجی محمد خوزی بن حاجی عبدالحمید ہیں......جن کا تعلق کینگ سروک سے ہے)

۲۔ ادارہ برائے تفہیم اسلام ملائشیا...... (Institute of Islamic Understanding Malaysia)(IKIM)......ہے جس کا صدر دفتر کوالالامپور میں ہے......اور جو اسلام سے متعلق اعلیٰ ترین فیصلے اور رپورٹس جاری کرتا ہے۔

۳۔ شعبہ اسلامی ترقی ملائشیا، Department :JAKIM = Jabatan kemajuan Islam Malysia Islamic Development Malysia، یہ بھی ملکی سطح کا ایک اسلامی ادارہ ہے، جس کا صدر دفتر Persekutuan میں ہے۔(۴۱) تاہم پارلیمنٹ اور اس کے ساتھ تعاون و اشتراک کے لیے کسی ادارے یا کونسل کا ذکر نہیں ملتا۔

۴۔ صوبہ کیلنتان کے حدود بل کا جائزہ:

۴۔ ایضاً، ۲/۲۸۲۲۔

۵۔ ایضاً۔

۶۔ دیکھیے The Europa، ۲/۲۸۲۳۔

۷۔ ایضاً، ۲۸۳۸۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ملائشیا کے صوبی کیلنٹان میں ۱۹۹۰ء کی دہائی سے ایک دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی ایک جماعت پاس (PAS) برسر اقتدار ہے۔ اس نے ۱۹۹۴ء میں اپنے صوبے کی صوبائی مجلس قانون ساز میں ''حدود بل'' کے نام سے اسلام کے حدود تعزیرات پر مشتمل احکام کی منظوری دی۔

لیکن چونکہ یہ معاملہ صوبائی اختیارات سے ماورا ہے، اس لیے یہ بل نافذ تو نہیں ہو سکا۔ البتہ ملائشیا میں بڑھتے ہوئے مذہبی رجحانات کی غمازی ضرور کرتا ہے۔ (۸)

خلاصہ بحث:

۱۔ ملائشیا کی پارلیمنٹ ہر قسم کے فیصلوں کے لیے آزاد ہے۔

۲۔ مجموعی طور پر لادینی (Secular) نظام رائج ہے۔

۳۔ نفاذ اسلام کے لیے...... اب تک کوئی باقاعدہ اور سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی۔

۴۔ پارلیمنٹ کی مدد کے لیے کوئی علمی یا اجتہادی مجلس موجود نہیں ہے۔ البتہ ایک ''مجلس فتویٰ'' ضرور موجود ہے، جس سے حکومت مختلف مسائل میں رہنمائی لیتی ہے۔

۵۔ عوامی سطح پر مختلف مذہبی ادارے اور تنظیمیں کام کر رہی ہیں اور صوبائی سطح پر بھی پاس (PAS) نامی سیاسی جماعت، جو ایک سے زیادہ صوبوں میں اقتدار ہے، اس حوالے سے مفید خدمات انجام دے رہی ہے۔

❀❀❀

۸۔ اس عنوان میں مزید تفصیل اور تبصرہ کے لیے دیکھیے: پروفیسر محمد ہاشم کمالی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کوالالمپور ملائشیا کی کتاب Punishment in Islamic Law, An Enquiry onto the Hadood Bill of Kelantan، طبع علمیہ پبلشرز پٹیالنگ جایا، سیلانغور، دارالاحسان ملائشیا، ۱۹۹۵ء اور اس پر مختصر تبصرہ دوسالہ اجتہاد، بابت جون ۲۰۰۷ء ص ۱۲۳ تا ۱۲۸، ملائشیا: حدود کے نفاذ کا مسئلہ۔

فصل پنجم (حصہ اوّل)

سعودی عرب میں پارلیمنٹ کی حیثیت اور ملکی اجتہادی ادارں کا مطالعہ

ا۔ سعودی عرب...... محل وقوع:

سعودی عرب جنوب مغربی ایشیا میں جزیرہ نمائے عرب کے پانچ میں سے چار حصوں پر مشتمل ہے، اس کے شمال میں اردن، عراق اور کویت واقع ہیں، جنوب میں یمن، جنوب اور جنوب مشرق کی طرف عمان واقع ہے، اس کی طویل ساحلی پٹی ''بحراحمر'' کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے، جس کا رخ مصر، ارٹریا اور سوڈان کی طرف ہے اور ایک چھوٹی سی ساحلی پٹی خلیج فارس پر کویت اور قطر کے درمیان واقع ہے، جو ایرانی ساحل کے بالمقابل واقع ہے۔ ملک کا زیادہ تر حصہ صحرا پر مشتمل ہے اور بہت سا علاقہ ایسا ہے، جہاں مدت سے بارش نہیں ہوئی۔ موسم گرما میں ساحل کے ساتھ درجہ حرارت 38 درجہ سے 49 درجہ تک پہنچ جاتا ہے، اور ہوا میں نمی بہت زیادہ ہوتی ہے، اندرونی علاقوں میں درجۂ حرارت بعض اوقات 54 سنٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ (۱) دفتری زبان عربی ہے جو پورے عرب میں بولی جاتی ہے، ۸۵ فیصد آبادی سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے، خصوصاً ملک کی مشرقی جانب کے علاقوں میں۔ قومی پرچم کا رنگ سبز ہے، سفید حصے میں کلمۂ طیبہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' تحریر ہے (۲)

مجلس شوریٰ:

اگست ۱۹۹۳ء میں شاہ فہد نے ایک ۶۰ رکنی مجلس شوریٰ کا اعلان کیا، جس میں وزراء بھی شامل ہیں اس کا باقاعدہ آغاز دسمبر ۱۹۹۳ء میں ہوا، اس کے ہر رکن کی مدت چار سال ہے۔ کونسل کی پہلی مدت ختم ہونے پر ۱۹۹۷ء میں ۹۰ دنوں کی اور مئی ۲۰۰۱ء میں ۱۲۰ دنوں کی اور تیسری مدت کے اختتام پر اپریل ۲۰۰۵ء میں ۱۵۰ دنوں کی توسیع کی گئی۔ نومبر ۲۰۰۳ء میں شاہ فہد نے اپنے ایک حکم نامہ کی رو سے کونسل کو قانون سازی کے اختیارات بھی دے دیئے، جس میں نئی قانون سازی بھی شامل ہے (۳)۔

سعودی عرب ایک اسلامی مملکت ہے...... اور اسلام ہی اس کا تشخص ہے، چنانچہ سعودی عرب کی حکومت کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔ سعودی عرب ہی میں اسلام کے دونوں مقدس شہر مکہ مکرمہ، اور مدینہ منورہ واقع ہیں۔ مشرقی صوبوں کے سوا جہاں اہل تشیع کی کافی بڑی تعداد موجود ہے، سعودی عرب کی اکثر آبادی سنی مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہے اور مقامی باشندوں کی اکثریت وہابی (محمد بن عبدالوہاب کے ماننے والوں) پر مشتمل ہے۔ یہ فرقہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوا، مگر شاہ عبدالعزیز ابن سعود کے دور میں یہ متحد ہوا، یہی لوگ اس وقت مقامات مقدسہ کے محافظ اور حج وغیرہ کے منتظم ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں شاہ فہد نے اپنے لیے

۱۔ The Europa world year Book. 2007، ۲۰/۳۵۵ے

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، ۳/۳۳۳ے

''خادم الحرمین الشریفین'' کالقب اختیار کیا، ملک کی سب سے معتبر اتھارٹی علماء کی کونسل ہے، جن کے سربراہ سعودی عرب کے مفتی اعظم ہیں(۴)۔

۵۔ سعودی عرب مملکت کے اہم قوانین اور جائزہ:

جہاں تک سعودی عرب کے آئین کا تعلق ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہاں مکمل طور پر خاندان ابن سعود کی حکومت قائم ہے اور ایک ایسی مملکت، میں جہاں کسی خاندان کی حکومت ہو، آئین و قانون وغیرہ سب ثانوی چیزیں ہوتی ہیں(۵)، تمام تر اختیارات شاہی خاندان کو حاصل ہیں اور وہی اس کے نظم و نسق چلانے اور اس کے لیے قوانین بنانے کے ذمہ دار ہیں۔ سعودی آئین کے کل نو ابواب ہیں۔

پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ مملکت سعودی عرب ایک اعلیٰ ترین عرب مملکت ہے جس کا سرکاری مذہب اسلام ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ اس کا آئین ہے۔ عربی اس کی سرکاری زبان اور ریاض اس کا دارالخلافہ ہے(۶)۔ اس کی سرکاری تعطیلات عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ ہیں اور اس کا کیلنڈر ہجری کیلنڈر ہے۔(۷)

دوسرے باب میں کہا گیا ہے کہ ریاست پر حکمرانی کا حق صرف شاہ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن الفیصل السعود کے بیٹوں کا ہے، جو نسلاً بعد نسل اس پر حکومت کریں گے۔ انصاف، مشورہ اور اسلامی احکام پر مبنی مساوات مملکت کے بنیادی اصول ہیں۔

جبکہ عوام کو قرآن و سنہ کی نصوص کی روشنی میں بادشاہ کی اطاعت اور اس کی فرمانبرداری کے لیے کہا گیا ہے۔ نیز یہ کہ حکومت سعودیہ اپنے اختیارات قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ کی احادیث سے حاصل کرے گی، اور سعودی عرب میں حکومت کی بنیاد انصاف، مشورے اور قرآن و سنہ کی روشنی میں مساوات پر ہے۔(۸)

شق نمبر ۴۵ کے تحت سعودی مملکت میں فتویٰ جاری کرنے کا بنیادی ماخذ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبی ﷺ کی سنت کو قرار دیا گیا ہے۔ سینئر/ بزرگ علماء پر مشتمل کمیٹی، سائنسی تحقیق کی انتظامیہ فتویٰ کے اجراء اور بزرگ علماء پر مشتمل کمیٹی کی کارکردگی کا تعین کرے گی۔

شق نمبر ۴۶ میں عدلیہ کی توضیح کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ عدلیہ ایک خودمختار ادارہ ہے، کسی قاضی/ جج کے فیصلے کی نوعیت پر کسی قسم کا کوئی کنٹرول نہیں ہوگا، سوائے اسلامی شریعۃ سے متعلق امور کے۔

شق (۴۸) میں کہا گیا ہے کہ عدالت کے سامنے جو مقدمات/ معاملات لائے جائیں گے وہ ان میں اسلامی قانون کا نفاذ

۴۔ ایضاً، ۲/۳۴۴

۵۔ دیکھیے آئندہ صفحات

۶۔ The constitution of the Saudi Arabia، Issued by the Saudi Kingdom، ۱۹۹۲

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً، ص ۳

کرے گی، جو قرآن وسنہ میں بیان کردہ احکام کے مطابق ہوگا اور حکمران کی طرف سے جاری ہونے والے اس فرمان کے مطابق ہوں گے جو قرآن وسنہ سے متصادم نہ ہو(۹)۔

شق نمبر ۵۴ کی رو سے بادشاہ قومی پالیسی تشکیل دے گا، جو کہ اسلام کی گنجائش کے مطابق ہو گی۔ بادشاہ ہی اسلامی شریعت کے نفاذ حکومتی نظام مملکت کی عمومی پالیسیوں اور ملک کے دفاع اور اس کے تحفظ کی نگرانی کرے گا۔(۱۰)

شق (۶۷) میں ہے کہ قانون ساز ادارے اسلامی شریعت سے مطابقت میں ایسے قواعد اور ایسی تحریکات تیار کریں گے، جن سے ریاست کے مفادات کا تحفظ ہوگا اور معاملات میں جو خرابی ہوا سے دور کیا جا سکے گا۔

شق نمبر ۶۸ کے مطابق مجلس شوریٰ یا ایک مجلس مشاورت بنائی جائے گی۔ اس کا خصوصی قانون یہ واضح کرے گا کہ اسے کیسے بنایا جائے گا وہ اپنے اختیارات کا کیسے استعمال کرے گی اور اس کے اراکین کا انتخاب کیسے ہوگا۔(۱۱)

شق نمبر ۶۹ میں ہے کہ بادشاہ کو یہ حق ہوگا کہ وہ مجلس شوریٰ اور مجلس وزراء کا مشترکہ اجلاس بلائے اور وہ جس کسی کو اس میں بلانا چاہے گا بلا سکے گا، اور جو معاملات چاہے گا اس میں زیر بحث لائے جا سکیں گے۔(۱۲)

۶۔ تبصرہ:

سعودی عرب کے آئین پر، جو دراصل ایک شاہی فرمان ہے اور اسے شاہی فرمان ہی کے ذریعے نافذ کیا گیا...... دو باتوں کا خصوصی اظہار ہوتا ہے:

(۱) اس آئین میں اسلامی قانون (قرآن وسنہ) کو سب سے بالاتر قانون کا درجہ دیا گیا ہے...... اور آئین میں یہ طے کیا گیا ہے کہ سعودی عرب کا قانون قرآن وسنہ پر مبنی ہوگا...... اور اس کے لیے بزرگ/کبار علماء کی ایک کونسل قائم کی جائے گی۔ (شق ۴۵) جو مملکت کی دینی مسائل کے حوالے سے رہنمائی کرے گی، اور بادشاہ اس کی سفارشات کو نافذ کرنے کا اہتمام کرے گا۔

(۲) انتظامی امور اور معاملات میں فرمانروائے مملکت کو تمام تر حقوق اور اختیارات دیئے گئے ہیں، اور وہ کسی کونسل/کابینہ یا مجلس کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔

اب آیئے...... شق نمبر ۴۵ کی رو سے علماء کی کونسلوں کے قیام اور ان کی کارکردگی کا جائزہ لیں۔

۷۔ هيئة كبار العلماء:

سعودی عرب کے آئین سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر چہ مملکت سیاسی اعتبار سے شاہی خاندان سے وابستہ ہے،

۹۔ ایضاً، متعلقہ شقیں

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً، ص ۷-۸

۱۲۔ ایضاً

تاہم شاہی خاندان اوراس کی طرف سے اس خطے پر قبضہ کی تاریخ سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس تحریک کا پورا پس منظر مذہبی ہے اور مذہب سے وابستگی ہی کی بنا پر اسے اس علاقے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

پھر ۱۹۸۶ء سے حکومت سعودیہ کے فرمانروا نے اپنے لیے ''خادم الحرمین الشریفین'' کا لقب اختیار کرلیا ہے، جس سے اس کی مذہب کے ساتھ گہری عقیدت اور مضبوط وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

دوسری طرف حکومت سعودیہ نے ۱۹۸۵-۱۹۸۶ء میں جو مجلس شوریٰ تشکیل دی ہے اس میں حکومت اور اس کے حامی اراکین کی اکثریت ہے اور اس میں اپنا یہ عزم دہرایا گیا ہے کہ حکومت کی اسلام کے ساتھ وابستگی ہمیشہ جاری رہے گی، اور یہ کہ مذہبی معاملات میں حکومت علماء اور اہل علم وفضل سے رہنمائی لیتی رہے گی۔ جبکہ آئین کی شق نمبر ۴۵ میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

اس پہلو سے حکومت میں علما کی مؤثر مداخلت اوران سے دینی اور مذہبی مسائل ومعاملات میں رہنمائی کے لیے حکومت نے ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی ''ھیئۃ کبار العلماء'' قائم کررکھی ہے، جومختلف مسائل اور معاملات میں حکومت کو مشورے دیتی ہے اور حکومت ان کے مشوروں پر عمل پیرا رہتی ہے۔

(الف) ھیئۃ کی تشکیل:

حکومت سعودیہ نے یہ اعلیٰ اختیاراتی مجلس ۸ رجب المرجب ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء کو ایک شاہی فرمان کے ذریعے قائم کی...... یہ مرحوم شاہ فیصل کا دور تھا، جو ایک سچے مسلمان اور اپنی قوم اور اپنے ملک کے ایک مخلص رہنما اور عظیم قائد تھے (۱۸)، اس میں سترہ ارکان کا تقرر کیا گیا...... جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

۱۔ الشیخ عبدالعزیز بن باز...... مفتی اعظم مملکۃ العربیۃ السعودیۃ
۲۔ الشیخ محمد بن الامین الشنقیطی
۳۔ الشیخ عبداللہ خیاط
۴۔ الشیخ عبدالرزاق العفیفی
۵۔ الشیخ محضار عقیل
۶۔ الشیخ عبدالعزیز بن صالح
۷۔ الشیخ عبداللہ بن غدیان
۸۔ الشیخ راشد بن خنین
۹۔ الشیخ عبداللہ بن حمید
۱۰۔ الشیخ سلیمان بن عبید
۱۱۔ الشیخ صالح بن عیدان
۱۲۔ الشیخ صالح بن غصون

۱۳۔ الشیخ محمد بن حرکان

۱۴۔ الشیخ محمد بن جبیر

۱۵۔ الشیخ عبداللہ بن منیع

۱۶۔ الشیخ عبدالمجید بن حسن

۱۷۔ الشیخ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم آل الشیخ (۱۳)

اس کونسل کا اصل مقصد...... بادشاہ کی طرف سے ارشاد کردہ مسائل کا شرعی حل تجویز کرنا ہے۔ اصل میں مملکت کو...... مختلف مسائل ومعاملات کوانجام دینے میں جب کوئی دقت یا دشواری پیش آتی ہے، تو وہ اس کے متعلق اپنا استفسار اسی ''مجلس'' کو ارسال کرتی ہے، جس پر یہ مجلس تفصیلی مقالے کی صورت میں اس کا حل پیش کرتی ہے۔

اس کے کام کرنے کا طریقہ کار یہ ہے کہ کسی مسئلے میں جب حکومت کو رہنمائی مطلوب ہوتی ہے تو اس مجلس کی تجویز یا اس کے امین العام کی ہدایت پر یا ادارہ برائے بحوث علمیہ، افتاء اور دعوت وارشاد کے سربراہ یا اللجنۃ الدائمۃ کے کہنے پر تحقیقی مقالہ جات تیار کرائے جاتے ہیں، جن میں سے منتخب مقالہ جس میں مسئلے کا حل بہتر طور پر تجویز کیا گیا ہو، جواب کی صورت میں حکومت کو ارسال کر دیا جاتا ہے۔

اس نوع کے مقالات...... ایک دوسرا ادارہ...... تیار کراتا ہے جس کا نام ''اللجنۃ الدائمۃ'' ہے، جس کی بنیادی ذمہ داری مطلوبہ مسائل پر تحقیقی کام کروانا ہے اور انفرادی سطح پر یہ مجلس شائع شدہ مقالات کی روشنی میں عوام وخواص کے مسائل ومعاملات کے بارے میں فتوے جاری کرتی ہے...... اور اپنے تحقیقی مجلّہ ''البحوث الاسلامیہ'' میں قراردادیں اور سفارشات مرتب کر کے شائع کرتی ہے...... جنہیں حکومت نافذ کر دیتی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ''ہیئۃ کبار العلماء'' ایک مرکزی نوعیت کا ادارہ ہے اور ''لجنۃ الدائمۃ'' اس کا ذیلی ادارہ ہے (۱۴)۔ اس لجنۃ کے ارکان میں اس وقت سے لے کر اب تک کئی مرتبہ ردوبدل ہو چکا ہے...... اور مفتی اعظم سعودی عرب...... شیخ عبدالعزیز بن باز کی وفات کے بعد...... ان کی جگہ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل الشیخ اس کے سربراہ ہیں۔

یہ لجنۃ حکومت کو بہت سے مسائل ومعاملات میں مشورے دے چکی ہے، حکومت نے اس مجلس کے مشورے میں مسعیٰ (سعی کی جگہ) اور جمرات وغیرہ میں توسیع کی ہے اور ان کی عمارتوں کو کئی کئی منزلہ بنایا ہے۔

۲۔ اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء:

۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء کے جس حکم نامہ کی رو سے ''ہیئۃ کبار العلماء'' کو قائم کیا گیا، اسی کے تحت مستقل بنیادوں پر یہ چھوٹی مجلس قائم ہوئی، شاہی فرمان میں اس مجلس کو حسب ذیل فرائض تفویض کیے گئے:

۱۔ تحقیقی مقالات کی تیاری اور انہیں بحث ومباحثے کے لیے ھیئۃ کبار العلماء میں پیش کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کے انفرادی اور نجی مسائل کے متعلق، قرآن وسنہ کی روشنی میں فتوے جاری کرنا، یہ فتاوی عقائد، عبادات اور

۱۳۔ ایضاً، مقالہ فیصل در Encyclopaedia Britannica۔

۱۴۔ ایضاً، دیکھیے مجلّہ البحوث الاسلامیہ، شمارہ ۱، مطبوعہ ۱۳۹۵ھ

۱۵۔ ایضاً، فتاوای اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیہ والافتاء، مکتبۃ السنۃ، قاہرہ ۱۹۹۱۔

انفرادی اور نجی معاملات سے متعلق ہوسکتے ہیں۔

۳۔ اس مجلس کا نام اللجنۃ الدائمۃ للبحوث والافتاء ہوگا۔

۴۔ اس مجلس کے سربراہ/صدر اور اس کے اراکین کی تقرری ادارہ برائے بحوث علیہ، افتاء اور دعوت وارشاد کے مشورے پر شاہی فرمان کے ذریعے کی جائے گی۔

اراکین وعہدیداران:

اس کے اراکین اور عہدیداران درج ذیل ہیں۔

۱۔ الشیخ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم آل الشیخ......صدر

۲۔ الشیخ عبدالرزاق عفیفی عطیہ......نائب صدر

۳۔ الشیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الغدیان......رکن

۴۔ الشیخ عبداللہ بن سلیمان بن منیع......رکن

۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء میں اس کے رئیس اور صدر الشیخ ابراہیم بن محمد کو وزیر انصاف (عدل) مقرر کیا گیا، تو ان کی جگہ الشیخ عبدالعزیز بن باز کو اس کا سربراہ اور صدر مقرر کر دیا گیا۔۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء میں الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل الشیخ اور الشیخ صالح بن الفوزان مجلس کے رکن بنائے گئے۔

۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳ء میں الشیخ بکر بن عبداللہ ابوزید......کو اس کا رکن اور ممبر بنایا گیا۔ جبکہ الشیخ بن باز کے انتقال کے بعد الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل الشیخ کو مفتی عام اور اس لجنہ کا صدر بنا دیا گیا۔

اس مجلس کا کوئی فتویٰ اس وقت تک قبول نہیں ہوسکتا، جب تک اس کے اراکین کی اکثریت اس کی تصدیق نہ کرے، اور ان کی تعداد کم از کم تین ہونی چاہیے۔ اگر دونوں طرف ایک جیسے اراکین ہوں تو صدر کی رائے کو ترجیح دی جائے گی۔(۱۶)

موجودہ کمیٹی کی تشکیل:

فی الوقت یہ کمیٹی چھ اراکین پر مشتمل ہے، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل الشیخ......مفتی اعظم ورئیس مجلس

۲۔ الشیخ عبداللہ حسن بن محمد القعود

۳۔ الشیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الغدیان

۴۔ الشیخ عبداللہ بن سلیمان بن منیع

۵۔ الشیخ الدکتور صالح بن فوزان بن عبداللہ الفوزان

۶۔ الشیخ بکر بن عبداللہ بن زید

۱۶۔ ایضاً۔

اس مجلس کی طرف سے پوری بحث وتحقیق کے بعد جن مسائل میں، اپنی سفارشات تیار کی گئی ہیں، اور حکومت کو پیش کی گئی ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ صفا ومروہ کی چھت پر سعی کرنے کا حکم۔

۲۔ مطاف کی توسیع۔

۳۔ عیدالاضحیٰ کے دن جمرۃ العقبہ کی رمی طلوع آفتاب سے پہلے کرنے کا جواز۔

۴۔ جمرات کی رمی، ایام تشریق سے پہلے آنے والی رات میں، یا بقیہ دنوں کی راتوں میں سعی کرنے کا جواز۔

۵۔ منیٰ میں...... پختہ عمارتیں بنانے کا جواز (۱۷)

تبصرہ:

مملکت عربیہ السعودیہ میں اگرچہ عام مسائل ومعاملات پر مشورہ کرنے کا رواج نہیں ہے، لیکن مملکت اپنے معاملات کو ان کی روح کے مطابق چلانا چاہتی ہے، اس لیے حکومت سعودیہ نے...... ایک وسیع اختیارات والی علماء کی ایک ایسی مجلس تشکیل دی ہے، جو دینی معاملات پر گہری نظر رکھتی ہے...... اور جو نئے مسائل میں پوری بحث وتحقیق کے ساتھ جدید مسائل کا حل پیش کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ پھر لجنہ کی طرف سے مسائل کے حل پر مشتمل جب کوئی تجویز بصورت بحث یا مقالہ آتی ہے، تو اس پر ھیئۃ کبار العلماء میں غور کیا جاتا ہے اور مجلس کی طرف سے منظوری کے بعد، حکومت اسے نافذ کر دیتی ہے، اس طرح ان اداروں کی حیثیت محض مشاورتی نہیں ہے، بلکہ انہیں کسی حد تک تنفیذ میں بھی شریک کیا گیا ہے، ان اداروں میں نہ صرف یہ کہ سعودی علماء شامل ہوتے ہیں، بلکہ اہلیت رکھنے والے غیر سعودی علماء بھی ان کے رکن بنائے جاسکتے ہیں بشرطیکہ ان میں اس کی اہلیت موجود ہو۔

اس تحقیقی ادارے/مجلس نے اب تک جو سفارشات/فتاوی جاری کیے ہیں۔ ان کا تعلق زندگی کے ہر شعبے خصوصاً حج، اور مناسک حج کے ساتھ ہے، حکومت نے اسی مجلس کی سفارش پر مطاف کو وسیع کیا۔ سعی کی عمارت کو دو منزلہ کیا...... جمرات کو کئی منزلہ کیا جا رہا ہے اور اسی طرح دوسرے کئی مسائل ومعاملات میں جدت اختیار کی ہے۔

۸۔ سعودی عرب میں اجتماعی اجتہاد کے نیم سرکاری ادارے:

سعودی عرب جہاں ایک طویل عرصے سے سعودی خاندان برسر اقتدار رہا اور اس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود وہ پورے عالم اسلام کی توجہ کا قبلہ ومرکز ہے، اور اس کے صادر شدہ فتاوی کو پورے عالم اسلام میں بڑی قدر اور محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے سعودی عرب کے اجتہاد وفتاوی کے ادارے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، اس نوع کے نیم سرکاری اداروں کا تعارف درج ذیل ہے۔

(الف) المجمع الفقه الاسلامی، مکه مکرمه:

مسلمانوں کی مشکلات اور ان کے حل کے لیے مربوط اور اجتماعی کوششوں کا احساس سب سے پہلے ''رابطہ عالم اسلامی'' کو

۱۷۔ ایضاً۔ محل مذکور

ہوا جس نے یہ فیصلہ کیا کہ لوگوں کے مسائل کے حل اور ان پر غور وحوض کے لیے دنیا بھر کے اہل علم کو جمع کیا جائے، اور قرآن وسنہ کی روشنی میں جدید انداز میں جدید مسائل کا استنباط واستخراج کیا جائے، چنانچہ رجب ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۴ء میں ''رابطہ عالم اسلامی'' کے عمومی سیکرٹریٹ نے مختلف اسلامی ممالک کے علماء وفقہاء پر مشتمل ایک فقہی بورڈ تشکیل دیا۔

بعد ازاں رابطہ کے مرکزی سیکرٹریٹ نے ''رابطہ عالم اسلامی'' کی ایک اسلامی کانفرنس میں جو ۱۵ سے ۲۲ ذوالحجہ ۱۳۸۴ھ کو مکہ مکرمہ میں انعقاد پذیر ہوئی اس عنوان پر گہرے غور وخوض کے بعد ایک قرارداد پاس کی، جس میں ایک ایسی ''اسلامی اکیڈمی'' کے قیام پر زور دیا گیا، جو عالم اسلام کے مختلف ممالک کے ممتاز اور جید علماء وفقہاء پر مشتمل ہو اور جو مسلمانوں کو درپیش مشکلات اور ان کے مسائل کا مطالعہ کرے اور ان کا شرعی اور اسلامی حل پیش کرے۔ (۱۸)

چنانچہ اپنی اس قرارداد کی تکمیل کے طور پر ''رابطہ عالم اسلامی'' نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۷ ذوالقعدہ تا ۲۲ ذوالحجہ ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء میں مجلس تاسیسی کے طور پر چند ارکان پر مشتمل ایک مجلس تشکیل دی جس میں درج ذیل اراکین شامل تھے۔

۱۔ الشیخ محمد بن ابراہیم آل الشیخ ...... (صدر) مفتی عام المملکۃ السعودیۃ العربیۃ۔
۲۔ مولانا السید ابوالحسن علی الندوی ...... (المتوفی ۱۴۲۰ھ/۲۲ دسمبر ۲۰۰۰ء)
۳۔ مولانا السید ابوالاعلیٰ مودودی (م...../۱۹۷۹ء)
۴۔ الشیخ محمد علی الحرکان۔
۵۔ الشیخ محمد محمود ...... صواف۔
۶۔ شیخ محمد فاضل بن عاشور۔
۷۔ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز (۱۹)

سات اراکین پر مشتمل اس مجلس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ایسی مجلس یا اکیڈمی کی تشکیل وتدوین کے لیے عملی تجاویز پیش کرے۔ چنانچہ اس مجلس نے ''رابطۃ العالم الاسلامی'' کے پندرہویں اجلاس منعقدہ ۱۷ ذوالقعدہ تا ۱۶ ذوالحجہ میں اپنی رپورٹ پیش کر دی، جس کی روشنی میں مجلس ...... نے درج ذیل اراکین پر مشتمل اکیڈمی کا بورڈ تشکیل دیا:

۱۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
۲۔ الشیخ ابوبکر جومی
۳۔ شیخ حسنین محمد مخلوف
۴۔ شیخ عبداللہ بن محمد بن حمید
۵۔ شیخ علال فاسی
۶۔ شیخ منصور محجوب

۱۸۔ ایضاً، التعریف بالمجمع الاسلامی بمکۃ المکرمہ، مطبوعہ رابطۃ الادب اسلامی، مکہ مکرمہ، ۱۴۲۴ھ، ص ۹۔

۱۹۔ ایضاً۔

۷۔ شیخ محمد بن علی حرکان

۸۔ شیخ محمد شاذلی بن قاضی النیعر

۹۔ شیخ محمد محمود صواف

۱۰۔ شیخ محمد رشیدی (۲۰)

بعدازاں محرم الحرام ۱۳۹۶ھ/۱۹۶۶ء میں رابطہ کے جنرل سیکرٹریٹ نے باقاعدہ ''المجمع الفقہی الاسلامی'' کے نام سے ایک مستقل اور باقاعدہ ادارہ قائم کردیا۔ جس کے دوسرے عہدیداروں......مثلاً ڈائریکٹر (مدیر) وغیرہ کا بھی تقرر کردیا گیا اور اس کے بعد بورڈ نے باقاعدہ کام شروع کردیا (۲۱)۔ اس کی روح رواں وہ مجلس (Body) تھی جس میں بارہ اسلامی ملکوں کے ممتاز اور جید علمائے کرام شامل تھے، یہ مجلس پاکستان، اردن، انڈونیشیا، سعودی عرب، الجزائر، لبنان، عراق، موریطانیہ، مصر، بھارت، نائیجیریا اور تیونس کے علماء پر مشتمل تھی جو قرآن وسنہ، فقہ، لغت، تاریخ اسلام، سماجیات اور اقتصادیات کے ماہر تھے۔

اس مجمع الفقہی کے اہداف درج ذیل مقرر کیے گئے۔ (۲۲)

۱۔ تمام دنیا میں موجود مسلمانوں کو درپیش جدید فقہی وقانونی مسائل اور مشکلات کا معتبر مصادر اسلامیہ کی روشنی میں جواب اور حل دریافت کرنا۔

۲۔ وضعی قوانین کے تقابل میں اسلامی احکام کی برتری واضح کرنا اور ہر دور اور ہر علاقے میں ''ملت اسلامیہ'' کو پیش آنے والے مسائل کے حل میں فقہ اسلامی کی اہلیت کا اثبات کرنا۔

۳۔ مسلمانوں کے ''فقہ اسلامی'' کے عظیم ورثہ کی نشر واشاعت، فقہی اصطلاحات اور مفاہیم کی توضیح وتشریح، نیز عصری زبانوں میں اس کو پیش کرنا۔

۴۔ مسلمانوں کے فقہی مجلات وجرائد میں علمی اور فقہی بحثوں کی حوصلہ افزائی اور ترغیب وتحریص۔

۵۔ قابل اعتماد لائق استاد فقہی اکیڈمیوں کے نئے فقہی فیصلوں نیز معتبر علماء وفقہاء اور محققین کے فتاوی کو یکجا کرنا اور ان کی عوام میں مناسب تشہیر (۲۳)

۶۔ گمراہ کن نظریات اور مغالطوں کا جو ملت اسلامیہ میں پھیلائے جارہے ہیں اور ایسے اعتراضات کا جو احکام شریعت پر کیے جارہے ہیں، رد کرنا اور ان کی بیخ کنی کے لیے کمربستہ رہنا۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۱-۱۲۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۱-۱۲۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۴

۳۔ تنظیمی ڈھانچہ:

دوسرے اداروں کی طرح اس مجلس کا تنظیمی ڈھانچہ درج ذیل تفصیل پر مشتمل ہے:

ا۔ مجلس مجمع:

مجمع کی ایک مجلس (کمیٹی) ہے جو درج ذیل عہدیداروں اور اراکین پر مشتمل ہے۔

(الف) رئیس مجلس:

عام طور پر سعودی عرب سے تعلق رکھتا ہے، رئیس مجلس اجلاس طلب کرنے اس کی تفصیل یار کرنے اور اجلاسوں کی صدارت وغیرہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

(ب) نائب رئیس مجلس:

رابطہ عالم اسلامی اور ''مجمع'' میں تعاون بڑھانے کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ مجمع کا نائب الرئیس رابطہ عالم اسلامی کا سیکرٹری جنرل ہوگا۔

(ج) امین العام (سیکرٹری جنرل):

اس کا ایک سیکرٹری جنرل (امین العام) ہوگا۔

(د) مجلس مجمع:

یہ مجلس منتخب ۲۷ علماء اور جید فقہاء پر مشتمل ہوگی، جن کا تعلق مذکورہ بالا بارہ اسلامی ممالک سے ہوتا ہے، یہ اراکین عام طور پر قرآن کریم، علوم قرآن، حدیث نبوی اور فقہ واصول فقہ کے ماہر ہوتے ہیں (۲۴)۔

(۵) طریق کار:

عام طور پر یہ ادارہ ہر دو سال میں رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سیکرٹری کی دعوت پر ایک اجلاس منعقد کرتا ہے، اسی طرح مجمع یا نائب الرئیس یا اراکین کی بھاری اکثریت، اس کا جب وہ چاہیں اجلاس طلب کر سکتے ہیں۔ مجلس کی قراردادیں اکثریت کے ساتھ پاس کی جاتی ہیں، تمام اراکین کا اتفاق شرط نہیں ہے، اختلاف کنندہ کا نقطۂ نظر اس کے نام کے ساتھ الگ دے دیا جاتا ہے (۲۵)۔
مجمع وقتاً فوقتاً فقہی سیمنار بھی منعقد کرتا ہے، اب تک مجمع کے تحت ۱۷ سیمینار منعقد ہو چکے ہیں۔ جن میں ارباب علم وفضل اور اصحاب فتویٰ نے ۹۰ سے زیادہ موضوعات پر پوری بحث وتمحیص کے بعد اپنی سفارشات تیار کی ہیں، جن کی اسلامی دنیا میں غیر معمولی اہمیت ہے۔ (۲۶)

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۵-۱۶

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۷-۱۸

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۸-۱۹

۶۔ جنرل سیکرٹریٹ:

مجمع کی کوششوں کو مربوط کرنے اہل علم وفضل سے رابطوں کو بڑھانے اور اسے مؤثر وفعال بنانے کے لیے مکہ مکرمہ میں اس کا ایک سیکرٹریٹ قائم ہے، جو پورے سال کام کرتا رہتا ہے۔ اس میں امین العام (جنرل سیکرٹری) بیٹھتا ہے، جو اس کے تمام شعبوں اور ذیلی اداروں کا نگران ہے اور مجلس کے اجتماعات کے لیے نظام الاوقات تیار کرتا ہے اور اس کی سفارشات/قراردادوں کا نفاذ اور ان کی نشر واشاعت کا ذمہ دار ہے۔

سیکرٹریٹ میں اس کے کچھ مشیر اور محققین بھی بیٹھتے ہیں اور فنی اور تکنیکی سٹاف اور عملہ بھی یہاں متعین ہے۔

سیکرٹریٹ اسی نوع کے دوسرے اداروں، مثلاً مجمع الفقہ الاسلامی جو اسلامی کانفرنس تنظیم کا تابع ہے اور جس کا صدر دفتر جدہ میں ہے، مجمع البحوث الاسلامیہ الازہر، قاہرہ، اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا وغیرہ کے ساتھ نظم ونسق اور تعاون میں بھی کوشاں رہتا ہے۔ (۲۷)

مجمع کے تاسیسی مقاصد میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ دنیا بھر میں موجود اس نوع کے دوسرے اداروں کے ساتھ رابطہ استوار رکھے اور ان اداروں میں زیر بحث آنے والے مسائل پر نظر رکھے اور اپنے ہاں جن مسائل پر کوئی حتمی رائے قائم کر لی جائے، اس کی تفصیل سے ان اداروں کو باخبر رکھے۔ پھر ان اداروں سے تعلق رکھنے والے علماء...... براہ راست اس مجمع کے رکن بھی ہیں (۲۸) اس طرح سعودی عرب کا یہ ادارہ بین الاقوامی سطح پر اسلامی ممالک کے درمیان اتفاق اور اجماع کی راہ ہموار کر رہا ہے۔

اب تک اس کے تحت جن مسائل پر فیصلے ہو چکے ہیں، ان کی تفصیل قرارات (فیصلے/سفارشات) کی صورت میں طبع کر دی جاتی ہے۔ (۲۹)

خلاصہ بحث:

۱۔ سعودی عرب میں ''شاہی نظام، نافذ العمل ہے...... اور ایک حکمران ''سعودی خاندان'' برسر اقتدار ہے۔

۲۔ ملک میں برائے نام مجلس شوریٰ موجود ہے۔ یہاں کے آئین کی رُو سے تمام اختیارات ''بادشاہ'' کو حاصل ہیں۔

۳۔ چونکہ ''سعودی خاندان'' نے مذہب کی بنیاد پر حکومت حاصل کی تھی، اس لیے مذہبی اور دینی مسائل کے حل کے لیے متعدد مجالس کام کر رہی ہیں اور حکومت دینی اور اجتہادی مسائل کے لیے انہی مجالس کی طرف رجوع کرتی ہے اور ان کی سفارشات کی بنیاد پر مسائل کے حل کے لیے اقدامات کیے جاتے ہیں۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۰

۲۸۔

۲۹۔

ایران اور اس کی پارلیمنٹ کے معاون اجتہادی ادارے

ایران...... دنیائے اسلام کا ایک ایسا ملک ہے، جہاں مخصوص اسلامی نظریات کی روشنی میں انقلاب برپا ہوا اور جس نے پورے خطے میں طاقت کا توازن بگاڑ دیا۔

شہنشاہ ایران کے خلاف انیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے شروع ہونے والی تحریک نے جلد ہی مذہبی تحریک کی شکل اختیار کرلی...... اس کی ابتدا علامہ آیت اللہ روح اللہ خمینی (۱۹۰۲-۱۹۸۹ء) کی زیر قیادت قم کی معروف مذہبی درسگاہ کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے حکومت کے خلاف شروع ہونے والے جلسے اور جلوسوں سے ہوئی...... جس میں خاص طور پر شہنشاہ ایران کے ''سفید انقلاب'' اور اس کی ظالمانہ حکومت کو نشانہ بنایا جاتا تھا، اس تحریک میں دوسرے شہروں کے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ بھی شریک ہوتے گئے...... اس تحریک کی بنا پر علامہ خمینی کو پہلے گرفتار کر کے زندان میں ڈالا گیا اور بعدازاں انہیں ترکی کی طرف جلاوطن کردیا گیا(۱)...... جہاں سے وہ عراق اور پھر فرانس چلے گئے اور شاہ ایران کے خلاف تحریک کی قیادت کرتے رہے۔

۲۔ ایرانی پارلیمنٹ کا اجتہادی کردار:

ایران میں اگرچہ ۱۹۰۶ء سے مستقل طور پر علماء کی ایک مجلس کام کر رہی تھی اور مذہبی مسائل میں حکومت ان کا فتویٰ ماننے پر مجبور تھی (۲) لیکن حکومت کے مکمل طور پر مذہبی طبقے کے ہاتھوں میں آنے کے بعد اس مسئلے کا ایک واضح اور دستوری حل تلاش کرلیا گیا۔

علامہ خمینی جن دنوں پیرس میں مقیم تھے اور اس پوری تحریک کی قیادت کر رہے تھے، انہی دنوں انہوں نے ''ولایت فقہ'' کے عنوان سے ایک ''خصوصی نظریہ'' پیش کیا، جس نے ایران کے مستقبل کا فیصلہ کردیا...... انہوں نے یہ موقف پیش کیا کہ از روئے شریعت حکومت واقتدار کا کسی عادل ومتقی اور صاحب بصیرت عالم وفقیہ کے پاس ہونا ضروری ہے(۳)۔ اس نظریے کے تحت حکومت واقتدار پر مذہبی عالم کا قبضہ وتسلط ضروری ہے۔ اس نظریے کی مخالفت یوں تو غیر مذہبی طبقے کے کئی برسرآوردہ لوگوں نے کی، لیکن مذہبی طبقے میں سب سے نمایاں نام علامہ آیت اللہ شریعت مداری (م۱۹۸۶ء) کا ہے جن کا موقف تھا کہ حکومت واقتدار عوام کے منتخب لوگوں کا حق ہے، انہی کو اُسے چلانا چاہیے۔

دوسری طرف علامہ آیت اللہ خمینی اور ان کے حامی علماء...... ریاست واقتدار پر مذہبی طبقے کی مؤثر قیادت قائم کرنے کے کوشاں رہے۔ بالآخر علامہ خمینی کے نظریۂ ''ولایت فقیہہ'' کو ایران کے نئے آئین میں نہ صرف یہ کہ جگہ دے دی گئی، بلکہ پورا آئین

۱۔ دیکھیے The rise and fail of Pahlavi Dynasti of General Husain Fardoust:Memsire؛ مطبوعہ حدیث پبلشنگ ہاؤس ۱۹۵۵ء، ۱۷۵، ۱۷۸۔

۲۔ علامہ اقبال: Reconstrection of Religious Thought

۳۔ علامہ آیت اللہ خمینی، ولایت فقیہہ، تہران۔ ۱۳۸۳ء، ص ۲۸، ۳۵۔

اسی تناظر میں تیار کیا گیا...... ایران کے نئے آئین میں نہ صرف علماء کی پارلیمنٹ پر بالا دستی دکھائی گئی ہے، بلکہ ان کا تسلط کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ دینی اور مذہبی معاملات میں قانون سازی اور اجتہاد کا حق صرف علماء کو حاصل ہے اور ''غیر عالم'' لوگ انتظامی معاملات میں تو مشورہ یا رائے دینے کا حق رکھتے ہیں، مگر دینی معاملات میں انہیں رائے دینے کا کوئی حق نہیں۔

آیت اللہ خمینی اور اس کے رفقا نے ایران کو شہنشاہیت سے نجات دلانے میں طویل جدوجہد کی تھی۔ اسی لیے انہیں نئے نظام میں تمام لوگوں پر فوقیت حاصل تھی۔ اسی لیے انقلاب ایران کے ابتدائی دنوں میں ایسے لوگوں کو بھی یا تو قتل کر دیا گیا، یا انہیں لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا، چنانچہ جدید ایران کے آئین کا ڈھانچہ صرف انہی لوگوں نے تیار کیا، جو آیت اللہ خمینی کے خیالات خصوصاً ولایت فقیہ کے نظریہ سے پوری طرح متفق تھے (۴)

''ولایت فقیہ'' کا مطلب یہ ہے کہ امام مہدی کی 'غیبوبت'' کے زمانے میں اسلامی جمہوریہ ایران جیسے ممالک میں قیادت و سیادت کا حق کسی ایسے مجتہد اور فقیہ کو حاصل ہے، جو عدالت تقویٰ اور سیاسی بصیرت جیسی اوصاف سے متصف ہو (۵)۔ گویا آئینی طور پر علامہ آیت اللہ خمینی کے لیے ایران کے ''مرشد و پیر'' یا اس کے سرپرست و قائد کا حق تسلیم کر لیا گیا اور انہیں وسیع انتظامی اور سیاسی اختیارات عطا کر دیئے گئے اور انہیں حکومت کے تینوں شعبوں یعنی انتظامیہ مقننہ اور عدلیہ پر بالا دستی حاصل ہوگئی اور انہیں پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ کے منظور کردہ قوانین پر نظر ثانی کے لیے مامور شوریٰ نگہبان میں سے نصف یعنی چھ افراد اعلیٰ عدالتوں کے ججوں اور مسلح افواج کے تقرر کا اختیار بھی حاصل ہوگا...... چنانچہ آئین کی دفعہ نمبر ۵۷ میں ہے:

The power of Government in the Islamic Republic are vested in the legislature and the Judiciary and active powers, functioning under the supervision of the obsolute wilayat al-amr and the leadership of ummah, according with the fourth coming article of the this constitution.

ایران کے موجودہ آئین میں...... ''مذہبی قیادت'' کی بالا دستی کو اتنی محفوظ اور مضبوط بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے کہ انہیں آئینی طریقے پر ایران کی پارلیمنٹ یا عوام بھی تبدیل نہیں کر سکتی...... اس مقصد کے لیے آئندہ کا ساتواں باب مختص کیا گیا ہے، جس کا عنوان ہے: ''قائد یا قائدانہ کونسل''...... اس حصے میں ایران کے رہبر یا قائد کو اور اس کی معذوری یا بنیادی اصولوں سے انحراف کی صورت میں علماء اور مجتہدین کی کونسل کو وسیع اختیارات تفویض کیے گئے ہیں (۶) اور دستور کی رُو سے ایران کے مذہبی لیڈر یا رہبر کو انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے مابین پیدا ہونے والے جھگڑوں اور مسائل کے تصفیہ کا بھی اختیار دیا گیا (۷)۔

۲۔ شوریٰ نگہبان: ایران کے موجودہ آئین میں قانون سازی اور اس میں ترمیم و تنسیخ کی حقیقی طاقت شوریٰ نگہبان کو

4) See, for detail, Asghar Sheirazi, Constitation of Iran: Politics and state in the Islamic republic London, IB Touras 1997, article, 5,7)

5) See, Article, 5,7,107,109.

6) See Article, 05,57.

7) Article, 57

سونپی گئی ہے۔ یہ شوریٰ حقیقت میں قانون سازی اور اس میں ترمیم وتنسیخ کی نگران، صدارتی امیدوار اور ایرانی پارلیمنٹ کے امیدواروں کی اہلیت کا جائزہ وغیرہ جیسے امور کی ذمہ دار ہے(۸)۔اسی طرح مذہبی قیادت نے ایران پر مکمل تسلط برقرار رکھنے کا بندوبست بھی کرلیا ہے۔

شوریٰ نگہبان کے نصف ارکان کا ماہر امور شریعت ہونا اور باقی نصف کا قانون کا ماہر ہونا ضروری ہے۔اس میں سے نصف حضرات کی نامزدگی ''رہبر'' یا قائد کی طرف سے کی جاتی ہے، جبکہ باقی نصف کی پارلیمنٹ کے ارکان منتخب کرتے ہیں......تاہم یہاں بھی انہیں انتخاب کے لیے مکمل اختیار نہیں دیا گیا، بلکہ وہ صرف انہی حضرات کا انتخاب کرسکتے ہیں، جن کی فہرست ''عدلیہ'' کے سربراہ کی طرف سے پیش کی جاتی ہے(۹) اور اس کے ارکان کا انتخاب/ نامزدگی چھ سالوں کے لیے ہوتی ہے۔تاہم اس کے نصف افراد ہر تین سال کے بعد، ریٹائر ہوجاتے ہیں۔آئین میں صراحت ہے کہ اگر شوریٰ نگہبان کسی وجہ سے موجود نہ ہو، تو ایران کی پارلیمنٹ قانون سازی نہیں کرسکتی(۱۰)۔ایران میں اصولی طور پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ قرآن وسنۃ کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جاسکتی......قرآن وسنۃ سے ان کی مراد''اثنا شرعی'' مسلک کے مطابق قرآن وسنۃ کی تشریح ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو ایران میں قانون سازی کے اختیارات محدود کردیئے گئے ہیں اور ایران کی پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) صرف وہی قانون سازی کرسکتی ہے جسے ایران کی ''شوریٰ نگہبان'' نے ایسا کرنے کی اجازت دی ہو۔

مذہبی قیادت کو بالادستی دینے کے لیے ایرانی آئین میں ''مجلس خبرگان'' بھی رکھی گئی ہے۔جس کی بنیادی ذمہ داری دستور پر نظر ثانی کے علاوہ آیت اللہ خمینی کے جانشین کا انتخاب وتقرر کرنا بھی شامل ہے(۱۱)

اس کے علاوہ عدلیہ کے چیف جسٹس اور پھر اٹارنی جنرل کا بھی عالم وفقیہ ہونا ضروری ہے۔

خلاصہ بحث:

اس تفصیل سے درج ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

۱۔ ایران میں مذہبی طبقے اور مذہبی قیادت کو بالادستی حاصل ہے۔

۲۔ ایران کے موجودہ آئین کے مطابق جو ۱۹۸۰ء سے نافذ ہے۔''ایرانی پارلیمنٹ'' کو قانون سازی اور انتظامی امور پر گرفت کے بہت ہی محدود اختیارات حاصل ہیں۔

۳۔ ایران میں...... پارلیمنٹ میں ہونے والی قانون سازی یا دستور سازی کی نگرانی کے لیے علماء کو تین درجوں پر اختیارات تفویض کیے گئے ہیں۔

۱۔ رہبر

۸۔ دیکھیے ایران کا آئین، دفعہ ۱۰۷ تا ۱۱۲۔

۹۔ ایضاً، دفعہ ۱۱۰، ص ۱۰۹-۱۱۰۔

۱۰۔ ایضاً، دفعہ ۹۱-۹۹۔

۱۱۔ دیکھیے...... آئین کی دفعہ ۱۰۷-۱۱۱۔

۲۔ شوریٰ خبرگان

۳۔ شوریٰ نگہبان

دوسرے الفاظ میں ایران میں قانون سازی کے لیے مکمل طور پر علماء اور مجتہدین کی آراء و افکار کی بنیادی اہمیت دی گئی ہے اور پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ کی حیثیت ثانوی درجے کی ہے۔

فصل پنجم (حصہ دوم)

پاکستان کی پارلیمنٹ اوراس کے معاون اجتہادی ادارے

نفاذِ اسلام کے حوالے سے اجتماعی اور قانون ساز اداروں کے کام کا جائزہ اس عنوان پر سابقہ اوراق میں بحث ہو چکی ہے۔

ا۔ پاکستان میں نفاذ اسلام اور اجتماعی اجتہاد کی کوششوں کا جائزہ:

پاکستان کے قیام (۱۴-اگست ۱۹۴۷ء) کے وقت انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو، ان ترامیم کے ساتھ جو برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے وقت منظور کی تھیں، پاکستان کا عبوری آئین قرار دیا گیا۔ اور اس کے تحت ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے وقت جو اسمبلی موجود تھی، اس میں پاکستان کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے اراکین پر مشتمل اسمبلی معرض وجود میں آئی۔ جو پاکستان کی پہلی ''قومی اسمبلی'' قرار دی گئی۔(۱)

اس اسمبلی کے ذمہ دو کام لگائے گئے۔ اولاً پاکستان کے لیے نئے آئین کی تیاری اور دوم اس مملکت کے انتظام و انصرام کے لیے ضروری قوانین سازی۔

آئین کی رو سے...... پارلیمنٹ کے دو ایوان تجویز کیے گئے...... ایوان زیریں...... قومی اسمبلی اور ایوان بالا سینٹ کہلاتا ہے، قومی اسمبلی کے ارکان براہ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں اور سینٹ کا انتخاب صوبائی اسمبلیاں کرتی ہیں۔

پارلیمنٹ کو...... ہر طرح کی قانون سازی کا حق اور اختیار حاصل ہے، مگر اس کے دونوں ایوانوں کی، اکثریت کا اعتماد ضروری ہے۔ آئین میں ترمیم کے لیے دو تہائی اکثریت لازمی ہے، آئین کی رو سے تمام کلیدی عہدوں پر فائز افراد کا مسلمان ہونا ضروری شرط ہے۔

آئین پارلیمنٹ کی مشاورت کے لیے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کا ادارہ قائم کیا گیا ہے، جس کے اراکین کا تقرر صدر مملکت...... پاکستان کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے کرتے ہیں۔

۱۹۷۴ء میں...... عوام کے پُرزور مطالبے پر...... پارلیمنٹ نے...... قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا اور اس کے مطابق آئین میں ترامیم منظور کیں...... بھٹو نے پی-این-اے (پاکستان متحدہ محاذ) کی تحریک کو روکنے کے لیے، کئی اقدامات کیے...... جمعہ کی چھٹی منظور کی، شراب کی خرید و فروخت پر پابندی لگائی، اور رمضان المبارک کے احترام کے لیے...... بھی کئی اقدامات کیے۔ لیکن یہ تمام اقدامات پاکستان کی پارلیمنٹ نے خود منظور کیے اور اس سلسلے میں اس نظریاتی کونسل کو عملی اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔(۲)

۱۔ عباس رشید، ص ۷۱۔

۲۔ مقالہ پاکستان، در Encyclopaedia Americana،

(۴) صدر ضیاء الحق کے اقدامات:

صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو ذوالفقار بھٹو حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا اور تقریباً گیارہ برس (۱۷ اگست ۱۹۸۸ء) تک حکومت کی۔ اس عرصے میں کچھ عرصہ آئین معطل رہا اور ۱۹۸۵ء میں آئین بحال ہوا، تو اس کے ساتھ کئی ترامیم بھی متعارف کرائی گئیں، جن میں فیڈرل شریعت کورٹ اور شریعت اپیلنٹ بنچ وغیرہ کا قیام شامل ہے۔ ضیاء حکومت نے پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کو فعال بنایا اور اس کی تجویز پر زکوۃ وعشر آرڈیننس اور پھر حدود آرڈیننس کا نفاذ کیا، لیکن ضیاء کے یہ اقدامات دیرپا ثابت نہ ہوئے...... اور یہ دور گزرنے کے بعد...... سرکاری سطح پر قائم ہونے والے یہ اہم اجتہادی ادارے عضو معطل بن کر رہ گئے ہیں۔

(۵) ۱۹۸۸ء تا ۲۰۰۷ء کے اقدامات:

۱۹۸۸ء سے ۲۰۰۷ء کے درمیان میں چار سول اور ایک فوجی حکومت قائم ہوئی...... سول حکومتوں میں...... سوائے لفظی جمع خرچ کے نفاذ شریعت کے حوالے سے کوئی بھی قانون سازی نہیں ہوئی،...... نواز شریف نے اپنے دوسرے دور حکومت میں جمعہ کی تعطیل ختم کر کے دوبارہ اتوار کی چھٹی منظور کی اور اکتوبر ۱۹۹۸ء میں نفاذ شریعت کے عنوان سے قومی اسمبلی میں ایک بل پیش کیا، جسے قومی اسمبلی نے تو پاس کر دیا مگر حکومت سینٹ سے اسے منظور نہ کرا سکی...... البتہ سود کے خلاف آنے والے فیصلہ کے خلاف، سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی۔

پرویز مشرف حکومت نے ''حقوق نسواں'' کے نام سے، جنرل محمد ضیاء الحق شہید کے دور میں...... حدود آرڈیننس کی کچھ دفعات میں تبدیلی کی، جس کے تحت...... اس آرڈیننس کی اصل روح کو ختم کر دیا گیا...... اسلامی نظریاتی کونسل کے اراکین کی تقرری ہوئی، مگر اس میں ایسے جدت پسند علماء کو شامل کیا گیا جن پر عوام کی اکثریت اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں۔

جبکہ عوامی سطح پر مختلف دینی مدارس میں ''فتویٰ دفاتر'' کام کر رہے ہیں، مگر زیادہ تر قدیم اقوال و آراء ہی کو نقل کر کے ان پر مہر لگا دی جاتی ہے، جبکہ ملکی سطح پر مصر، ایران، مراکش، سعودی عرب اور ملائشیا کی طرز کا کوئی ادارہ موجود نہیں۔

خلاصہ بحث:

اسلامی دنیا کی پارلیمانوں اور اجتہادی اداروں پر ایک نظر ڈالنے سے درج ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:

(الف) زیادہ تر اسلامی ملکوں میں ان کی پارلیمانوں کو ہر قسم کی قانون سازی کا حق حاصل ہے اور اسلامی احکام سے متعلق بھی اکثریتی رائے کا احترام کیا جاتا ہے۔

(ب) اسلامی ممالک کی دوسری قسم ایسے ممالک پر مشتمل ہے، جہاں...... پارلیمانوں کی مدد کے لیے کونسل ہا، یا مجلس ہا قائم ہیں...... اس فہرست میں پاکستان، مراکش، ملائشیا اور مصر شامل ہیں لیکن کیا ان ممالک میں ان مذہبی کونسلوں/ مجالس کے فتاویٰ / آراء پر حرف بحرف عمل نہیں کیا جاتا...... اور با وجہ مجبوری حسب ضرورت فتاویٰ بھی زیر عمل لائے جاتے ہیں۔

(ج) جبکہ اسلامی ممالک کی تیسری قسم ایسے ممالک پر مشتمل ہے، جن میں پارلیمانوں کی حیثیت محض واجبی یا رسمی سی ہے اور ان ممالک میں تمام تر اختیارات مذہبی کونسل/ مجالس کو حاصل ہیں...... اس فہرست میں ایران اور سعودی عرب شامل ہیں۔

پارلیمنٹ ازخود کوئی محنت نہیں کرتی بلکہ پارلیمنٹ کے معاون ادارے جن اسلامی نظریاتی کونسل ادارہ تحقیقات اسلامی وفاقی شرعی عدالت وشریعت اپلیٹ بینچ سپریم کورٹ سفارشات مرتب کر کے پارلیمنٹ کو بھجوادیتی ہیں پارلیمنٹ اس کو قانون سازی کر کے نافذ کرتی ہے۔

❁❁❁

انٹرویو جاوید غامدی

سوال۔ پارلیمنٹ میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں تو وہ کیسے اجتہاد کر سکتے ہیں؟

جواب۔ دنیا میں کوئی پارلیمنٹ اجتہاد نہیں کرتی اجتہاد اہل علم کرتے ہیں وہ ہمیشہ سے آزادی کے ساتھ کرتے رہتے ہیں پارلیمنٹ اس اجتہاد کو اختیار کرتی ہے قانون سازی کے لئے اہل علم کی آراء لی جائیں گی جس کی رائے سب سے مستحسن ہوگی اس کو اختیار کرلیا جائے گا پارلیمنٹ نے کہاں اجتہاد کرنا ہوتا ہے مختلف اہل علم کی آرائے لی جائیں گی۔ پارلیمنٹ صرف قانون سازی کرتی ہے پالیمنٹ اجتہاد نہیں کرتی جس فرد نے کسی مجتہد کی رائے پر عمل کرنا ہے جس کی رائے کو مناسب سمجھا جائے گا قانون بنا دیا جائے گا کہ پارلیمنٹ صرف قانون سازی کرتی ہے۔ معیشت معاشرت کا معاملہ۔ اس بات قوم سے متعلق امور پارلیمنٹ کا کام کسی اجتہاد کے نفاذ کا فیصلہ کرنا ہے نہ کہ پارلیمنٹ کا کام اجتہاد کرنا ہے یہ بحث بیکار ہے پارلیمنٹ کا کام اجتہاد کرنا ہے ہی نہیں یہ اس کی ذمہ داری میں شامل ہی نہیں۔

سوال۔ اجتہاد کا طریق کار کیا ہوگا۔

جواب۔ طریق کار یہ ہوگا جس مجتہد کے اجتہاد پر اعتماد ہوتا ہے اسی کو اختیار کرلیا جائے گا۔ پارلیمنٹ تو قانون نافذ کرنے کا صرف ایک ادارہ ہے اہل علم اجتہاد کرتے ہیں سب مسائل پر اہل علم کی آراء لی جاتی ہیں مثلاً ٹیسٹ ٹیوب بے بی۔ انشورنس وغیرہ اعضاء کی پیوندکاری مسائل، اہل علم کی آراء کو لیا جاتا ہے جو کہ میدان کے ماہرین کرتے ہیں پارلیمنٹ کا کام صرف یہ ہے کہ جس مسئلے پر زیادہ لوگوں کی آراء ہو پارلیمنٹ اس کو نافذ کردے۔ پارلیمنٹ کو قانون سازی کی ضرورت ہوگی تو وہ اہل علم سے رجوع کرے گی اگر اہل علم پارلیمنٹ کے اندر موجود ہیں وہاں رجوع کرے گی ورنہ دوسرے اہل علم سے رجوع کرلے گی پارلیمنٹ تو صرف قانون کے نفاذ کا ادارہ ہے۔ اجتہاد سوسائیٹی میں ہوتا ہے اہل علم کرتے ہیں پارلیمنٹ میں ان آراء کا جائزہ لیا جاتا ہے جس کو زیادہ حمایت حاصل ہو اس کو نافذ کردیتی ہے۔

سوال۔ کیا عام آدمی اجتہاد کرسکتا ہے۔؟

جواب۔ عام آدمی اجتہاد نہیں کرتا جس کے اجتہاد پر اس کو اعتماد ہوتا ہے اس کو اپنے اوپر نافذ کرلیتا ہے پارلیمنٹ بھی یہی کرتی ہے۔ پارلیمنٹ کو حق اجتہاد ہے یا نہیں تو اس کو جواب یہ ہے کہ حق اجتہاد دنیا کے ہر فرد کو حاصل ہے کسی سے حق اجتہاد کو سلب نہیں کیا جاسکتا۔ اجتہاد کی قبولیت کا باعث قوی دلیل ہے علم سے عاری شخص کی رائے اگر بالکل درست ہے تو اس کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ پارلیمنٹ کو چاہیے وہ کسی شخص کو خواہ پارلیمنٹ کے اندر ہو یا باہر اس کی رائے کو جانچے اگر معقول ہو تو قانون بنائے ورنہ رد کردے۔ پارلیمنٹ کبھی کسی اجتہاد کرنے نہیں بیٹھی۔

نتائج:

زمانہ حال کی پارلیمنٹ غلط طریقہ پر اولیت کا شرف حاصل کرنا چاہتی ہے موجودہ دنیا کی ترقی یافتہ قومیں بڑے رعب و داب کے ساتھ پارلیمنٹ کی معیّن تصور اور اس کے قانونی طریقوں کی تکوین کا دعویٰ کرتی نظر آتی ہیں مگر حقیقتاً یہ ان کا جزوی کام ہے جس کی کوئی بنیادی اہمیت نہیں اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ حقیقی پارلیمنٹ (شوریٰ) کا موجد ہے اور یورپ اس کی تقلید پر گامزن ہے کیونکہ شوریٰ دنیا کے سامنے اس وقت آیا جب پارلیمنٹ (شوریٰ) زمین کے کسی حصے میں پیدا نہ ہوئی تھی اسلام دنیا کی پہلی طاقت ہے جس نے موجودہ پارلیمنٹ سے ایک ہزار سال پیشتر شوریٰ کے نام سے ایک بچے پارلیمنٹری نظام، کی تشکیل کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔

ایسے لوگ جن میں اجتہاد کی اہلیت سرے سے نہ ہو وہ کتاب وسنت کا گہرا اور وسیع علم نہ رکھتے ہوں ایک مسئلے کی پوری تحقیق نہ کر سکتے ہوں تو انہیں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ شریعت اور احکام شرعیہ کو اپنی من مانی آراء کا بازیچہ بنائیں ہر کام صرف ایسے ماہرین شریعت کا ہے جنہوں نے علوم عربیہ واسلامیہ میں اہل علم محدثین مفسرین نے اور فقہاء کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہو اور علم فقہ کے ساتھ طویل وابستگی کے نتیجے میں ان میں علمی ملکہ اور ذوق تحقیق پیدا ہوگا ہو۔

وہ محض فنی عالم ہی نہ ہوں بلکہ ان میں للّٰہیت اور تقوی کی صفات بدرجہ اتم پائی جاتی ہوں اور استدلال واستنباط کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

علامہ اقبال نے پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کی تجویز پیش کر کے اور اسے اجماع کی عصری شکل قرار دے کر اصل اجتماعی اجتہاد ہی کا عصری اسلوب تجویز کیا ہے وہ اجتہاد کے حوالے سے اپنے معروف خطبے میں کہتے ہیں مذہبی مکاتب فکر کے انفرادی نمائندوں سے مسلم مجلس قانون ساز کو حق اجتہاد کی منتقلی جبکہ مسلمان اس وقت فرقوں میں بٹے ہوئے ہی ہیں جدید دور میں اجماع کی ممکنہ صورت ہے۔

عصر حاضر میں علم ودانش سائنس، ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والی ترقی کے باعث اب کسی مسئلے پر اجتہاد کے لئے وسیع معلومات اور تحقیقات کی ضرورت ہے اب ایک مسئلے سے متعلق تمام موضاعات کا احاطہ کرنا کسی ایک مجتہد کے بس کا کام نہیں رہا۔ کیونکہ کوئی بھی مجتہد دوسرے علمی شعبوں کے ماہرین کی تحقیقات کو نظر انداز کر کے اجتہاد نہیں کر سکتا۔ لہذا اب ٹیم ورک کی ضرورت ہے اجتماعی اجتہاد کا ایک اہم فائدہ یہی ہے کہ اس کے ذریعے ایک مجتہد اپنی محدود معلومات پر انحصار کرنے کی بجائے دوسروں کی ماہرانہ رائے سے بہتر طور پر استفادہ کر سکتا ہے۔ اجتماعی یا شورائی اجتہاد کے رائج ہونے کی صورت میں انفرادی اجتہاد کی خامیوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

تجاویز سفارشات

1۔ جدید جمہوری نظام میں خواہ وہ صدارتی نظام ہو۔۔۔جیسے امریکہ میں ہے یا پارلیمانی نظام ہو جیسے کہ برطانیہ۔ بھارت ،فرانس اور دوسرے جمہوری ممالک میں ہے پارلیمنٹ کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے اس کے بغیر نہ تو جمہوری نظام نافذ ہو سکتا ہے اور نہ عوام کی بالادستی کے تصور کو عملی شکل دی جاسکتی ہے۔

مغربی ممالک میں ابتدائی دنوں میں پارلیمنٹ کو سب سے بالادست ادارہ تصور کیا جاتا تھا اور اسے ہر قسم کا قانون بنانے اور اس میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا حق حاصل تھا مگر نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور برطانیہ میں اس تصور کے خلاف آوازیں اٹھیں اور یہ کہا گیا کہ پارلیمنٹ کو حقوق انسانی کے متعلق منفی فیصلے کرنے اور ان حقوق کو معطل کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ لہذا پارلیمنٹ کی غیر معمولی بالادستی کا نظریہ اب پرانا ہو چکا ہے اور خود مغربی جمہوری ملکوں میں پارلیمانوں کو عوام کے انسانی حقوق میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔

2۔ جن اسلامی ملکوں میں جمہوری نظام حکومت رائج ہے ان ملکوں کی پارلیمانوں کی بالادستی کی درج ذیل صورتیں نظر آتی ہیں۔

الف۔ کئی اسلامی ممالک میں محدود جمہوری نظام (Controled Democratic System) نافذ العمل ہے اس فہرست میں ایران، مصر، تیونس، شام اور لیبیا وغیرہ شامل ہیں ان ممالک میں پارلیمانوں کے بجائے حکمران جماعت یا اس کا حکمران ٹولہ بالادست تصور ہوتا ہے اور پارلیمانوں کی حیثیت محض ایک نمائشی اور برائے نام ادارے کی ہے۔

ب۔ ایسے جمہوری اسلامی ممالک جہاں حقیقی جمہوری نظام موجود ہے جیسے انڈونیشیا، ملائیشیا اور بنگلہ دیش وغیرہ وہاں اگرچہ دعوی تو یہی کیا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ بالادست ہے مگر حقیقت میں وہاں بھی حکمران جماعتیں اور ان کے برسر اقتدار طبقہ عملاً بالادست تصور ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی مرضی کے قوانین بنواتے اور اپنی مرضی کے خلاف بنے ہوئے قوانین کو منسوخ کر سکتے ہیں۔

3۔ جہاں تک قرآن وسنت کی بالادستی کا تصور ہے یہ ابھی تک کسی بھی اسلامی ملک میں عملاً موجود نہیں ہے البتہ سعودی عرب اور ایران اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں وہ اس لیے کہ ان دونوں ملکوں میں بظاہر یہی دعوی کیا جاتا ہے کہ وہ قرآن وسنت کے احکام بالادست ہیں تاہم اس حوالے سے دونوں ملکوں میں علماء کی کونسلیں (سعودی عرب میں ھیئۃ کبار العلماء اور ایران میں سپریم کونسل) بالادست ہیں اور حکومت ان کی سفارشات کو نافذ کرنے کی پابند ہے۔

4۔ پاکستان کی صورت حال ابھی تک واضح نہیں ہے یہاں اگرچہ موجودہ دستور (مجریہ ۱۹۷۳ء) اور سابقہ دساتیر (۱۹۵۹ اور ۱۹۶۲ء) میں پارلیمنٹ کو سب سے بالادست قرار دیا گیا ہے لیکن عملاً ۱۹۵۴ء میں مولوی تمیزلدین بنام وفاق پاکستان کے تحت ہونے والے فیصلے نے پارلیمنٹ کو پہلے گورنر جنرل کے تابع کیا اور بعد ازاں مارشل لاء لگنے کے بعد آنے والی عدالتی فیصلوں نے مارشل لاء کے تحت خودساختہ حکمرانوں کے اقدام کو درست ثابت کر کے عملا پارلیمنٹ کی بالادستی کی نفی کی۔

5۔ ۱۹۵۶،۱۹۶۲اور۱۹۷۳ کے تینوں دساتیر میں پارلیمنٹ کی مدد کیلئے اسلامی نظریاتی کونسل کے نام سے ایک ادارہ کام کر رہا ہے۔ مگر عملا اس کی سفارشات کبھی تسلیم نہیں کی گئی اسی طرح جنرل ضیاء الحق کے دور میں قائم ہونے والی خصوصی عدالت وفاقی شرعی

عدالت کے فیصلوں پر سپریم کورٹ کے نظر ثانی کے حق نے اس عدالت کی کارکردگی کو بھی صفر کر دیا ہے۔ اس طرح قرآن وسنت کی بالادستی کا اصول جس کا ذکر آئین کے پیش لفظ میں قرارداد مقاصد کی صورت میں کیا گیا ہے عملاً نفاذ کا محتاج ہے۔

دوسری طرف پارلیمنٹ کی دوسرے اداروں پر بالادستی کا خواب بھی ابھی تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکا۔ اس حوالے سے ابھی تک بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

6۔ چونکہ آئین پاکستان کے تحت پارلیمنٹ سب سے برتر ادارہ ہے اور اسے قانون سازی کے مکمل اور لامحدود اختیارات حاصل ہیں مگر دوسری طرف پارلیمنٹ کے اراکین کی اکثریت اجتہاد کی مبادیات سے بھی واقف نہیں ہے اور پاکستان کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام کی اکثریت پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کے لئے تیار نہیں ہے اس لیے پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کو برقرار رکھنے کے لئے درجہ ذیل نکات پر عمل ضروری ہے۔

(الف) پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے یہاں اسلام کی بالادستی کا نظریہ اساس رکھتا ہے جیسا کہ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں (ا) اس بات پر زور دیا ہے کہ ملک میں فقہ اسلام کو باقاعدہ نصاب تعلیم میں شامل کیا جائے۔

لہذا (ا) پارلیمنٹ کے ارکان کی اہلیت کے لئے ان کی فقہ اسلامی سے واقفیت کو ضروری اور لازمی قرار دیا جائے۔ اور صرف وہی لوگ پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہونے کے اہل قرار دیے جائیں جو علامہ اقبال کے بیان کے مطابق اہلیت کے اس معیار پورا اترتے ہوں جیسے کہ حکومت ایران نے پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہونے کے لئے اس قسم کی شرائط مقرر کر رکھی ہیں۔

۲۔ اس مقصد کے لئے ترکی میں قائم آئینی عدالتوں کی طرز پر ایسی عدالتیں قائم کی جائیں جو سیاسی جماعتوں اور ان کے ارکان کی اہلیت کا جائزہ لینے اور اس بارے میں فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں۔ ۲۔ جس طرح CSP اور PSC کے تحت منتخب ہونے والے حکومتی افسران کے لئے ان کی ذمہ داریوں کے مطابق ان کے لئے خصوصی تربیتی کورسز کا انعقاد کیا جاتا ہے اور اس مقصد کے لئے وقتاً فوقتاً (REFRESH COURSES) کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے تو اسی طرح قومی پارلیمنٹ کے ارکان کیلئے بھی جنہوں نے ملک اور قوم کی سب سے اہم ذمہ داریاں سنبھالنا ہوتی ہیں اس طرح کے تربیتی کورسز کا یا ان کی بریفنگ کا اہتمام کیا جائے۔

۳۔ امام الغزالی نے (ا) اپنی اصول فقہ کی کتاب المستصفیٰ میں تجزی اجتہاد کا جو نظریہ پیش کیا ہے یعنی یہ کہ متعلقہ شخص کے مجتہد ہونے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ فقہ اور اصول فقہ کے تمام اصول وقواعد سے واقف ہو۔ بلکہ اس مسئلے کے متعلق جو مسئلہ زیر بحث ہے اس کی واقفیت کا ہونا ضروری ہے اور یہ بات کچھ زیادہ مشکل بات نہیں۔ اس لئے کہ پارلیمنٹ زیر بحث مسئلے متعلق اس شعبے کے ماہرین سے بریفنگ لے کر امام غزالی کے بیان کردہ اصول کی روشنی میں اجتہاد کی اہلیت حاصل کر سکتی ہے اس صورت میں ان کا کیا ہوا اجتہاد درست اور بجا ہے۔

۴۔ علامہ اقبال نے یہ تجویز بھی دی ہے کہ محدود تعداد میں علماء کو پارلیمنٹ کا رکن بنا دیا جائے۔ کسی بھی قانون کو بنانے یا منسوخ کرنے میں ان کی رائے کو بنیادی اہمیت دی جائے۔

چنانچہ جس طرح حکومت نے خواتین اور اقلیتوں کے لئے پارلیمنٹ میں کوٹہ مخصوص کر رکھا ہے اس طرح پارلیمنٹ کو حق اجتہاد دلانے کے لئے مناسب تعداد میں علمائے کرام کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کا رکن بنایا جائے۔

اس طرح حکومت نے سینٹ میں Technocrates کے لئے نشستیں مخصوص کر رکھی ہیں اس طرح اجتہادی صلاحیتوں سے مالا

مال علما کو بھی پارلیمنٹ میں جگہ دی جائے۔

۵۔حکومت اسلامی نظریاتی کونسل (ISlamic Idealogical Council) اور فیڈرل شریعت کورٹ شریعت اپیلیٹ بنچ کو زیادہ موثر بنائے۔

اس نکتے کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل کا بنیادی مقصد پارلیمنٹ کی قانون سازی کے سلسلے میں معاونت کرنا ہے ایسا اس وقت ہوتا ہے جب صدر پاکستان یا صوبوں کے گورنر کسی مسئلے کے سلسلے میں ان سے رہنمائی طلب کریں۔

سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ سعودی عرب کی ھیئۃ کبار العلماء اور مصر کی ھیئۃ العلماء کی اور ایران کی سپریم کونسل کی طرح اس کی رکنیت سیاسی کی بجائے مذہبی اور علمی اہلیت کی بنا پر دی جائے۔اس وقت پاکستانی کی نظریاتی کونسل میں سے کوئی ایک شخص بھی اجتہاد کی اہلیت کے معیار پر پورا نہیں اتر تا حکومت صرف مختلف فرقوں اور اس سے وابستہ افراد کو خوش کرنے کے لئے بلا کسی معیار کے اس کی رکنیت عطا کرتی ہے (جس کی تفصیل سابقہ ابواب میں دی جا چکی ہے)۔

س سلسلے کو فوری طور پر موقوف کیا جائے۔اور خالص میرٹ پر اس کے اراکین کا تقرر کیا جائے۔

ب۔ مزید براں اس کے اختیارات میں بھی اضافہ کیا جائے۔اسے رائے دینے کے لئے سائل کے ریفر کیے جانے کا انتظار کرنے کی بجائے ازخود مختلف مسائل کے متعلق حکومت اور پارلیمنٹ کی رہنمائی کرنے کے لیے اقدامات کرنے چاہیے۔

۶۔ حکومت ملک میں اجتہادی سرگرمیوں کو فروغ دینے اور نچلی سطح تک اتفاق رائے پیدا کرنے کے لئے صوبائی سطح پر اور پھر ڈویثرنل سطح پر اس قسم کے علمی اور اجتہادی بورڈز کا قیام عمل میں لائے۔جس طرح معاصر ملک بھارت میں علماء کے اس طرح کے بورڈز کر رہے ہیں اور ان کے کام میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے ان بورڈز میں قابل اور اہل علمائے کرام کا تقرر عمل میں لائے۔

۷۔ دیگر برادر اسلامی ممالک خصوصا سعودی عرب، مصر، کویت اور ایران اور ملائشیا میں ہونے والے اس نوعیت کے فتاوی اور فقہی تحقیقات کو جمع کرنے اور ان کی مناسب سطح پر اشاعت کا اہتمام کیا جائے، تاکہ پارلیمنٹ کے حق اجتہاد کو یقینی اور مستحکم کیا جائے۔

ضمیمہ (الف)

اشاریہ آیات مبارکہ......(مقالے میں مذکور آیات مبارکہ)

ضمیمہ (ب)

اشاریہ احادیث مبارکہ......(مقالے میں مذکورہ احادیث مبارکہ)

بسم الله الرحمان الرحيم

المصادر والمآخذ

(الف) الكتب العربيه

القرآن الكريم (بمواقع العديدة.....)

1. الآلوسی محمود، ابوالفضل شهاب الدين محمود:روح المعانی فی تفسير القرآن والسبع المثانی، مكتبه امدايه ملتان.... (ب-ت).

2. ايضاً..... تاريخ مساجد بغداد،...... بغداد 1346هـ

3. الآمدي، سيف الدين ابوالحسن: احكام فی اصول الاحكام، دارالمعارف، قاهره، مكتبه المعارف 1332هـ.

4. ابن الأثير، ابوالسعادة، النهاية فی غريب الحديث والآثار، مطبعة العثمانيه، قاهره 1311هـ.

5. ابن الاثير عزالدين: اسد الغابة فی معرفة الصحابه، مطبعة الوهبيه قاهره 1286هـ.

6. ابن تيميه، تقی الدين، فتاوای ابن تيميه، مطبعة العلمية، كردستان، 1329هـ.

7. ايضاً، مقدمه فی اصول التفسير، كويت 1392هـ/1972ء.

8. ابن جرير، الطبري، تاريخ الامم والملوك، طبع سخاؤ، لائيدن.

9. ايضاً .... جامع البيان فی تفسير القرآن، مطبعة الميمنيه، قاهره 1950ء.

10. ابن الجوزی، عبدالرحمان، الوفا باحوال المصطفی، مكتبه رضويه..... لاهور 1397هـ/1977ء.

11. ابن حجر العسقلانی، احمد بن علی، الاصابة فی معرفة الصحابة...... دار المعارف قاهره 1358هـ.

12. الدرر الكامنه فی اعیان المائة الثامنه، تحقیق دیدرنج حیدر آباددکن، 1331هـ.

13. ایضاً، نخبة الفکر فی مصطلح اهل الاثر......کالج بریس کلکته 1862ء.

14. ایضاً، فتح الباري بشرح صحيح البخاري...... دارالمعرفة بيروت.... (14 جلدين)

15. ابن سعد، محمد الكاتب، الطبقات، وطبع ستنفلت، بیروت 1955ء.

16. ابن العابدين الدمشقی، ردّ المختار علی الدر المختار، بولاق 1272- 1286هـ وغيره.

17. ایضاً، رسائل ابن العابدين، سهيل اكيدمی لاهور، 1980ء.

18. ابن العربي، ابوبكر محمد بن عبدالله، احكام القرآن، مطبعة السعادة، قاهره 1350-1351هـ.

19. ابن العماد، شذرات الذهب فی اخبار من ذهب .... قاهره 1350-1351هـ.

20. ابن قتيبه: الامامة والسياسة، مطبوعه مطبعة الفتوح، قاهره 1331هـ.

21. ایضاً، تاویل مشکل القرآن، بیروت 1373هـ.

22. ایضاً، المعارف، کوتنجن..... 1850ء.

23. ابن القيم: اعلام الموقعين مطبعة النيل، قاهره

24. ایضاً، احكام اهل الذمه..... دمشق 1381هـ/1961ء.

25. ایضاً... التبیان فی اقسام القرآن، مكة المكرمه..... 1321هـ.

26. ابن كثير، اسماعيل بن عمر، عماد الدين، تفسير القرآن الكريم....... سهيل اكيدمی لاهور، 1393هـ/ 1973ء.

27. ایضاً..... البدايه والنهايه..... قاهره 1932ء.

28. ابن ماجه، ابوعبدالله محمد بن يزيد، سنن ابن ماجه..... مكتبه دارالسلام، لاهور.

29. ابن منظور: لسان العرب، مطبوعه دار احياء التراث العربي، بيروت، 1988ء

30. ابن نجيم المصري، زين العابدين، البحر الرائق شرح كنز الدقائق، مطبعة العلميه قاهره 1331هـ.

31. ابن النديم، ابوالفرج، محمد بن اسحاق، كتاب الفهرست، قاهره وبيروت.

32. ابن هشام، السيرة.... لائيدن وبيروت.

33. ابن الهمام كمال الدين: محمد بن عبدالواحد الحنفي، (م 1861)، التحرير فى اصول الفقه، مطبعة مصطفى الحلبى البابى، قاهره1351هـ.

34. ابوحيان، الاندلسي، البحرالمحيط، ..... قاهره 1328-1329هـ

35. ابوداؤد: الجامع السنن، مطبوعه دار الطباعة والنشر والتوزيع، بيروت 1382هـ/ 1973ء.

36. احمد امين، دكتور: زعماء الاصلاح فى العصر الحديث.... مطبعة لجنة التاليف والترجمه، قاهره 1933هـ.

37. ايضاً....ضحى الاسلام، مطبعة لجنة التاليف والترجمه.......القاهره 1933ء.

38. ايضاً، فجر الاسلام..... مطبوعه لجنة التاليف والترجمه، قاهره 1930ء.

39. اسماعيل باشا البغدادي، ايضاح المكنون، ....استانبول 1945.

40. انور شاه كاشميرى سيد، محدث، مشكلات القرآن، مطبوعه دهلى (ب-ت)

41. احمد بن حنبل، الامام: مسند احمد بن حنبل، مطبوعه طبع احمد محمد شاكر، قاهره وغيره

42. A.J. Wensinck، معجم المفهرس لالفاظ القرآن الكريم، لائيدن وبيروت.

43. الازهر: تاریخه وتطوره، مطبعة الشركة المصرية، العامه للطباعة والنشر القاهره 1403هـ/1983ء

44. بانی پتی، محمد ثناء الله، محدث: للتفسیر المظهری، مطبوعه دهلی، 1953ء، 10مجلدات

45. ایضاً.... تقدیس والدی المصطفی،..... (اردو ترجمه محمود الحسن عارف، تقدیس والدین مصطفی 2002ء، لاهور)

46. ایضاً.... السیف المسلول، مطبوعه ملتان.... (ب-ت)

47. البخاری، محمد بن اسماعیل: الجامع الصحیح، مطبوعه، مطبعة المعارف.... بیروت وغیره.

48. ایضاً..... تاریخ کبیر، حیدر آباد دکن 1361هـ- 1362هـ.

49. البغوی، ابو محمود الحسین، مصابیح السنة...... مکتبه الاثریه..... اردو بازار، لاهور.

50. ایضاً، معالم التنزیل، قاهره 1331هـ.

51. البلاذری انساب الاشراف، قاهره 1959ء.

52. البزدوی، عبدالعزیز: البخاري کشف الاسراء علی اصول فخر الاسلام البزدوی، بیروت.

53. البیضاوی، ناصر الدین، القاضی، انوار التنزیل واسرار التاویل، دارالکتب المصریه، قاهره 1330هـ.

54. البیهقي، ابوبکر احمد، سنن بیهقي، قاهره وبیروت.

55. الترمذي، ابوعیسی الامام، الجامع السنن، مطبوعه شرکة مصطفی البابي حلبي وشرکانه.. قاهره

56. التعریف بالمجمع الاسلامی بمکة المکرمة، مطبوعه رابطة الاسلامي، مکه مکرمه، 1424هـ.

57. ایضاً..... شمائل الترمذی..... مطبوعه قاهره.

58. التفتازانی، سعد الدين، مسعود بن عمر، التلويح إلى كشف حقائق التفتيح بمبئ 1292.

59. التهانوي محمد بن اعلی: کشاف اصطلاحات الفنون، مطبوعه مطبعة خياط، بيروت 1966

60. الجرجانی، سيد الشريف، علی بن محمد، التعريفات، قاهره 1320هـ.

61. الجصاص رازی، ابوبکر احمد بن علی، القول فی الاصول مکتبه علميه، لاهور

62. ايضاً........ احکام القرآن..... مکتبه امداديه، ملتان.. بار دوم.

63. حاجی خليفه مصطفی بن عبدالله کاتب جلبی، کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، استانبول.

64. الحاكم: مستدرك، الحاكم علی الصحيحين..... مطبوعه..... دمشق.

65. الحلبي، علی بن ابراهيم بن احمد بن علي، انسان العيون فی سيرة الامين والمامون.... بولاق 1292هـ.

66. حسين حماد: المدخل لدراساة الفقه، بيروت.

67. الخازن البغدادی، علاؤ الدين، لباب التاويل فی معانی التنزيل، مطبعة التقدم العلمية، قاهره.

68. خطيب البغدادی، تاريخ بغداد، قاهره 1349هـ/ 1931ء.

69. الخلاف، عبدالوهاب: مصادر التشريع الاسلامی، دارالقلم، كويت 1970ء

70. دائره المعارف الاسلامي عربي، دارالمعرفة، بيروت

71. الدار قطنی، ابوالحسن علی بن عمر، سنن دار قطنی،..... بيروت.

72. الدارمي، ابومحمد عبدالله بن عبدالرحمان، مسند دارمی..... بيروت.

73. الدمياطی، محمد الخضری، اصول الفقه، قاهره 1329هـ.

74. الدواليبی، محمد معروف، المدخل إلی علم اصول الفقه، بار بنجم.... بیروت.

75. دهلوی، شاه ولی الله : محدث، عقد الجید في احکام الاجتهادوالتقلید، دهلی.... (ب-ت)

76. ایضاً، حجة الله البالغة، قاهره.....1286هـ.

77. ایضاً، الجزؤ اللطیف فی ترجمة العبد الضعیف،..... لاهور 1371هـ/1951ء.

78. ایضاً، الفوزالکبیر فی اصول التفسیر، مطبوعه لاهور....

79. ایضاً.... فتح الخبیر بما لابد من حفظه فی علم التفسیر، دهلی 1289 (تعریب ابوالطیب عطاؤ الله)

80. الذهبی، شمس الدین: فضائل الامام ابی حنیفه وصاحبیه.... مطبوعه قاهره.

81. ایضاً، ..... تذکرة الحفاظ او تذکرة حفاظ الحدیث.... مطبوعه حیدر آباد دکن (ب-ت)

82. ایضاً، تاریخ الاسلام، مطبوعه قاهره.

83. الذهبی، محمد حسین....... التفسیر والمفسرون، دارالکتب الحدیثیة، قاهره 1381هـ.

84. الرازي، فخر الدین محمد بن عمر، (م606هـ): المحصول فی علم اصول الفقه، المستند الرسالة، بیروت، بار دوم 1992ء.

85. ایضاً....... مفاتیح الغیب المعروف به تفسیر کبیر، مطبعة الازهریه، قاهره 1309هـ.

86. الزرقانی، عبدالباقی، شرح علی المواهب اللدنیه للقسطلانی، بولاق 1278/ 1381هـ.

87. الزرکلی، خیر الدین، قاموس تراجم لاشهر الرجال والنساء، مطبوعه قاهره.

88. الزمحشری، جار الله محمود بن عمر،الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، مطبعة الاستقامة 1365هـ

89. زیدان، عبدالکریم، دکتور: الوجیز فی اصول الفقه، مطبوعه قاهره.

90. السبکي، تاج الدین، طبقات الشافعیة الکبری، مطبعة الحسینیة، قاهره 1322هـ.

91. السخاوی شمس الدین، الضوء اللاّ مع لاهل القرن التاسع، مطبعة المقدسی، 1355هـ.

92. السیوطي، جلال الدین: الجامع الصغیر، مطبوعه بیروت

93. ایضاً، الخصائص الکبری، حیدر آباد دکن، 1320هـ.

94. ایضاً، جلالین، مطبوعه دهلی ولاهور.

95. ایضاً، طبقات المفسرین.... لانیدن 1839ء.

96. ایضاً، الاتقان فی علوم القرآن، مطبعة الازهریه، قاهره 1318.

97. ایضاً، الدر المنثور، حیدر آباد دکن، 1320هـ.

98. ایضاً.....حسن المحاضره فی تاریخ المصر والقاهره..... قاهره.

99. ایضاً، لباب النقول فی اسباب النزول، قاهره.....

100. الشاطبی، ابو اسحاق ابراهیم بن موسی، المالکي الفرغانی، الموافقات في اصول الفقه، مطبوعه مکتبه التجاریة الکبری (ب–ت)

101. ایضاً، الاعتصام، مطبعة المنار، قاهره 1331هـ.

102. الشرفي، عبدالحمید السوسوه، دکتور: الاجتهاد الجماعي فی التشریع الاسلامی، وزارة الاوقاف الشؤن الاسلامیه، دوحه 1988.

103. الشوکاني: ارشاد الفحول.... مطبوعه قاهره.

104. صديق حسن خان، قنوجي، ابجد العلوم، مكتبة القدوسيه.... 1403هـ/ 1983ء.

105. ايضاً، حصول المامول من علم الاصول، مطبعة الجوائب، قاهره، 1286هـ.

106. ايضاً، ظفراللاضى مما يجب على القاضى، مطبعة صديقيه بهوبال.

107. عبدالحي، سيد: الفوائد البهيه فى تراجم الحنفيه، مطبعة السعادة، قاهره 1324هـ، الحنفيه، دهلي.

108. عبدالحى، حكيم، مولانا: نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر، مطبوعه حيدر آباد دكن، 1957 وبعد، (8 جلدين).

109. عبدالحى، اللكهنوى، فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، نول كشور لكهنو.

110. عبدالنبى احمد نكرى، القاضى، دستور العلماء، حيدر آباد دكن، 1399هـ.

111. على حسب الله، اصول التشريع الاسلامى، مطبعة قاهره.

112. على المتقى، كنزالعمال، مطبعة الميمنيه القاهره، 1313هـ.

113. عياض، قاضى، الشفا بتعريف حقوق المصطفى، مطبوعه قاهره.

114. الغزالى، ابوحامد، (505هـ)، المستصفى من علم الاصول، مطبوعه قاهره

115. ايضاً، احياء علوم الدين مطبعة لجنة نشر الثقافة الاسلاميه، قاهره 1256ء.

116. فتاوى اللجنة الدائمه للبحوث العلميه والافتاء، مكتبه السنة قاهره، 1991ء.

117. فريد بك وجدى، دائره معارف القرن الرابع عشر هـ والعشرين للميلاد، دائرة المعارف 1910-1918ء (10 جلدين)

118. القاسمى، جمال الدين، تفسير القاسمى، مطبعة المنار، قاهره.

119. اللجنة العليا للاحتفال بعيرالالفى الازهر: الازهر تاريخه وتطوره، بار دوم القاهره، 1403هـ/1983ء.

120. مجلة الاحكام العدليه، استانبول.

121. مجله البحوث الاسلاميه، شماره 1، مطبوعه 1395هـ.

122. المحمصاني، دكتور: فلسفه التشريع الاسلامى، دار الكتاب للنشر والطباعة، قاهره 1953ء.

123. ايضاً، علوم الحديث، بار دوم، دمشق 1382هـ/ 1963ء.

124. محمد ابو زهره: اصول الفقه، دارالفكر العربى، (ب-ت).

125. ايضاً، الاجتهاد فى الفقه الاسلامى، قاهره 1357هـ.

126. محمد بن الحسن، الفكر السامى فى تاريخ الفقه، مكتبه العلميه.

127. محمد بن يحي المعروف به محسن ترهتى، اليانع الجنى من مسانيد عبدالغنى، مطبوعه برهامش كشف الاستار للطحاوى، ديوبند 1282هـ.

128. محمد الخضرى، تاريخ التشريع الاسلامى، مطبعة السعادة القاهره، 1372هـ/ 1954ء.

129. محمد رشيد رضا، تاريخ الاستاد، مطبعة المنار، القاهره.

130. ايضاً، تفسير المنار مطبعة المنار، قاهره.

131. محمد عبده، مفتى: مقدمه الرد على الدهريين، ....، مكتبه شعر وادب بيرون دهلى دروازه لاهور

132. ايضاً، الوقائع عدد 1289هـ، جارى شده 1299هـ/ 24 دسمبر 1881ء.

133. ايضاً...... تفسير القرآن الكريم، (جزء 1 تا 11 وجزء عم..) قاهره 1341هـ.

134. (رساله) المنار، جلد وشماره 21، مطبوعه 1299هـ/ جون 1920.

135. مرتضى الزبيدى، تاج العروس، مطبوعه كويت....

136. المرغينانى، برهان الدين: هدايه، مطبوعه مجتبائي دهلى.

137. مسلم بن الحجاج القشيرى، صحيح مسلم، طبع محمد فواد عبدالباقي، مطبعة عيسى البابى الحلبى... قاهره 1370هـ/ 1955ء.

138. مصطفى احمد الزرقاء: الاجتهاد فى مجال التشريع فى الاسلام.... قاهره.

139. مصطفى، عبدالرزاق، الامام الشافعى، قاهره 1949ء.

140. المكى، موفق الدين: مناقب الامام اعظم ابى حنيفه.... بغداد (ب-ت).

141. ملا احمد جيون، تفسيرات الاحمديه، كلكته.... 1262هـ/ 1837ء.

142. مناع القطان: تاريخ التشريع الاسلامى، مطبعة مؤسسةالرسالة، بيروت 1413هـ/ 1992.

143. ايضاً، مباحث فى علوم القرآن.... قاهره 1972ء.

144. النسائى، ابوعبدالرحمان احمد، السنن، دهلى 1891ء ومطبعة دارالسلام، لاهور.

145. النسفى ابوالبركات، كنز الدقائق فى فروع الحنفيه، بمبئ، 1294هـ.

146. ايضاً.... مدارك التنزيل وحقائق التاويل، مطبعة السعادة 1326هـ.

147. النووى، محى الدين ابوزكريا، شرح صحيح مسلم، مطبعة الاميريه، قاهره 1225هـ.

148. الواحدى، النيسابورى، اسباب النزول، قاهره 1379.

149. يوسف اليان سركيس.... معجم المطبوعات العربيه، قاهره 1346هـ/ 1928ء.

(ب) مآخذ ومصادر......(اردو)

۱۵۰۔ آزاد بلگرامی، غلام علی، مآثر الکرام، مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ......لاہور۔

۱۵۱۔ ابوالخیر محمد بن احمد مراد آبادی، کلمات طیبات......(فارسی) مطبعہ مجتبائی، دہلی (ب۔ت)

۱۵۲۔ اسٹینلے لین پول، سلاطین اسلام، اردو ترجمہ غلام علی برق، لاہور۔

۱۵۳۔ اسحاق بھٹی، پروفیسر، فقہائے پاک وہند، (۵ جلدیں)، ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲۔ کلب روڈ، لاہور۔

۱۵۴۔ اشرف علی تھانوی، مولانا، بیان القرآن......لاہور ۱۹۷۰۔

۱۵۵۔ اصلاحی، امین احسن، تفسیر تدبر قرآن، ادارہ تدبر قرآن، لاہور۔

۱۵۶۔ بہاؤالحق قاسمی، تذکرہ اسلاف، لاہور۔

۱۵۷۔ بدایونی، عبدالقادر، منتخب التواریخ، ایشیاٹک، کلکتہ، ۱۸۶۵ء۔

۱۵۸۔ پنجاب یونیورسٹی، کتب نصاب امتحانی خاکہ، ایم اے اسلامک سٹڈیز، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۲ء۔

۱۵۹۔ ایضاً، اردو دائرہ معارف اسلامیہ (مختلف مجلدات) (۱۹۵۸۔۱۹۹۲ء)

۱۶۰۔ تقی امینی، مولانا، اجتہاد (مقالہ)، در برہان، بابت ماہ جنوری ۱۹۷۷ء۔

۱۶۱۔ ایضاً، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، لاہور۔

۱۶۲۔ تقی عثمانی، مفتی، دینی مدارس اور جدید علوم، در ماہنامہ البلاغ، کراچی، بابت ماہ جولائی ۱۹۷۸ء۔

۱۶۳۔ ایضاً، علوم القرآن اور اصول تفسیر، مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء۔

۱۶۴۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر: زندہ رود، مطبوعہ اقبال اکادمی، لاہور۔

۱۶۵۔ الجزیری، عبدالرحمان، الفقہ علی المذاہب الاربعہ، اردو ترجمہ از مولانا عبدالرحمان سواتی، علماء اکیڈمی اوقاف، لاہور۔

۱۶۶۔ حامدی، خلیل احمد، سفرنامہ، قدیم وجدید، بار دوم لاہور

۱۶۷۔ حکومت پاکستان، لیگل فریم ورک آرڈر، ۳۱ اگست ۲۰۰۲ء۔

۱۶۸۔ ایضاً، آئین مجریہ ۱۹۵۶، مطبوعہ اسلام آباد۔

۱۶۹۔ ایضاً، آئین مجریہ ۱۹۷۳، مطبوعہ اسلام آباد۔

۱۷۰۔ خافی خان، محمد ہاشم، منتخب اللباب، جلد اول ودوم، ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ، ۱۸۷۴ء۔

۱۷۱۔ خلیق احمد نظامی، حیات شیخ عبدالحق محدث، دہلی ۱۹۵۴ء۔

۱۷۲۔ دہلوی، ذکاء اللہ، تاریخ ہند، ۹ جلدیں، علمی رسالہ، ۱۹۱۹ء۔

۱۷۳۔ رحمان علی، مولانا: تذکرہ علمائے ہند، تحقیق وترجمہ محمد ایوب قادری، کراچی ۱۹۶۱ء۔ مطبوعہ ۱۹۵۶ء۔

۱۷۴۔ رحمت اللہ کیرانوی، مولانا، اظہار الحق،......اردو ترجمہ بعنوان "بائبل سے قرآن تک" از مفتی محمد تقی عثمانی، کراچی ۱۳۸۸ھ۔

۱۷۵۔ رحیم بخش دہلوی، حیات دلی، افضل المطابع، دہلی ۱۳۱۹ء۔

۱۷۶۔ رشید احمد جالندھری، ڈاکٹر: مقالہ جمال الدین افغانی اور عرب امراء، در محمد اکرم چغتائی (مرتب)، جمال الدین افغانی، اتحاد عالم اسلامی کا نقیب، مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۷۷۔ زاہد حسین انجم: تشریحات آئین پاکستان، مطبوعہ منصور بک ڈپو، لاہور۔

۱۷۸۔ سالک عبدالمجید، مسلم ثقافت ہندوستان میں......ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور (ب۔ت)

۱۷۹۔ سید اسعد گیلانی، مودودی سید ابوالاعلیٰ: در اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲۱۔

۱۸۰۔ سید سلیمان ندوی، رحمۃ للعالمین، غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

۱۸۱۔ ایضاً۔۔۔۔۔مضامین سلیمان۔۔۔۔۔ترتیب وتدوین شفیع احمد، مطبوعہ لاہور۔

۱۸۲۔ شاہد حسین رازقی، سید جمال الدین افغانی: حیات وافکار سید جمال الدین افغانی، مطبوعہ لاہور۔

۱۸۳۔ شبلی نعمانی، مولانا، مقالات شبلی، اعظم گڑھ، ۱۹۲۲ء۔

۱۸۴۔ شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی، مطبوعہ اعظم گڑھ۔

۱۸۵۔ صباح الدین عبدالرحمان سید، ہندوستان کے سلاطین، علماء ومشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۴ء۔

۱۸۶۔ ڈاکٹر صفدر محمود: آئین پاکستان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۱ء۔

۱۸۷۔ طاہر القادری، ڈاکٹر: اقبال کا خواب اور آج کا پاکستان، مطبوعہ لاہور۔

۱۸۸۔ خلیفہ عبدالحکیم: اقبال۔۔۔۔۔مقالہ در اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد سوم، مطبوعہ ۱۹۷۰ء۔

۱۸۹۔ عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا، تذکرۃ الخلیل۔۔۔۔۔مطبوعہ دارالمصنفین، دہلی (ب۔ت)۔

۱۹۰۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔تذکرۃ الرشید، مطبوعہ دارالمصنفین، دہلی (ب۔ت)۔

۱۹۱۔ عبدالحق حقانی، مولانا، تفسیر فتح المنان۔۔۔۔۔دارالاشاعت دہلی، ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۹ء۔

۱۹۲۔ عبدالحی الحسنی لکھنوی، دہلی اور اس کے اطراف، (سفرنامہ) لکھنو، ۱۹۵۸ء۔

۱۹۳۔ عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان، مکتبہ رشیدیہ، لاہور۔

۱۹۴۔ عبدالرحمان، مفتی، تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی، ملتان (ب۔ت)

۱۹۵۔ عبدالشکور لکھنوی، علم الفقہ، لکھنو ۱۳۴۴ھ۔

۱۹۶۔ عبدالصمد صارم، تاریخ التفسیر، برقی پریس، دہلی۔

۱۹۷۔ عبدالعزیز محدث دہلی، بستان المحدثین، ترجمہ عبدالسمیع، سعید کمپنی، کراچی۔

۱۹۸۔ عبدالماجد دریابادی، مولانا، تفسیر ماجدی، تاج کمپنی، لاہور۔

۱۹۹۔ غامدی: جاوید احمد، اصول ومبادی، مطبوعہ المورد، لاہور، ستمبر ۲۰۰۶ء۔

۲۰۰۔ فقیر محمد جہلمی، مولانا، حدائق الحنفیہ، اردو ترجمہ، لکھنو ۱۹۶۰ء۔

۲۰۱۔ فیض انبالوی، حیات شیخ الاسلام، شبیر احمد عثمانی، کراچی۔

۲۰۲۔ قومی اسمبلی، پاکستان: آئین پاکستان...... مطبوعہ ۲۰۰۵ء۔

۲۰۳۔ کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور۔

۲۰۴۔ محمد اختر راہی، درس نظامی اور اس کے مصنفین، لاہور۔

۲۰۵۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، مکاتیب اقبال، مطبوعہ، لاہور۔

۲۰۶۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، تشکیل جدید الٰہیات اسلامی، اردو ترجمہ سید نذیر نیازی، مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲ کلب روڈ، لاہور۔

۲۰۷۔ محمد اکرام، شیخ، آب کوثر...... لاہور۔

۲۰۸۔ ایضاً...... اردو کوثر، لاہور، ۱۹۷۰ء۔

۲۰۹۔ محمد امین، عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون، ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ لمیٹڈ)، اردو بازار، لاہور، نومبر ۱۹۸۹ء۔

۲۱۰۔ محمد ایوب قادری، جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء...... کراچی ۱۹۶۷ء۔

۲۱۱۔ محمد حسین چوہدری، خلافت اسلامیہ (علامہ اقبال کے انگریزی مضمون اسلام اور خلافت کا اردو ترجمہ)، در غلام دستگیر رشید (مرتب) فکر اقبال، لاہور۔

۲۱۲۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، خطبات بہاولپور، مطبوعہ اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء۔

۲۱۳۔ ایضاً، عہد نبوی کے میدان جنگ، لاہور۔

۲۱۴۔ محمد دین فوق، مشاہیر کشمیر، مطبوعہ لاہور، ۱۹۳۰ء۔

۲۱۵۔ ایضاً، تذکرہ علماء والمشائخ......لاہور ۱۳۲۸ھ۔

۲۱۶۔ محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، کراچی......

۲۱۷۔ محمد صدیق ظفر حجازی، برگ گل اقبال نمبر، مطبوعہ ۱۹۸۷ء، سمندری۔

۲۱۸۔ محمد عثمان، ڈکٹر، فکر اقبال کی تشکیل نو، اقبال اکیڈمی، لاہور۔

۲۱۹۔ محمد منور مرزا، ڈاکٹر، اقبال اور اجتہاد، در سہ ماہی منہاج، لاہور، جلد ۱، شمارہ بابت ربیع الاول ۱۴۰۳ھ/جنوری ۱۹۰۳ء۔

۲۲۰۔ محمد میاں، مولانا، علمائے ہند کا شاندار ماضی، مکتبہ محمودیہ لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۲۲۱۔ محمد یوسف صلاح الدین، حافظ، مقالہ اجتماعی اجتہاد اور اجتماعی اجتہاد کا تصور ارتقاء اور عملی صورتیں......مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء۔

۲۲۲۔ محمد یوسف گورایا، ڈاکٹر، اقبال اور اجتہاد، فیروز سنز، لاہور، بار اول ۱۹۸۹ء۔

۲۲۳۔ محمود الحسن عارف، ڈاکٹر: پارلیمنٹ اور اجتہاد، در سہ ماہی منہاج، دیال سنگھ ٹرسٹ، لاہور، بابت ماہ جنوری۔ اپریل ۱۹۹۱ء۔

۲۲۴۔ ایضاً، تذکرہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ ۲۔ کلب روڈ، لاہور ۱۹۹۰ء۔

۲۲۵۔ ایضاً،نظام الدین السہالوی،دراردودائرہ معارف اسلامیہ،جلد۲۲۔

۲۲۶۔ ایضاً،مقالہ شمائل واخلاق نبوی،درپنجاب یونیورسٹی،سیرت خیرالانام،مطبوعہ۲۰۰۷ء۔

۲۲۷۔ مجیب اللہ ندوی،اجتہاداور تبدیلی احکام،مطبوعہ دیال سنگھ ٹرسٹ،لاہور۔

۲۲۸۔ معین الدین ندوی،حیات سلیمان،لاہور......

۲۲۹۔ ایضاً،تاریخ اسلام......(۸جلدیں)......دارالاشاعت،کراچی۱۹۷۳ء۔

۲۳۰۔ مناظراحسن گیلانی،مولانا،تذکرہ شاہ ولی اللہ......نفیس اکیڈمی،کراچی۔

۲۳۱۔ ایضاً......الدین القیم......لاہور۔

۲۳۲۔ ایضاً......مسلمانوں کانظام تعلیم وتربیت......دہلی،۱۳۶۲ھ۔

۲۳۳۔ مودودی،سیدابوالاعلیٰ،اسلامی ریاست فلسفہ نظام کاراوراصول حکمرانی،مطبوعہ لاہور،باردوم،دسمبر۱۹۸۳ء۔

۲۳۴۔ ایضاً،اسلامی دستورکی تدوین،مطبوعہ لاہور۔

۲۳۵۔ ایضاً تفسیر ترجمان القرآن(قرآن کریم کی جامع اردوتفسیر)مطبوعہ لاہور،۲۰۰۰ءوبعد۔

۲۳۶۔ ندوی،ابوالحسنات العروۃ الوثقیٰ......درمحمداکرم چغتائی،(مرتب)جمال الدین افغانی،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۵ء۔

۲۳۷۔ ندوی،سیدابوالحسن علی،اسلامیت اورمغربیت کی کشمکش،مطبوعہ ادارہ نشریات اسلام،کراچی۔

۲۳۸۔ ایضاً......مسلمانوں کےعروج وزوال کااثر......ادارہ نشریات اسلام،کراچی۔

۲۳۹۔ ایضاً......تاریخ دعوت وعزیمت......مطبوعہ کراچی۔

۲۴۰۔ وحیداحمد مسعود،تم کوبےمہری باروطن یادنہیں،دررسالہ برہان دہلی،بابت ماہ اپریل۱۹۶۲ء۔

۲۴۱۔ وحید عشرت، ڈاکٹر، اقبالیات، شش ماہی، اقبال نمبر، جنوری تا جون ۱۹۸۶ء، مطبوعہ اقبال اکیڈمی، لاہور۔

۲۴۲۔ ہاشمی، رفیع الدین، ڈاکٹر، حیات اقبال ماہ وسال کے آئینے میں، در برگ گل سمندری۔

۲۴۳۔ ہاشمی فرید آبادی، تاریخ پاکستان......انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۲ء۔

۲۴۴۔ ہفت روزہ زندگی، ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء۔

Bibliography (The English Books) (ج)

245. Abbas Rashid, Pakistan, perspective on state and society, published at Lahore.

246. A Layish and R. Shaham, in the Encyclopaedia of Islam, Leyeden, s.v, tashrie

247. Ar. Tariq speeches and statements of Iqball, Lahore 1973

248. Bashir, at Cultural History of India, Oxford 1975

249. Encyclopaedia Britannica, London Edition 2007, s.v. (Pakistan, Saudi Arabia, Malyshia, Indonishia, Tunis, Sudan, Egypt)

250. Encyclopaedia Americana, New York, vol.21. s.v. (Pakistan, Saudi Arabia, Malyshia, Indonishia, Tunis, Sudan, Egypt)

251. The Eusopa World, year book, 2007, vol.1, 2 (The History of different countries)

252. Ishaq, Doctor, India's contribution to the studies of Hadith, Dacca 1955

253. Funks & Wargnals: New Standard Dictionary of English Language, Funks and Wargnals Company, New York, 1951

254. The History of Sudan from the coming of Islam, to the present days, published in 1979.

255. Ishtiaq Husain, A short history of Pakistan, Karachi, 1967

256. Muhammad Iqball, Doctor: Islam and Khilafat, in sociological survey, London, 1905

257. (اردو ترجمه جوهدري محمد حسين، خلافت اسلاميه لاهور)

258. Did Muhammad Shafee, A History of Muslim Philosophers, London, Reconstruction of Islamic thought (lectures of Allama Iqball, delivered at Madrass) published by Idara, Thaqafati, islamy, Lahore

259. The Oxford English Dictionary, New Oxford Press, New York.

260. Oxford English Reference Dictionary, New Oxford Press, New York, 1996.

261. PLD...... 1966

262. The Constitution of the Saudi Arabia, The Saudi Kingdom, Saudia Riaz

263. Seyed Shabbir Husain, Ayyob, Bhutto and Zia, Lahore, 1990

264. Sir Charlis Adams: Islam and modernism in Egypt

265. (اردو ترجمہ محمد مظہر الدین، مفتی محمد عبدہ کے حالات زندگی...... لاہور)

266. The State and Social Transporter in Tunis and Lybia, 1880-1980, the Princetion University Press, 1986

267. The State Man's year book, 2007, New York 2000

268. Usman Amin, Muhammad Abduho (مطبوعہ مشی کن یونیورسٹی امریکہ)